TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224383
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—43—30-1-71—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱ ۵ ط ۳۰۰ ۵ Accession No. U- 3520
برہان —

Author

Title برہان جلد ۳ نمبر ۱ - ۶

This book should be returned on or before the date last marked below.

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

عتیق الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں غلامی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی اور تحقیق سے کی گئی ہے۔ قیمت ۳ر

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

اس کتاب میں مغربی تہذیب وتمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عا ر

سوشلزم کی بنیادی حقیقت

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا ہے مع مبسوط مقدمہ از مترجم قیمت ۳ر

اسلام کا اقتصادی نظام

ہماری زبان میں پہلی عظیم الشان کتاب جس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول وقوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت وسرمایہ کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے۔ طبع ثانی میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں۔ ان اضافوں کے بعد کتاب کی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب ۱۹۴۲ء کے سیٹ میں بھی دی گئی ہے۔ قیمت ۳ر

سنہ ۱۹۴۰ء

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصۂ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت عہ ر

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن پاک کا صحیح منشا معلوم کرنے کیلئے شارع علیہ السلام کے اقوال وافعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ احادیث کی تدوین کس طرح اور کب ہوئی۔ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ قیمت عا ر

غلامان اسلام

پچھتر سے زیادہ ان صحابہ تابعین تبع تابعین، فقہاء ومحدثین اور ارباب کشف وکرامات کے سوانح حیات اور کمالات وفضائل کے بیان پر پہلی عظیم الشان کتاب جس کے پڑھنے سے غلامان اسلام کے حیرت انگیز شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سماجاتا ہے۔ قیمت ۵ر

اخلاق وفلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم وجدید نظریوں کی روشنی میں اصول اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہ ہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح کی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی، قرول باغ

برہان

جلد ہفدہم — شمارہ (۱)

جولائی ۱۹۴۶ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبرآبادی	۲
۲۔ حدیثِ افتراقِ امت	جناب مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی	۵
۳۔ اسبابِ کفر و جحود	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ	۲۷
۴۔ تہذیب و تمدنِ آشور	جناب لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ایم۔ایس	۳۹
۵۔ عبداللہ بن المعتز	جناب قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی	۵۵
۶۔ ادبیات:۔		
تبرکات	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ	۵۷
نوائے سروش	جناب ماہر القادری	۵۸
غزل	جناب الم مظفر نگری	۵۹
۷۔ تبصرے	م ۔ ح	۶۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آج کل بعض ادبی رسائل وجرائد میں مولانا حالی کے ایک شعر سے متعلق بڑی دلچسپ بحث چل رہی ہے شعر یہ ہے

حالی اب آؤ پیروئے مغربی کریں — بس اقتدائے مصحفی ومیر کر چکے

گفتگو اس میں ہے کہ پہلے مصرع میں جو "پیروئے مغربی" ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟ ایک گروہ جس میں بعض یونیورسٹیوں کے مشہور اساتذۂ اردو اور بعض مشہور ادیب شامل ہیں۔ ان کو اس پر اصرار ہے کہ "پیروئے مغربی" سے مراد مغرب کی پیروی ہے اور اس طرح گویا مولانا حالی اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ اب مشرقی اور ایشیائی شاعری کے طرزِ کہن کو چھوڑ کر مغرب کے طرزِ شاعری کی پیروی کرنی چاہیئے۔ لیکن دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ "مغربی" فارسی کا ایک مشہور صوفی شاعر ہے جس کا تذکرہ مولانا جامی نے نفحات الانس میں اور محمد عوفی نے لباب الالباب میں کیا ہے۔ مولانا حالی کی مراد یہی شاعر ہے۔

اس سلسلہ میں بعض احباب نے ہم سے بھی استصواب کیا ہے۔ اس بنا پر گذارش یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ تو بالکل طے شدہ ہے کہ "مغربی" سے مراد مغرب کا طرزِ شاعری ہرگز نہیں ہے کیونکہ اول تو "پیروئے مغربی" کی ترکیب ترکیب اضافی ہے نہ کہ توصیفی جس کے معنی یہ ہیں کہ "مغربی" کی پیروی۔ اگر اس سے مراد مغرب کی پیروی لی جائے تو اس صورت میں ترکیب توصیفی ہوگی اور اس طرح خواہ مخواہ ایک تکلف بارد لازم آتا ہے کیونکہ اگر مغربی کو پیروی کی صفت قرار دیا جائے تو یہ فقرہ ہی سرے سے مہمل ہو جاتا ہے۔ مغربی پیروی اور مشرقی پیروی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ پیروی تو کسی چیز کی ہوتی ہے اس کا ذکر ہونا چاہیئے اور یہاں کوئی ایسی چیز مذکور نہیں ہے لامحالہ ترکیب توصیفی ماننے کی صورت میں "مغربی" کے لئے ایک موصوف۔ خواہ وہ "طرز" ہو یا "فکر" یا "شاعر" یا کوئی اور محذوف ماننا پڑے گا اور اُس وقت فقرہ کا مطلب طرز مغربی یا فکر وشاعر مغربی ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس مطلب کو اس طرح یعنی بحذفِ موصوف ادا کرنا عجز عن الکلام کی دلیل ہے جو خواجہ حالی ایسے قادرالکلام شاعر سے نہایت مستبعد اور بالکل غیر متوقع ہے۔ اگر یہ فقرہ بجائے مصرعہ اول کے دوسرے مصرعہ میں ہوتا تو یہ کہا بھی جاسکتا تھا کہ قافیہ کی مجبوری سے یہ تکلف گوارا کیا گیا۔ اگرچہ مولانا حالی ایسے شاعر کے لئے یہ تکلف بھی غیر مستحسن ہی رہتا۔ تاہم تکلف کے لئے تو کوئی وجہ پیدا ہوجاتی لیکن یہاں تو صورت یہ ہے کہ یہ فقرہ پہلے مصرعہ میں ہے۔ شاعر کی مراد اگر واقعی مغرب کی پیروی ہوتی تو وہ اسے اس طرح یا کسی اور طرح ادا کرسکتا تھا۔

آؤ نہ حالی اب کریں مغرب کی پیروی　　بس اقتدائے مصحفی و میر کرچکے

اس صورت میں شاعر کی مراد واضح طریقہ پر ادا ہوجاتی اور الفاظ کی نشست اور ترکیب کے حسن میں بھی کوئی فرق پیدا نہ ہوتا۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اگر بالفرض مغربی سے مراد طرزِ مغربی ہی ہے تو مصحفی و میر سے مراد طرزِ مشرقی ہوگا۔ لیکن جب شاعر نے دو مشہور شاعروں کے نام لیکر طرزِ مشرقی سے کنایہ کیا ہے تو اب بلاغت کا اقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں بھی بجائے مغربی کہنے کے طرزِ مغربی کے کسی نامور شاعر کا نام لیا جاتا تاکہ مقابلہ صورۃً و معنیً دونوں طرح مکمل ہوجاتا۔ یہ ظاہر ہے کہ قابلِ تقلید شعرائے فرنگ میں سے مولانا حالی کی نگاہ میں اگر کوئی شاعر ہوگا تو وہ بائرن کیٹس اور شیلے کی قسم کا کوئی شاعر نہیں ہوسکتا جن کا میدان زیادہ تر تغزل ہی ہے اور جو حسن و عشق کے مضامین کے لئے مشہور ہیں ۔ بلکہ درد سورتھ، ملٹن یا ٹینی سن ایسا ہی کوئی شاعر ہوسکتا ہے جو قومی یا حکیمانہ شاعری اور یا منظر نگاری کے لئے مشہور ہیں۔ پس بلاغت کے اقتضا کے مطابق مولانا حالی اگر چاہتے تو مغربی کے بجائے موخر الذکر شعراء میں سے کسی ایک شاعر کا نام تلفظ کے ادل بدل کے ساتھ بڑی آسانی سے لکھ سکتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ "مغربی" سے مراد مغرب کی پیروی ہرگز نہیں ہے بلکہ مغربی کوئی شاعر ہے اور مولانا حالی کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہ شاعر کون ہے؟ تو بعض اربابِ علم و ادب کا خیال ہے کہ یہ شیخ محمد شیریں

تبریزی ہے جو اپنا تخلص مغربی کرتا تھا۔ مولانا حالی کے اس سے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ مغربی کا کلام زیادہ تر عارفانہ اور صوفیانہ ہوتا ہے اس بنا پر مولانا حالی کی مراد یہ ہے کہ اب عشق مجازی کے بکھیڑوں سے منہ موڑ کر معرفتِ حقیقی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں مغربی کا طرز اختیار کرنا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال درست اور صحیح ہو لیکن مغربی کے لفظ کو سنتے ہی سب سے پہلے ہمارا جو انتقالِ ذہنی ہوا وہ ابنِ زیدون کی طرف ہوا۔ ابن زیدون عربی کا مشہور شاعر ہے۔ اندلس کا رہنے والا تھا اور اس کی شہرت زیادہ تر اندلس کے مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ہی ہے۔ اندلس کو عام طور پر مغربی کہا ہی جاتا ہے۔ مولانا حالی ایسے فاضل سے یہ بعید ہے کہ انھوں نے ابنِ زیدون کا مرثیۂ اندلس نہ پڑھا ہو اور پڑھکر اس سے غیر معمولی طور پر متاثر نہ ہوئے ہوں۔ اس بنا پر عجب نہیں مولانا حالی کی مراد یہ ہو کہ اب مصحفی و میر کا زمانہ نہیں ہے۔ جس میں گل و بلبل اور خد و کاکل کی حکایتیں ہوتی تھیں بلکہ قوم پر ایک عام ادبار طاری ہے اس لئے ابنِ زیدون کی طرح قوم کا مرثیہ پڑھنا اور اس کی حالتِ زبوں کا ماتم کرنا چاہئے۔

اس بحث میں ہم خواہ مخواہ ترقی پسند ادب کو درمیان میں لانا پسند نہیں کرتے لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ "پیروئے مغربی" سے جو حضرات مغرب کی پیروی مراد لیتے ہیں وہ زیادہ تر ادب اور تعلیم کی وضع جدید سے تعلق رکھنے والے ہیں اور دوسرے گروہ میں وہ حضرات شامل ہیں جو قدیم وضع تعلیم کے حامل ہیں۔ راقم الحروف نے اس سلسلہ میں اپنے استاذ شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو دہلی یونیورسٹی و حال پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور سے بھی تحریراً استصواب کیا تھا اور خود اپنی رائے بھی لکھ دی تھی۔ مولانا مرأۃ الشعر ایسی بلند پایہ کتاب کے مصنف اور علوم مشرقیہ کے فاضل جلیل کی حیثیت سے ہندوستان کے اربابِ علم میں اپنا ایک مقام خاص رکھتے ہیں۔ مولانا نے بھی راقم الحروف کی ہی تائید کی ہے اور لکھا ہے "پیروی سے پیروی طرزِ مغرب مراد رکھنا یا مراد لینا میرے نزدیک مخل ہے"۔ البتہ مولانا بھی مغربی سے مراد فارسی شاعری ہی لیتے ہیں۔

حدیث افتراقِ امت

امتِ محمدیہ کے ۷۳ فرقے

۳

جناب مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

فرقوں کی یہ کثرت پھر امت محمدیہ کی عقلاء کے لئے عجب گرداب حیرت بن رہی ہے۔ ایک مفکر یہ سوچ رہا ہے کہ افتراق و تشتت کی اتنی کثرت میں آخر راز کیا ہے پھر امتِ محمدیہ کے ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہدینا اور صرف ایک فرقہ کو جنتی کہنا اس کے لئے اور بھی مشکل کا ساماں بنا ہوا ہے ادہر ایک مورخ صفحاتِ عالم کی ورق گردانی کر کرکے تھکا جاتا ہے مگر اس کا بیان حدیث کے عدد سے ٹکر نہیں کھاتا بہت حساب لگاتا ہے مگر کبھی یہ عدد گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے۔ ان الجھنوں سے گھبرا کر جب وہ نظر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کو ایک راہ یہی آسان نظر آتی ہے کہ وہ اس حدیث ہی سے دستبردار ہوجائے جس غریب کو یہ پہلا موقع پیش آیا ہو اس کا گھبراجانا کچھ موجب تعجب ہی نہیں۔

احادیث میں مفہومِ عدد کی بحث

لیکن ایک محدث جب ان مشکلات پر گذرتا ہے تو دنیا کی حیرت اس کے لئے خود موجب حیرت بن جاتی ہے وہ اعداد و شمار کی بحث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اعداد و شمار صرف وقتی استحضار اور متکلم کے ذہنی اعتبار کی ایک بات ہوتی ہے کبھی وہ ابہام و اجمال کا ارادہ کرتا ہے تو عدد میں بھی پوری تفصیل اختیار نہیں کرتا اور کبھی تفصیل پر اترتا ہے تو عدد کی بھی تفصیل کر ڈالتا ہے۔ طبیعت کے انشراح اور وقت و ماحول کی وسعت کے لحاظ سے دونوں صورتیں اختیار کرلینا معقول بات ہے افراد کو انواع اور انواع کو اجناس کے تحت میں داخل کرتے چلے جائیے تو عدد گھٹتا چلا جائے گا اور اس کے برعکس اجناس و انواع کی تحلیل کرتے جائیے تو وہی

عدد بڑھتا چلا جائے گا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

اعداد و شمار میں مؤرخ کا اختلافِ نظر

اسی طرح اگر کوئی مورخ فرقہائے عالم کے متعلق کوئی عدد لکھتا ہے تو یہ اس کی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس فرقہ کو کتنی تاریخی اہمیت دینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض معمولی فرقے اس کے نزدیک تاریخی لحاظ سے قلمبند کرنے کے قابل ہوں اور بعض بڑے فرقے یہ اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ہر مورخ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار کے لحاظ سے جو عدد چاہے ذکر کرے یہاں تطبیق و اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس مورخ کا معیار اور اس کی اہمیت و غیر اہمیت کا اندازہ نہ لگا لیا جائے، پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے اس معیار سے اتفاق رائے بھی کر لے۔ ہر شخص کا ذوق اور اس کا نقطۂ نظر علیحدہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی دوسرا معیار مقرر کر لے ان معمولی مقامات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہاں ہم آپ کے سامنے اسی نوع کی چند احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ احادیث میں یہ دن رات کی باتیں ہیں۔ حدیث کی وضع و صحت کا فیصلہ ان پر نہیں ہو سکتا۔

اختلافِ عدد کی چند مثالیں

(۱) احادیث شعب الایمان میں ایمان کے شعبوں کا عدد کہیں ۷۰ سے اوپر اور کہیں ۶۰ سے اوپر بتلایا گیا ہے۔ کیا ۶۰ کو پھیلا کر ۷۰ یا ۷۰ کو سمیٹ کر ۶۰ کہنا کوئی بہت ہی بعید از حقیقت بات ہے۔

(۲) بعض احادیث میں رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء اور کہیں اس کے خلاف بتلایا گیا ہے۔ احادیث میں یہاں سخت اختلاف ہے۔

(۳) احادیث تقسیم رویا میں کہیں ثلاثی تقسیم مذکور ہے اور کہیں ثنائی۔

(۴) خصائص نبوت کے سلسلہ میں کہیں ۵ خصائص مذکور ہیں اور کہیں زیادہ۔

(۵) امت کے شہدا کے عدد میں بھی بڑا اختلاف ہے۔

(۶) کنتم خیر امت کی تفسیر میں صاحب مشکوٰۃ نے جامع ترمذی کی ایک حسن روایت نقل کی ہے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم ۷۰ امتوں میں وہ آخری سترویں امت ہو جو خدا کو سب امتوں میں پیاری امت ہے۔ کیا نہیں ہو سکتا کہ اس امت کا سترویں امت ہونا تفاوتِ درجات اور مراتبِ خیریت کے لحاظ سے ہو۔

(۷) جامع ترمذی میں ہے کہ اہلِ جنت کی ایکسو بیس صفیں ہیں ۸۰ امت محمدیہ کی اور بقیہ دوسری امتوں کی۔

(۸) صحیح احادیث میں دجالوں کا عدد کہیں تیس اور کہیں ۷۰ تک بھی موجود ہے وغیرہ وغیرہ

اختلافِ عدد کے مختلف جوابات اس قسم کی احادیث میں علماء کے مختلف نظریات ہیں کوئی محض اپنی ذہانت سے نکتہ طرازیاں کر کے ان مختلف عددوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ ایک وقت آپ کو اس عدد کا علم دیا گیا تھا اس کے بعد اس سے زیادہ کا علم دیدیا گیا۔ محدث مزاج اگر قرائن دیکھ لیتا ہے تو کبھی کبھی اضطراب کی بھی ٹھہرا دیتا ہے۔ محاوراتِ کلام سے ذوق رکھنے والا اس عدد کو صرف تکثیر کے لئے سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جواب ان اعداد میں تو درست ہے جہاں محاورۂ عرب میں وہ عدد تکثیر کے لئے مشہور ہو جیسا ۷۰ کا عدد۔ آیت ذیل میں یہی تکثیر کے معنیٰ مراد ہیں۔

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً	اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں تو
لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔	بھی ہرگز ہم ان کی مغفرت نہیں کریں گے۔

اب احادیثِ بالا پر غور کیجئے کیا اگر شعب الایمان شمار کے بعد حدیث کے مذکورہ بالا عدد سے کم و بیش ثابت ہوں تو صحیح بخاری کی اس حدیث کو ضعیف یا موضوع کہدیا جائے گا یا اگر دجالوں کا عدد تاریخی لحاظ سے احادیث کے عدد کے موافق ثابت نہ ہو تو اس سارے ذخیرہ احادیث کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرا دیا جائیگا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جن دجالوں کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کے عدد شمار میں کسی خاص صفت کی رعایت کی گئی ہو۔ حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف ان دجالوں کا عدد بیان فرمایا ہے جن کو قوت و شوکت حاصل ہو گی ورنہ دعویٔ نبوت

بسا اوقات سوداویت اور جنون کی وجہ سے بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسے مدعیینِ نبوت بے شمار گذرے ہیں ان سے حدیث میں کوئی بحث نہیں۔

صحیح بخاری کتاب الفتن میں ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امرار جور کے نام (ظالم بادشاہوں کے نام) بتلائے گئے ہیں اگر میں چاہوں تو ان کا نام ونسب تک بتلا سکتا ہوں۔ اس حدیث سے گمان ہوسکتا ہے کہ شاید تمام امرار جور کے نام ان کو بتلائے گئے تھے لیکن حضرت حذیفہؓ سے مشکوۃ شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان قائدینِ فتن کے نام بتلائے ہیں جن کے ساتھ تین سو یا اس سے زیادہ کی جماعت ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں عدد وشمار بیان کرتے وقت ضرور کوئی معیار ہوتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے وہ معیار یہاں ہمارے سامنے آگیا ہے ورنہ حضرت حذیفہؓ کے متعلق ہم یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہر ہر قائد فتنہ کا نام بتلادیا گیا تھا۔ احادیثِ فتن میں اس عام ابہام وانتشار کے علاوہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اسی قسم کی روایات احادیثِ حلال وحرام کی طرح عام صحابہ سے دستیاب نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا مخاطب ہر ذی فہم اور غیر ذی فہم بنایا نہیں جاسکتا اس لئے اور ابہام واجمال پیدا ہوجاتا ہے مگر یہ ابہام اس لئے مضر نہیں ہوتا کہ فتنے جب سامنے آتے ہیں تو اہلِ بصیرۃ پر ان کا فتنہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔ اس تشخیص وتعیین کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی کہ یہ فتنہ کونسا فتنہ ہے۔ اسی طرح حدیث زیرِ بحث میں امت کے افتراق کی پیش گوئی کی گئی ہے اس کا مقصد اس افتراق سے آگاہ کرنا اور ان گمراہیوں کے دور میں اس کی تاکید کرنا ہے کہ دامنِ سنت اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اسی لئے صحابۂ کرام نے اس حدیث کو سن کر یہ سوال نہیں کیا کہ وہ فرقے کون سے ہیں ان کی علامات کیا ہیں بلکہ یہ پوچھا ہے کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ کونسا فرقہ ہے کیونکہ عملی لحاظ سے یہی مفید ہے کہ اس کے فرقہ کی تعیین ہوجائے جب یہ ایک ہی فرقہ ہے تو اس کے سوا جتنے فرقے ہیں وہ بلا بحث کئے خودبخود باطل فرقے ہوں گے۔ اس لئے صحابہ کے نزدیک اس بحث میں پڑنا ہی ایک دماغی تعزیہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

پس جب تک کہ عدد و شمار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر معلوم نہ ہو جائے مستقیم
لاسناد احادیث کو ضعیف یا موضوع قرار دیدینا بڑی جسارت اور انتہائی دلیری ہوگی۔ حدیث افتراقِ
مت بھی اسی سلسلہ کی ایک حدیث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی کسی خاص معیارِ ضلالت و فتنہ کے
عتبار سے یہ خاص عدد بتلایا گیا ہو۔

پھر امت کے ۷۳ فرقوں کا مسئلہ کوئی عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سلسلۂ فتن و انقلابات
لی ایک پیشگوئی ہے اور اس باب کی عام احادیث کی طرح اس کے بھی بہت سے پہلو مبہم ہیں انھیں اپنے
حال پر مبہم رہنے دو۔ اس ابہام کی وجہ سے حدیث کو موضوع یا ضعیف کہنا بے معنی ہے۔

پیشگوئی کی احادیث میں ابہام ناگزیر ہے

فنِ حدیث پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ دورِ فتن اور مستقبل کے واقعات کی
احادیث میں اکثر ایک نوع کا ابہام ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جزئیات
کی جب تعیین کی جاتی ہے تو علی العموم وہ الفاظ کلیات کا جامہ پہن لیتے ہیں اور اس لئے جب انسان
اس کو اپنے محل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جتنی صفائی سے اس کا دل چسپاں کرنا چاہتا ہے،
چسپاں نہیں کر سکتا مثلاً تھوڑی دیر کے لئے آپ فرض کر لیجئے کہ زید کی شکل و صورت آپ قیدِ الفاظ میں لانا
چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رنگ یہ ہے نقشہ یہ ہے اور بہت سے بہت اس کا طول و عرض
بتا سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ سب الفاظ اتنی تعیین پیدا کر سکتے ہیں کہ پھر دوسری صورت پر اس کا صادق کرنا ممکن
ہی نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ قیود خود زید ہی کی صورت کی تشخیص میں اور صعوبت پیدا کر دیں۔ جب
ایک نادیدہ شخص کی تعیین صرف الفاظ سے پوری نہیں ہو سکتی تو مستقبل کے حوادثات کی تعیین باجود ان کے
تنوع اور تشابہ کے کیونکر ہو سکتی ہے۔

شریعت کا ایک اہم نصب العین

اتنی تشریح شریعت کے اصل نصب العین کے بھی خلاف ہے وہ اپنے مخاطب
دماغوں کو ایسی تربیت دینا چاہتی ہے کہ جو علومِ غیبیہ وہ بیان کرے وہ بلا تردد صرف
اس کے اعتماد و وثوق پر قابلِ یقین ہو جائیں اور اس تسلیم و رضا کی انھیں ایسی عملی مشق حاصل ہو جائے کہ
پھر جہاں ان کے سامنے تفصیل کر دی جائے وہاں تفصیل ہی مناسب معلوم ہو اور جہاں اجمال رکھا

جائے وہاں اجمال ہی پسندیدہ نظر آنے لگے۔ آئیے آثار ذیل میں اس تربیت کے آثار ملاحظہ فرمائیے۔

خرج عمر علی الناس	حضرت عمرؓ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تمہیں اس
فقال احرج علیکم ان	کی اجازت نہیں دیتا کہ جو واقعہ اب تک پیش نہیں آیا
تسئلونا عما لم یکن فان	تم اس کے متعلق مجھ سے فرضی سوالات کرو کیونکہ جو
لنا فیما کان شغلا۔	واقعات کہ اب تک پیش آچکے ہیں ہمیں ان کے غور و
؁	خوض میں ہی کافی مصروفیت رہتی ہے۔
وکان زید بن ثابت اذا سئل	حضرت زید بن ثابتؓ سے جب فرضی سوالات کئے
عن شئ یقول کان ھذا فان	جاتے تو آپ دریافت کرتے کہ کیا یہ واقعہ پیش
قالوا لا قال دعوہ حتی یکون	آچکا ہے۔ اگر کہا جاتا کہ نہیں تو فرماتے کہ جب تک
؁	پیش نہ آجائے اُسے رہنے دو۔

حضرت ابن عمرؓ سے استلام حجرِ اسود کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے اس پر سائل نے یہ فرضی سوالات شروع کردیئے کہ اگر بھیڑ ہو جائے، اگر میں نہ کرسکوں تو جواب یہ دیا ہے۔

اجعل ارائیت بالیمن ؁ اپنے ان فرضی سوالات کو یمن میں ڈال

یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اس کی اقتدا کی پوری کوشش کر اور خواہ مخواہ جان چرانے کے لئے فرضی سوالات مت کر۔ انسان بسا اوقات اس لئے سوالات کرتا ہے کہ وہ اس ذریعہ سے مخاطب پر جواب کا دروازہ تنگ کرکے اس کی زبان سے اپنے لئے جواز کی رخصت حاصل کرلے۔

مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے پوچھا۔ کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے میں نے عرض کیا۔ نہیں فرمایا۔

اجمنا یعنی ارحنا حتی یکون ابھی تو ہمیں آرام سے رہنے دو جب پیش آجائیگا تو ہم

؁ جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۶۵۔ ؁ ایضاً ؁ ایضاً

فاذا کان اجتهد نالك — ہماری خاطر اس میں غور کرلیں گے اور یقیناً اس کا کوئی
رأینا۔ ؎ — نہ کوئی حل بھی اُس وقت ہماری سمجھ میں آجائے گا۔

صرف دماغی تفریعات علمی جدوجہد میں مخل ہوتی ہیں

ان کے علاوہ حضرت عمار، حضرت معاذ بن جبل اور دیگر تابعین و علماء سے بھی بکثرت ایسے آثار مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محض دماغی تفریعات میں پڑے رہنا انسان کی علمی جدوجہد کے لئے مضرت رساں ہے۔ آج بھی جس قدر بے عمل افراد یا جماعتیں نظر آئیں گی ان پر غور کروگے تو ان کا مشغلہ بھی دماغی عیاشی نظر آئیگا اور بس۔ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس نظریہ کے متعلق کیا کیا فرق ہوتا گیا اس پر بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اخبارِ غائبہ میں مذاقِ سلف

ان آثار سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پیش گوئیوں کے سلسلہ میں مذاقِ سلف کیا ہونا چاہئے کیا انھوں نے کھلے طور پر ایک ایک بات کی ہندی کی چندی کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر خود ہی انصاف کیجئے کہ اگر کچھ وجوہات کی بنا پر ان احادیث کے بعض پہلو اسی زمانہ میں مبہم رہ گئے تو بعد میں اب کون ہے جو ان کو صاف کرسکتا ہے اور اگر نہیں کرسکتا تو کیا اس لئے اُن احادیث کی صحت پر کوئی اثر پڑنا چاہیئے۔

فرقہائے مختلفہ کی تعیین

جہاں تک ہمارا علم ہے پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان فرقوں کی نام لیکر کسی حدیث میں تعیین نہیں کی گئی ہاں کچھ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ان فرقوں کی تعیین میں مدد لی جاسکتی ہے۔ نام لے لیکر مدح وذم کرنا ہماری شریعت کا دستور بھی نہیں ہے۔ فارس اور اہلِ مدینہ کے فضائل میں متعدد احادیث ملتی ہیں مگر کوئی حدیث ایسی ثابت نہیں ہوئی جس میں نام لیکر ان کا مصداق بتایا گیا ہو۔ علماء نے صرف اپنی جانب سے قیاس آرائیاں کی ہیں۔ پس جب مقام مدح پر نام لینا احادیث کی سنت نہیں تو مذمت کے ذیل میں کسی کا نام لینا کب اس کے بلند اخلاق کا اقتضاء ہوسکتا ہے۔ بلکہ شریعتِ محمدیہ کا یہ ایک عام قانون ہے کہ اگر سہو و نسیان کی بنا پر کسی شخص سے کوئی معصیت سرزد ہوجائے تو تا امکان اس کی پردہ پوشی ہی کرنی چاہئے حدود کے باب میں شہادت کے اندر

؎ جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۶۵۔

جس قدر شدت اختیار کی گئی ہے وہ بھی صرف ستر اور پردہ پوشی کی حکمت پر مبنی ہے[۱]۔ یعنی شریعت یہ نہیں چاہتی کہ پورے ثبوت کے بغیر فواحش اور حیاناک جرائم کی اشاعت یا کسی مسلمان کی پردہ دری کی جائے۔

مغیرہ بن شعبہ پر تہمت کی تشفی بخش تحقیق

مغیرہ بن شعبہ کے متعلق تہمتِ زنا پر حضرت عمرؓ کی دعا کا جو واقعہ مشہور ہے اس کا منشا بھی یہی تھا۔ نکتہ چینوں نے اُسے دوسرا رنگ دیا ہے اور حضرت عمرؓ کے عیوب کی فہرست میں شمار کیا ہے مگر دور بینوں نے اسی کو بڑی حکمت پر مبنی سمجھا ہے یہ فہم اور دردواسی کو میسر آسکتا ہے جس کو مقاصدِ شریعت کا پورا ادراک ہو جس پہنچ اس کی رعایت کر سکتا ہے کہ اگر اسلام کے دورِ اول میں کسی مقتدر شخصیت کے متعلق کوئی غلط الزام حدِ ثبوت کو پہنچ جائے تو آئندہ نسلوں کے لئے وہ کتنا مضرت رساں ہو سکتا ہے۔

واقعہ کی حقیقت یہاں کل اتنی تھی کہ انھوں نے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا وہی بڑے عنوان سے مشہور ہو گیا چونکہ اس وقت اس قسم کے نکاح کی حضرت عمرؓ نے ممانعت فرما دی تھی[۲] اس لئے انھیں یہ عذر کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا کہ میں نے خفیہ نکاح کر لیا ہے چنانچہ جب عدم ثبوت کی وجہ سے مقدمہ خارج ہو گیا اور ان سے حقیقتِ حال دریافت کی گئی تو انھوں نے صاف طور پر اپنے نکاح کا حال بیان کر دیا۔[۳]

---

[۱] انما امر الله بالعدد فی شهود الزناء لانه مامور فيه بالستر ولهذا اغلظ فيه النصاب۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۱)

اللہ تعالیٰ نے زنا کے گواہوں میں عدد اس لئے شرط قرار دیا ہے کہ ان معاملات میں (جب تک ثبوت نہ ہو) اصل ستر ہے اسی لئے نصابِ شہادت میں نسبتہً زیادہ سختی اختیار کی گئی ہے۔

[۲] حضرت عمرؓ نے یہ ممانعت اس لئے فرمائی تھی کہ عام طور پر نکاحِ سر دو وجہ سے کیا جاتا ہے یا تو اس میں شرعی مصالح کی پوری رعایت نہیں کی جاتی اس لئے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کھلے طور پر یہ نکاح کر لیا گیا تو شاید کسی کو اس پر اعتراض ہوگا، یا اس دعوی کو فواحش کے لئے آڑ بنایا جاتا ہے حضرت عمرؓ کو ان دونوں باتوں کا سدّ باب منظور تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے بھی اسی قسم کے مصالح کے پیشِ نظر انعقاد نکاح کے لئے نصابِ شہادت شرط قرار دیا ہے۔ حالانکہ کسی اور عقد میں انعقاد کیلئے

[۳] روی ابن النحوی فی البدر المنیر ان المغیرة ادعی فی تلك المرءة التی رمیٰ بها انها زوجته قال وكان يرى نكاح السر وروی انه كان يتبسم

ابن النحوی بدرِ منیر میں روایت کرتے ہیں کہ جس عورت کے معاملہ میں حضرت مغیرہ کو تہمت لگائی گئی تھی ان کے نزدیک وہ ان کی بیوی تھی کیونکہ خفیہ طور پر نکاح کر لینا ان کے نزدیک جائز تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب گواہ

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

علمار جرح و تعدیل نے تمام تر احتیاط کے باوجود اپنی ان نکتہ چینیوں پر جو تنقید حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے راویوں کے متعلق کی ہیں بہت تاسف کا اظہار کیا ہے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ شانِ ستاری ہرگز اس کے درپے نہیں ہے کہ وہ امت کے مجرمین کی بر سر بازار رسوائی کا کوئی آئینی دستور تیار کرے[1]۔ یہ بنی اسرائیل جیسے باغیوں ہی کے لئے موزوں تھا کہ جب شب میں وہ کوئی گناہ کرتے تو اس کی صبح کو اپنے دروازوں پر لکھا ہوا دیکھ لیتے، یا مالِ حرام سے صدقہ دیتے تو آسمان سے آگ اترتی اور اس کو جلائے بغیر واپس ہو جاتی اور یہ ان کی رسوائی کا عام اعلان ہوتا۔ امتِ محمدیہ کے لئے اب یہ سب آئین پردہ دری منسوخ ہو چکے ہیں۔

امتِ محمدیہ کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت

علمار نے اس امت کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت ہی یہ تحریر کی ہے کہ اب خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس امت کی داستانِ عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

جماعتِ منافقین کی ریشہ دوانیوں سے کتب سیرت و تاریخ بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ شریعت کا سلوک یہی تھا کہ ان میں سے جس نے نمائشی طور پر بھی اسلام کا نقاب[2] ڈال لیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عند شهادتهم فقيل له في ذلك فقال اني اعجب مما اريد ان افعله بعد شهادتهم فقيل وما تفعله قال اقيم البينة على انها زوجتي ذكره في البدر المنير (الروض الباسم ج ۱ ص ۱۴۷)

ان کے خلاف گواہی دے رہے تھے تو یہ کھڑے مسکرا رہے تھے جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے کہ ان کی گواہی کے بعد جو میں کرنا چاہتا ہوں اسی کی وجہ سے مجھے ہنسی آرہی ہے دریافت کیا گیا آپ کیا کریں گے فرمایا کہ میں اس کا ثبوت پیش کروں گا کہ یہ میری بیوی ہیں۔ اس واقعہ کو بدر منیر میں ذکر کیا ہے

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] ابن ابی حاتم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دن ان کے سامنے کتاب الجرح والتعدیل پڑھی جارہی تھی۔ محمد بن مہرویہ رازی نے کہیں ان سے یحییٰ بن معین کا یہ مقولہ نقل کیا "ہم ان لوگوں پر بھی طعن کر گذرتے ہیں جو ہم سے دو دو سال پیشتر اپنے خیمے جنت میں لگا چکے ہیں" یہ سن کر ابن ابی حاتم رونے لگے اور جسم پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس حکایت کو پھر دوبارہ انھوں نے سنا اور پھر خوب روئے۔

اس کو رسوا نہیں کیا گیا یعنی جو مومن کا بھیس بنا کر آگیا اسے آنے دیا گیا اور جس نے زبانی اسلام کی شہادت دیدی اس کی شہادت قبول کرلے گئی۔

ماسوا اس کے افتراق و تشتت، تعصب و نخوت کے دور میں جماعتوں کو نام لے لیکر گمراہ اور دوزخی ٹھیرانا بھڑکتے ہوئے فتنوں کو اور بھڑکانا ہے۔

امام غزالیؒ کی ایک مفید نصیحت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہلِ حق کا تعصب بن گیا ہے، انھوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو بنظرِ حقارت ونفرت دیکھا۔ جاہلوں نے صرف ان کی ضد میں اپنے جہل وعناد میں اور تشدد اختیار کرلیا۔ شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد بن گئے حتیٰ کہ کلام اللہ کے حدوث وقدم کے مباحث میں یہاں تک مبالغہ آمیزیاں ہوئیں کہ جو آواز انسان کے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کہدیا گیا۔ کاش اگر یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو یہ بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنوں کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔

اس عام سنت کے سوا اگر کہیں کسی جماعت یا فرد کا نام لیا گیا ہے تو کسی خاص ہی مصلحت کے لئے جس پر علماء نے اپنی جگہ کافی بحث کردی ہے اس لئے ان فرقوں کی تعیین پر بحث کرنا قطعاً غیر ضروری ہے تاہم جب اذہان اس طرف متوجہ ہوگئے اور بحث شروع کردی گئی تو مجبوراً ہمیں بھی کچھ لکھدینا مناسب ہے اس موضوع پر علماءِ کلام اور علماءِ اصول دونوں نے اپنی اپنی جگہ گفتگو کی ہے ہمارے نزدیک علامہ طرطوشی کا کلام سب میں منتخب ہے اور اسی کو علامہ شاطبی نے بھی اختیار فرمایا ہے اس لئے ہم اسی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

یہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ حدیث میں زیرِ بحث صرف وہ اختلافات ہیں جو تفریق فی الدین کی حد میں آسکتے ہیں۔ یہ وہ افتراق ہے جو صراطِ مستقیم سے وابستہ رہ کر انحراف کے نتائج میں پیدا ہوجاتا ہے جس کا نام قرآنی لفظ میں "السبل" رکھا گیا ہے اس کا حاصل اصل دین سے منتسب رہ کر اس کے بعض اصول وکلیات کے ساتھ اختلاف کرنا ہے اس لئے یہاں اختلاف وافتراق سے امت اجابت ہی کا اختلاف وافتراق مراد ہوگا۔ امتِ دعوت کا اختلاف جس میں کفار بھی داخل ہوجائیں مراد نہیں ہوسکتا

یہ دوسری بات ہے کہ اگر یہ انحراف اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو اس کی انتہا کفر پر بھی ہو سکتی ہے۔

حدیث کے لفظ امتی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس اختلاف کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ لفظ امت کے تحت میں رہ کر ہی ہونا چاہئے، یہاں امت سے امتِ دعوت مراد لے لینا بہت بعید ہے کیونکہ اس امت کے اختلاف کو بنی اسرائیل کے اختلاف کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف یہودیت و نصرانیت کے وسیع مفہوم میں داخل رہ کر ہی تھا اسی طرح اس امت کا اختلاف بھی امتِ اجابت میں رہ کر ہونا چاہئے۔ کفر اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ شرعی نظر میں ایک ہی ملت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے تشتت و افتراق کی بحث شریعت میں غیر مفید بحث ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو بھی یہی نظر آتا ہے کہ اسلام میں جو مختلف فرقہ بندیاں ہوئیں ہمیشہ وہ اسلام ہی کے نام پر ہوئیں۔ خوارج کے جنگ کی تمام بنیاد یہی تھی کہ وہ اپنا قدم اسلام اور صراطِ مستقیم پر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو دائرہ اسلام سے باہر قرار دیتے تھے، معتزلہ، مرجیہ اور دیگر فرقِ باطلہ سب اپنی اپنی جگہ یہی دعویٰ رکھتے تھے کہ سیدھی راہ ان ہی کی راہ ہے دوسری جماعتیں منحرف اور حق سے ہٹی ہوئی جماعتیں ہیں ان وجوہ کی بنا پر ظن غالب یہ ہے کہ ان فرقوں کا ظہور صرف اسلام کے اندر مقدر ہے کفر کی جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

فرقہ باطلہ کی پہلی علامت بغض و نفاق ہے

ان فرقہائے باطلہ کی تعیین کا راستہ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی علامات پر اصولی طور پر بحث کی جائے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انحراف، زیغ، اور افتراق کی بڑی علامت خود آپس کا اختلاف ہے پس اگر کوئی مسئلہ اسلام میں زیرِ بحث آتا ہے اور اس کی وجہ سے افتراق و تشتت نہیں پھیلتا، بغض و عداوت کی ہوا نہیں چلتی، امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہوتا۔ آپس کی محبت و مودت ختم نہیں ہوتی تو اس کو اختلافِ مذموم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر اس کا نتیجہ تحزب و تعصب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسے انحراف کا اثر سمجھنا چاہئے۔ آیۃ ولا یزالون مختلفین کی تفسیر کے ذیل میں مجاہد فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ باطل ہیں اور مرحومین کے متعلق لکھتے ہیں۔

اهل الحق لیس فیہم اختلاف　　　　اہلِ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔

مطرف بن شخیر کہتے ہیں کہ اگر کہیں اہلِ اہوا میں بھی محبت واتحاد ہوا کرتا تو یہ دہوکا لگتا کہ شاید یہی لوگ اہلِ حق ہوں لیکن جب اس نعمت سے وہ محروم ہیں تو اب ہر ذی عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اہلِ حق نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی شانِ اختلاف وافتراق نہیں۔

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ اہوا اور الامن رحم ربک اہل سنت والجماعۃ ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ رحمت اختلاف نہیں کرتے ؎۱ یہ الفاظ بتلا رہے ہیں کہ اُس وقت تک اہلِ حق کے قلوب میں فروعی اختلافات رکھنے کے باوجود کوئی بغض وعناد نہ تھا گو آج یہ سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہیں کہ فروعی اختلاف کے ساتھ محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے اگر غور کروگے تو موجودہ افتراق کی بنا یہ فروعی اختلافات نہیں ہیں بلکہ قلبی سرد مہری ہے ہاں بہانہ بنانے کو یہ بوجھ مذہب کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر رفع یدین اور آمین کے جھگڑے تحزب وتعصب اختلاف وافتراق کی صورت پیدا کرلیں تو ہرگز اس اختلاف کو بھی اہلِ حق کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔

حافظ ابنِ قیمؒ قیاس کی مذمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاسات ہی کی بدولت امت کے کلمہ میں تفریق پھیلی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قیاسات خدا کی مرضی کے برخلاف ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا　اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے

فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔　　ہوتا تو اس پر بڑا اختلاف نظر آتا۔

حضرت ابنِ عباسؓ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تبیض وجوہ کا مصداق اہلِ سنت اور اہلِ ائتلاف ہیں اور تسود وجوہ کا مصداق اہلِ فرقت واختلاف ہیں۔

اختلاف نہ کرنے کا حکم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں اختلاف برپا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بھی اختلاف پڑجائے گا۔ اسی لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے مفہوم میں صحابہؓ کا

؎۱ کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۹ و ۴۰۔

اختلاف دیکھتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا اور آپ کو اتنا غصہ آتا کہ آپ کا روئے انور انار کی طرح سرخ ہو جاتا اور فرماتے "کیا اس بات کا تم کو حکم دیا گیا تھا" بعثتِ رسول کا اصل مقصد ہی رفعِ اختلاف ہے اس لئے جو اختلاف کرتا ہے در حقیقت وہ اس اہم مقصد پر ہی ضرب لگاتا ہے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "اگر تم اختلاف کروگے تو تمہارے بعد والے اور زیادہ اختلاف کریں گے"

ایک دن حضرت عمرؓ کو خبر لگی کہ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعودؓ اس مسئلہ میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں ادا کرنا سنت ہے یا دو کپڑوں میں تو انھوں نے ممبر پر خطبہ دیا اور فرمایا "جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو کر ایسے ایسے مسائل میں اختلاف کروگے تو بھلا تمہارے بعد مسلمان کس کے قول کو اختیار کریں گے۔ اگر آج کے بعد میں نے سنا کہ دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے تو جو مجھے کرنا ہے کر گزروں گا"

حضرت علیؓ نے اپنے قاضیوں کو لکھ بھیجا "جیسا تم پہلے فیصلہ کیا کرتے تھے اب بھی اسی کے موافق کرتے رہو مجھے اختلاف پسند نہیں، میری تمنا ہے کہ جس طرح میرے پیشرو دنیا سے گذر گئے ہیں اسی طرح کسی اختلاف کے بغیر میں بھی گذر جاؤں"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "پہلی امتیں اسی عادت کی بدولت ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے اختلاف کیا کرتی تھیں" اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ "اپنی کتاب کے بعض حصہ کو بعض کے ساتھ متعارض سمجھکر ٹکرایا کرتی تھیں قرآن اس لئے نہیں آیا کہ تم آپس میں تعارض پیدا کر کے ایک آیت کو دوسری آیت سے ٹکراؤ بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہوا اترا ہے" [1]

---

[1] دیکھو اعلام الموقعین ج ا ص ۲۲۵ و جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۳ و ۸۴ ۔

حضرت عمرؓ کے اس خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی نظر کس قدر دور بیں تھیں وہ اجتہاد کو نہیں روکتے اختلاف کو روکتے ہیں، مناظرے کو روکتے ہیں اور ایسی بحث کو روکتے ہیں جو سر دست گو اختلاف نہ کہلائے مگر آئندہ کہیں امت کے لئے اختلاف کا تخم نہ ڈالدے۔ اسی طرح قرآن میں بحث و تمحیص کی ممانعت نہیں۔ ممانعت اس بحث کی ہے جس کا حاصل قرآن کی آیات میں اختلاف و تعارض ثابت کرنا ہو کوشش یہ کرنا چاہئے کہ جہاں اختلاف ہو اس کو تا امکان رفع کیا جائے جہاں تعارض نظر آئے اسے دور کیا جائے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اسی عداوت و بغض کی رو میں بہے چلے جارہے تھے خدائے تعالیٰ کا ان پر یہ بڑا انعام ہوا کہ اس نے ان کی بہتی کشتی اختلافات کی دھار سے نکال کر محبت و مودت کے کنارے لگا دی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً	اور ذرا اس زمانہ کو بھی یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن
فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ	تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ	اب جو صبح ہوتی ہے تو تم اس کی مہربانی سے ایک دوسرے
إِخْوَانًا۔	کے بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔

پس قلوب میں باہمی انس و محبت، الفت و اخوت یہ خدا کی بڑی نعمت ہے اس لئے یہ حصہ اسی کا ہوسکتا ہے جو اِلّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ کی فہرست میں داخل ہو چکا ہے اس کے بالمقابل اختلاف و افتراق اس نعمت سے محروم ہونے کی نشانی ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام میں ایک باب قائم کرکے لاتزال طائفۃ الخ کی حدیث نقل کی یعنی میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی اس کے بعد دوسرا باب قائم کیا اور یہ آیت تحریر فرمائی "او یلبسکم شیعا" خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہاری پارٹیاں بنا دے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان دونوں بابوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں آئندہ اختلاف ہوگا حتیٰ کہ حق پر قائم رہنے والا صرف ایک طائفہ رہ جائیگا اس لئے آئندہ باب میں اس اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انواعِ عذاب میں اختیار دیا گیا تو آپ نے عذاب کی تمام قسموں میں سے عذابِ افتراق کو پسند فرمایا تھا کہ اس میں پہلی امتوں کی طرح آپ کی امت کا استیصال تو نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف و تشتت یہ ایک عذاب ہے اور خود اہلِ باطل ہونے کی نشانی ہے۔ [1]

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) نہ یہ کہ جہاں اختلاف کا کوئی شائبہ نہ ہو وہاں دماغ سوزی کرکے اختلاف پیدا کیا جائے اہلِ حق اور اہلِ اختلاف کے مزاج کا اگر اندازہ کروگے تو دونوں کی بحثوں میں مابہ الامتیاز یہی ہوگا ان کا مقصد بحث کرکے اختلاف مٹانا ہے ان کا مدعا بحث کرکے اختلاف پیدا کرنا ہے۔ واللہ المستعان

[1] اگر آپ اختلاف کے صحیح معنی سمجھ گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تو برعکس اہلِ حق میں اختلاف اور اہلِ باطل میں اتفاق نظر آتا ہے۔

دوسری علامت اتباع متشابہات ہے

مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے محکم و متشابہ کی حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کہتا ہے :-

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ - خدا ہی نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں آیات محکمات ہیں جو کتاب کا بڑا حصہ ہے۔ اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔

عربی میں لفظ اُم کے معنی اصل اور بڑے کے آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے، یہیں سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی ہے سورۂ فاتحہ کو بھی ام الکتاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اصول کتاب پر حاوی ہے۔ ام الطریق بڑے راستہ کو کہا جاتا ہے وہ بھی چھوٹے راستوں کے پھٹنے کی اصل ہوتا ہے۔ دراصل اُم میں اصل ہونے کے ساتھ اس کے مرجع اور مرکز ہونے کا مفہوم بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ ماں کو عربی میں اسی لئے ام کہتے ہیں کہ وہ اولاد کی اصل اور ان کا مرجع ہوتی ہے یعنی وہ اسی کے اردگرد رہتے ہیں ضرورت کے وقت اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ جنگ کے بڑے جھنڈے کو بھی اُم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لشکر کروفر کے وقت اسی جگہ لوٹ کر آتا ہے [1]

اس لحاظ سے محکمات کے ام الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ قرآن کا بڑا حصہ اور اصل ہیں یہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور قرآن کا دوسرا حصہ جو نہ اس کی اصل ہے اور نہ اتنا بڑا ہے وہ انھیں محکمات کے اردگرد گھومتا رہے گا جب ان میں کوئی الجھاؤ پیش آئے گا تو ان ہی محکمات کی طرف لوٹ کر حل کر لیا

---

[1] اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی ایک لطیف حکمت یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں اپنی جگہ رہتی ہے۔ بقیہ قرآن اس سے آ آکر لگتا رہتا ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہوگئی کہ ہر رکعت میں خاص سورۂ فاتحہ ہی کیوں واجب کی گئی ہے بقیہ سورتوں میں کوئی اور سورت واجب کیوں نہیں کی گئی اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں جو سورت اُم کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سورۂ فاتحہ ہے اس لئے اسی کا حق ہے کہ یہ سورت بہ حیثیت ام اپنی جگہ رہے اور بقیہ قرآن اس سے آآکر لگتا ہے۔

(از افادات حضرت استاد قدس سرہ)

جائے گا اور ام کی طرح ان کو مستقل حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ جب آپ محکم و متشابہ کا فرق سمجھ چکے تو اب سنئے کہ محکمات و متشابہات کی اس تقسیم ہی نے یہاں خدا کی قہر و مہر کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ مومن، راسخ فی العلم کے لئے راستہ یہ ہے کہ وہ محکمات پر عمل کرتا رہے اور متشابہات پر ایمان لاتا رہے اس کے برعکس کج فطرت یہ وتیرہ اختیار کر لیتا ہے کہ قرآن کا جو کھلا ہوا حصہ ہے اسے تو متشابہات کی طرح عملاً چھوڑ دیتا ہے اور جو متشابہات ہے اس کو محکمات کی طرح زیر بحث لے آتا ہے چونکہ متشابہات خود تو اپنی مراد میں واضح نہیں ہوتے اور یہ شخص ام کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا اس لئے جس قدر اس کی مراد حاصل کرنے میں دوڑتا جاتا ہے اسی قدر منزلِ مقصود سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ کہیں پہنچکر اس کی پیاس بجھے مگر اس کی تشنگی اور بڑھتی رہتی ہے اور اسی جدوجہد میں اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے نہ اُسے ساحلِ مراد ہی ہاتھ آتا ہے نہ اس بدنصیب کا سفر ہی تمام ہوتا ہے۔

خدائے قدوس نے حل و حرمت اور عمل کے جتنے آئین بنائے ہیں اس میں کوئی ابہام نہیں رکھا اور جہاں ابہام رکھا ہے اس پر عمل کی دعوت نہیں دی بلکہ صرف ایمان لانے کا امر کیا ہے۔ اب اگر کوئی بدنصیب صحیح راہ نہیں چلتا اور خود بھٹکتا پھرتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا کا راز اسی تقسیم میں مضمر ہے۔ اسی جگہ مخلص و غیر مخلص، سعید و شقی کا فرق واضح ہوتا ہے۔ شانِ تفویض و تسلیم، تمرد و سرکشی کا یہی نقطۂ امتحان ہے۔ فرقہائے باطلہ کے پھوٹنے کا یہی سرچشمہ ہے اس لئے اس پر دوبارہ پھر تفصیلی نظر ڈال لئے۔

محکم و متشابہ کی تحقیق

محکم کے دو معنی ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ خاص اصطلاح[1] میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے۔ اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہات کہا جائے گا۔ محکم کے عام معنی یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں۔ اس اصطلاح کے موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث و تمحیص کے بعد حل ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ اس بنا پر متشابہات کی دو

---

[1] یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔ (تفسیر المنار ج ۳ ص ۱۶۴)

قسمیں ہو جائیں گی (۱) حقیقی (۲) اضافی۔ متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت نے بتلائی ہو نہ اس کے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ غرض تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو دروازہ کھلا ہوا ہو وہ صرف ایک ایمان کا دروازہ ہو قرآن کریم میں ایسے متشابہ کا وجود بہت ہی نادر ہے اور اس کا مقصد بھی بجز ایمان لانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ آیت بالا میں متشابہات سے یہی معنی مراد ہیں

متشابہ اضافی قرآن کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان کردی ہے۔ مثلاً کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید لیکن بے علمی یا کج فطرتی یا ابتلاء ہوئی اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ کلام کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے۔ عام و خاص، مطلق و مقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے بلکہ صرف یکطرفہ نظر کر کے قرآن کے خلاف ایک معنی پیدا کرلیتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک شخص نے جابر جعفی سے دریافت کیا کہ ذیل کی آیت کا کیا مطلب ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْ اَبِیْ اَوْ یَحْکُمَ اللّٰہُ لِیْ وَھُوَ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ

اس نے جواب دیا کہ اس آیت کا مصداق ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ سفیان نے فرمایا کہ جھوٹ بولتا ہے۔ حمیدی کہتے ہیں کہ ہم نے سفیان سے دریافت کیا کہ اس شخص کا مطلب کیا تھا فرمایا کہ روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بادلوں میں چھپے بیٹھے ہیں جب کبھی ان کو حکم ہوگا تو اپنی اولاد کے ساتھ آسمانوں میں ظاہر ہوں گے یہ رافضی اس پر اس آیت کو چسپاں کرنا چاہتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آیت کا تمام سیاق و سباق صاف صاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں ہے۔ یہاں اس مہمل سرتاپا کذب عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا مگر اس شخص نے جب آیت کو اپنے مذہب پر ڈھالنا چاہا تو اس کو اول و آخر سے علیحدہ کرکے صرف درمیانی کا حصہ پڑھا۔ اسی طرح خوارج صرف ان الحکم الا للہ رٹ لئے اور یہ نہ دیکھا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ انسانوں کی تحکیم موجود ہے۔ جبریہ کا حال بھی یہی ہے وہ بھی صرف

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ — اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا۔

کو لئے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے عمل بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو اب ہمارا اختیار

کیا رہا۔ لیکن اُسی قرآن میں جَزَاءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (یہ بدلہ ہے اُن کاموں کا جو انہوں نے خود کئے ہیں) بھی موجود ہے۔ جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے افعال اس کے کسب و اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

غرض باطل فرقوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے وہ ایک خیال پکا لیتے ہیں پھر اس پر قرآن سے استدلال قائم کرنے کے لئے کسی آیت کی آڑ تلاش کر لیتے ہیں اور ہوی پرستی کا رنگ چڑھا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اسی قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح ان کے مدعا کے خلاف موجود ہوتی ہے۔ پس تشابہ اضافی بعض کے لحاظ سے تو متشابہ ہوتا ہے اور بعض کے لئے محکم ہوتا ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ جب خود شریعت نے مبہم کو مفصل، عام کو خاص، مطلق کو مقید کر دیا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی تشابہ نہیں رہتا اور اس لئے علماء کو بحث کا حق حاصل ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی توضیح میں ایک قاصر الفہم کے لئے دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا جس کی اس میں اہلیت نہیں تو اس کے لئے یہی کہا جائے گا کہ جس طرح تشابہات حقیقیہ کی تحقیق علماء کے لئے ممنوع تھی اسی طرح ان آیاتِ محکمات پر بحث کرنا ان کے لئے ممنوع ہے وہاں مطلقاً بحث و تحقیق زیغ کی علامت تھی۔ یہاں نا اہل اور بے علموں کی بحث زیغ کی علامت ہوگی۔[۱]

خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ کبھی فی نفسہ ہوتا ہے کبھی اپنے قصورِ علمی کی وجہ سے نظر آنے لگتا ہے حکم دونوں جگہ ایک ہے۔ تشابہ حقیقی سب کے لئے متشابہ ہے اس لئے کسی کو بحث کرنے کی اجازت نہیں اور تشابہ اضافی جس کے حق میں متشابہ ہے خاص اس کے لئے اس پر بحث کی اجازت نہیں لیکن جب اہلِ زیغ اپنی بے علمی کا ادراک نہیں کرتے یا ادراک کے باوجود محض جسارت اور اتباعِ ہوی کی وجہ سے اس وادی میں قدم رکھ دیتے ہیں تو پھر اسی جگہ سے وہ شاخیں پھوٹنے لگتی ہیں جس کو قرآن کریم میں السبل کہا گیا ہے۔ اور اختلافِ مذموم کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔[۲]

۱؎ دیکھو الموافقات ج ۳ ص ۸۶ - ۹۳۔ ۲؎ تفسیر المنار میں محکم و متشابہ کی بحث بہت مکمل موجود ہے۔ فاضل مصنف نے صرف اس مسئلہ پر ۳۳ صفحہ پر بحث کی ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

تیسری علامت | اتباع ہوی ہے۔ ہمارے پہلے مضمون میں اس پر آیات واحادیث کی روشنی میں کافی بحث گذر چکی ہے۔ ان ہر سہ علامات میں فرق یہ ہے کہ پہلی علامت یعنی اختلاف وتشتت کی شناخت ہر شخص کرسکتا ہے دوسری علامت کی شناخت صرف علماءِ راسخین کا حصہ ہے کیونکہ وہ محکمات و متشابہات کے فرق پر موقوف ہے اور اس کا علم علماء ہی کو ہوسکتا ہے۔ تیسری علامت خود انسان ہی کے فیصلہ کی بات ہے وہ خود ہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس کے باطن میں اتباع ھدی کا جذبہ ہے یا اتباع ہوی کا۔

اب اگر آپ کو فرقہائے باطلہ کی شناخت کرنی ہے تو ان علامات سے کرلیجئے مگر ان علامات کے بعد بھی دائرۂ بحث ختم نہیں ہوگا اس لئے اس بحث کو تمام کرنے کا وہی ایک راستہ ہے جو یہاں صحابہ کرام نے اختیار فرمایا تھا یعنی ان ۷۲ فرقوں کی تعیین یا ان کی علامات پر سوال وجواب کی بجائے یہ تحقیق کرلی جائے کہ فرقہ ناجیہ کونسا فرقہ ہے یہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔

فرقہ ناجیہ کی تعیین اور بقیہ فرقوں کے ابہام کی حکمت | صحابہ کرامؓ نے اس راستہ کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ یہ جانتے تھے کہ راہِ مستقیم بلا صاحب وحی کے بتلائے ہوئے قطعی طور پر دریافت ہی نہیں ہوسکتی اگر صرف ہماری عقل اس کے لئے کافی ہوسکتی تو انبیاء علیہم السلام کی حاجت ہی کیا رہتی اس لئے اس کی تعیین تو خود رسول ہی کی زبان سے ہوجانا چاہئے یہ امت کے اجتہاد پر سپرد کرنے کا مسئلہ نہیں ہے ہاں

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اگر اس کے دوسرے اطراف وجوانب کا بھی لحاظ کیا جائے تو پورے ۶۴ صفحات پر یہ مباحث پھیلے ہوئے ہیں۔ اور محکم ومتشابہ کی تفسیر میں دس اقوال پیش کرنے کے بعد یہ اختیار کیا ہے کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی مراد بالکل غیر معلوم ہو بلکہ اس کو غیر معقول قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس شے کا ہم ادراک نہیں کرسکتے وہ متشابہات کے معانی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری کیفیات ہیں مثلاً صفات الٰہیہ کی کیفیت، جنت ودوزخ اور دوسرے عالمِ غیب کی تفصیلی کیفیت، استواء علی العرش اور قیام قیامت کی کیفیت اور اس قسم کے دوسرے امور ان کے نزدیک قرآن کریم میں صرف متشابہ اضافی ہے متشابہ حقیقی کا کوئی وجود نہیں جو لوگ متشابہات پر دورِ حاضر کے اعتراضات کا جواب دینا چاہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ان کے کلام کا اصل ماخذ حافظ ابن تیمیہؒ کی سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے۔ محمد بن ابراہیم وزیر نے بھی اس جگہ مفید کلام کیا ہے۔
(دیکھو الروض الباسم ج ۲ ص ۵۲)

شاہراہِ نجات متعین ہو جانے کے بعد سبل منحرفہ کی تعیین امت کے اجتہاد کے سپرد کی جا سکتی ہے گویا عمل کے لئے میدان صاف کر دیا گیا ہے اور صرف نظری مرحلہ میں امت کے فہم و اجتہا کا امتحان لیا گیا ہے

شریعتِ محمدیہ صفتِ اعتدال میں اتنی اتم و اکمل ہے کہ دوسرے مللِ مستقیمہ ہیں گویا" الصراط المستقیم" اس کا ایک لقب بن گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جتنا توازن، جتنا اعتدال، جتنا اقتصاد اور میانہ روی اس شریعت میں ملحوظ ہے اتنا دوسری شرائع میں نہیں۔ شریعت موسویہ و عیسویہ کے افراط و تفریط کا حال معلوم ہے، گو وہ اپنے زمانہ کا توازن درست رکھنے کے لئے کتنی ہی معتدل ہوں مگر اس شریعت کے اعتدال کے بالمقابل رکھی نہیں جا سکتیں آخر وہ اصر اور اغلال (شدید احکام) کیا چیزیں تھیں جسے شریعتِ مصطفویہ نے میزانِ شریعت سے نکال کر اعتدال کی صورت پیدا کی ہے۔ اسی وصفِ ممتاز کے لحاظ سے اس امت کو امتِ وسط کہا گیا ہے اس لئے یہاں ادنیٰ ادنیٰ انحراف بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے سبل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ وَ

عَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ "قصد السبیل" یعنی میانہ راستہ طریقِ سنت ہے اور "منہا جائر" ملل و سبل متفرقہ ہیں۔ مجاہدؒ نے اس کو اور زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا ہے وہ "قصد السبیل" کی تفسیر میں فرماتے ہیں

المقتصد بين الغلو والتقصير و	یعنی میانہ روی یہ ہے کہ نہ اس میں غلو اور مبالغہ
ذلك يفيد ان الجائر هو الغالي	ہو اور نہ کوتاہی رہے اس کے بالمقابل جائر کا مفہوم
او المقصر وكلاهما من اوصاف	یہی ہوگا کہ اس میں یا تو غلو نظر آئے یا کوتاہی، یہ
البدع [1]	دونوں مللِ منحرفہ کے اوصاف ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اقتصاد اور اعتدال کتنی کٹھن منزل ہے اگر پلہ ذرا جھکتا ہے تو غلو ہو جاتا ہے اگر ذرا اٹھتا ہے تو تقصیر کا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے اعتدال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہمہ وقت شریعت پر ترازو کی طرح نگنکی بندھی رہے کہ کہیں ڈگمگاتی تو نہیں ہر بوالہوس کے یہ نصیب کہاں

این شربتِ عاشقیت خسرو — بے خون جگر چشید نتواں

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۲۷۔

کلہم فی النار
الا واحدۃ

یہاں ایک شبہ یہ بھی پیش آرہا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر جہنم میں ہو تو یہ امتِ مرحومہ کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ سوال ہی غلط ہے یہ فیصلہ ابھی قبل از وقت ہے۔ درمیانی مراحل سے گذر کر جب یہ امت جنت میں داخل ہو جائے اس وقت یہ توازن قائم کرنا چاہئے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ امت زیادہ ہے یا کم اس وقت یہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ درحقیقت یہ امت امتِ مرحومہ ہے یا نہیں [1]

نیز یہ بھی تو سوچئے کہ اس امت کی ضرب المثل وحدت، اس کی خدا ترسی، راستبازی، باہمی ہمدردی و سلوک یہ اس کے دورِ عروج کی باتیں ہیں اس کے برعکس اس کا افتراق و تشتت اس کا تفرق و کجروی یہ اس کے دورِ نزول کی داستان ہے کسی قوم کے دورِ عروج کی تاریخ اس کے دورِ زوال میں پڑھنے کی سعی کرنا بڑا ظلم ہے جن احادیث میں اس امت کی خیریت و برتری موجود ہے ان ہی میں اس کے دورِ انحطاط کا یہ افتراق مذکور ہے پھر اس میں تردد و شبہ کی کیا بات ہے۔

کلہم فی النار
کی تحقیق

یہاں ایک بڑے عالم محقق نے یہ جواب دیا ہے کہ "کلہم فی النار" دراصل ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہدیتے ہیں کہ "اسے چولہے میں ڈالو" یہاں درحقیقت دوزخی ہونا مرادی نہیں مگر ہمیں اس جواب میں تردد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے الفاظ میں "واحدۃ فی الجنۃ" صرف ایک فرقہ جنت میں ہوگا" موجود ہے۔ لفظ نار اور جنت کا تقابل یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں دیتا

ہمارے نزدیک حدیث کی راجح مراد وہ ہے جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بیان فرمائی ہے اور جس کو شاہ عبدالعزیزؒ نے جزوی اصلاح کے ساتھ اپنے فتاویٰ میں نقل فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک فرقہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا اور یہ وہ ہوگا، جس میں اعتقادی اور عملی کسی پہلو سے بھی بدعت نے راہ نہ پائی ہوگی اگر بنا بر بشریت کوئی عملی کمزوری اُن سے

[1] ترمذی میں روایت ہے کہ اہلِ جنت کی کل صفیں ایک سو بیس (۱۲۰) ہوں گی جس میں اسّی (۸۰) اس امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی۔

سرزد بھی ہوگئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اسے معاف کردے گی ورنہ قبر اور محشر کے شدائد میں کہیں اس کا حساب مجری کرلے گی۔ اس کے بالمقابل جو باطل فرقے ہیں ان کو اپنے افتراق و تشتت کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس کے بعد وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے آخر کار اس امت کا ہر فرقہ کچھ عذاب پاکر یا بلا عذاب جنت میں داخل ہوجائے گا۔ یہی مطلب ہوسکتا ہے ابن عمرؓ کی اس حدیث کا۔

ما من امۃ الا و بعضھا فی النار ہر ایک امت کے کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ
وبعضھا فی الجنۃ الا امتی میں جائیں گے صرف ایک میری امت ہے
فانھا کلھا فی الجنۃ جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔

یہ حدیث معجم اوسط اور معجم صغیر میں طبرانی نے روایت کی ہے۔ صاحب جمع الفوائد فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد ضعیف ہے تاہم اس کی مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کی ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت کے لئے مدار نجات صرف کلمۂ توحید ہے اور معصیت موجب عذاب نہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے مرجئہ کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کو بچشم خود دوزخ میں دیکھا پھر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ تمام امت بلا عذاب جنت میں داخل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ظاہر یہی ہے کہ اس فرقہ سے وہی فرقہ مراد ہے جس نے سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے۔ بدعت سے وہ ہمیشہ دور اور نفور رہا ہے، اس کے اعتقاد و عمل کے دونوں بازو درست ہیں یہی فرقہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا اور لفظ "ما انا علیہ واصحابی" بھی زیادہ اسی پر چسپاں ہوتا ہے۔

(آئندہ مضمون میں اس کی تحقیق کی جائیگی)

(باقی آئندہ)

اسبابِ کفر و جحود

(جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئے)

پہلا سبب۔ تقلیدِ آباؤ اکابر وغیرہ

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

خداوندِ کریم کی تمام مخلوقات میں انسان خاص طور سے مکلف اور اپنے سیاہ وسفید کے لئے ذمہ وار ہے۔ اس ذمہ واری کے بنیادی وجوہ کی تلاش ہمیں خود انسان کے اندر کرنی چاہئے، نہ کہ انسان کے باہر۔ قرآنی حقائق کی بنا پر جہاں تک میں انھیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ بات بےخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ بنی آدم کے عقائد واعمال پر سزا وجزا کے مرتب ہونے کی اصلی وجہ چند وہ چیزیں ہیں جو خود آدمی کے اندر موجود ہیں اور جن سے وہ ہر وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بیرونی تعلیمات جن میں انبیاء علیہم السلام اور مصلحین وغیرہم کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ انسانی ذمہ واری کے وجوہ میں دوسرے درجے پر آتی ہیں۔

علم | اللہ تعالیٰ کی بعض ایسی خاص نعمتوں میں جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان کو ممتاز اور مختص گردانا گیا ہے۔ ایک نعمت علم کی دولت ہے۔ جس کے ذریعے آدمی کو حقائقِ اشیا کے معلوم کرنے کی استعداد حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت شناسی کی بے انتہا وسعتیں اور غیر محدود امکانات بنی نوعِ انسان کے سامنے موجود ہیں۔ اقوامِ عالم کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ انسان بتدریج علم میں ترقی کرتا چلا آیا ہے اور چلا جائے گا۔ اس ترقی کے ممکنات یقیناً غیر متناہی ہیں یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی اس استعداد سے کہاں تک فائدہ اٹھاتا رہا ہے یا آئندہ اٹھائے گا۔

بولی جائیں گی۔ اس بیان کی صحت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت آدمؑ نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی زبان بولی تھی تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آدمؑ کی فطرت اور سرشت میں اللہ تعالیٰ نے یقیناً یہ استعداد رکھدی تھی کہ آگے چل کر اس کی اولاد لغاتِ مختلفہ میں گفتگو کرسکے۔

تفسیر فتح البیان میں بھی لفظ اسماء کے معنوں کے متعلق مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اسماء سے مراد اسماءِ ملائکہ اور اسماء ذریت آدم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات اور جمادات وغیرہ پیدا کرکے آدمؑ کو دکھائے اور اسے ان کے نام بتائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسماء سے مراد ہر ایک شے کی صنعت ہے۔ بعض کے نزدیک اسماء سے مراد اسماءِ الٰہیہ ہیں۔ تفسیروں میں اس قسم کے اور کئی قول بھی درج ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ایک حد تک یہ تمام قول صحیح ہیں۔ البتہ یہ غلط ہے کہ اسماء کے معنوں کو کسی ایک خاص چیز پر موقوف کردیا جائے۔ بات یہ ہے کہ خداوند کریم نے آدمؑ کو پیدا کرکے اُسے دولتِ علم سے سرفراز فرمایا۔ کچھ علم اسے فی الحال عطا کردیا اور باقی علوم کے حاصل کرنے کی بے انتہا استعداد اسے بخش دی۔ گویا علوم وفنون کے بےشمار معمور خزانوں کی کنجیاں اس کے حوالے کردیں۔ تاکہ حسبِ ضرورت اور حسبِ سعی وہ ان سے مستفیض ہوسکے۔

کلّہا کا لفظ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے سامنے حصولِ علم وفن کی غیر محدود اور بے نہایت وسعتیں کھول کر رکھدی ہیں۔ نوعِ انسانی آج تک اس میدان میں جتنی ترقی کرچکی ہے وہ اس قلزمِ امکانات کا ایک قطرہ بھی نہیں جو ابھی تک پردۂ غیب میں مستور ہے۔ تاحال تو ہم صرف بسم اللہ تک ہی پہنچے ہیں ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پس جب خدا نے انسان کے اندر حصولِ علم کی استعداد رکھ دی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس استعداد سے فائدہ اٹھاکر روزانہ اپنے علم میں ترقی کرے اور پھر علم کے ذریعہ خدا کو پہچانے، یہ بات تو ظاہر ہے کہ علم خدا شناسی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ بقولِ سعدیؔ

بے علم چوں شمع باید گداخت — کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

خود قرآن مجید کے چند در چند مقامات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کے ذریعے خدا شناسی، خدا ترسی، عقائد کی درستی اور اعمال کی اصلاح حاصل ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ صاحب علم ہونے کی وجہ سے انسان اپنے اعمال و عقائد کے لئے خدا کے سامنے ذمہ دار ہے۔ خواہ اس تک کوئی بیرونی تذکیر و تعلیم پہنچے یا نہ پہنچے۔

عقل | علم کی دولت کے ساتھ ساتھ دوسری نعمت جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو عطا کی وہ عقل کی دولت ہے جس کے ذریعے آدمی سوچتا سمجھتا اور نیک و بد میں تمیز کرتا ہے۔ اس داد میں بھی انسان کو ایک حد تک باقی تمام مخلوقات پر فضیلت اور امتیاز حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی باقی مخلوق کو بھی اس کے فرائض اور اس کی ضروریات اور حیثیت کے مطابق عقل عطا کی ہے۔ لیکن اس بات میں بھی شک کرنے کی کوئی گنجایش نہیں۔ کہ باقی تمام مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو اس بارے میں بھی خاص فضیلت حاصل ہے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔	قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ اور قسم ہے چاند کی جب اس کے پیچھے آوے۔ اور قسم ہے دن کی جب ظاہر کرے اس کو۔ اور رات کی جب ڈھانک لے اس کو۔ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے پیدا کیا اس کو۔ اور قسم ہے زمین کی اور جس نے بچھایا اس کو۔ اور قسم ہے جان کی اور جس نے تندرست کیا اس کو۔ پس اس کے جی میں ڈالی اس کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے پاک کیا اس کو، اور نامراد ہوا جس نے گاڑ دیا اس کو۔

ان چھوٹی چھوٹی دس آیتوں میں علم وحکمت کے عظیم الشان خزانے مدفون ہیں۔ زیادہ کاوش کے بغیر جو کچھ سطح پر نظر آرہا ہے وہ تین باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے صحیفۂ کائنات کی ان آیاتِ بینات کا ذکر کیا ہے جو ہر وقت ہر ایک انسان کے سامنے ہیں۔ اور جو اس کے لئے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے یقینی نشانیوں کا کام دیتی ہیں۔ دوسری یہ کہ خدا نے آدمی کے اندر ایک ایسی طاقت رکھدی ہے جس کے ذریعے وہ سیاہ و سفید میں، نیک و بد میں اور سیدھے اور ٹیڑھے رستے میں تمیز کر سکتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان کے سامنے دونوں راستے کھلے ہیں۔ صحیح راستہ بھی اور غلط راستہ بھی۔ اب یہ اس کا اپنا کام ہے کہ وہ ایک راستے پر چلے یا دوسرے پر۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں انہی چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو اس کا عرفان حاصل کرنے کے لئے کھلی نشانیوں کا کام دیتی ہیں۔ ان قسموں کا مدعا اور منشا عموماً یہی ہوتا ہے کہ بنی آدم کو ان چیزوں کی اہمیت اور افادیت کی طرف توجہ دلائی جائے اور ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے اور غافل رہنے کی ہلاکت آفریں مضرتوں پر تنبیہ کی جائے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ پہلے سورج کی قسم کھاتا ہے۔ گویا اپنے بندوں کو یاد دلاتا ہے کہ سورج کو دیکھو اور سوچو اور سمجھو کہ یہ کہاں سے آیا۔ اسے کس نے بنایا۔ یہ اپنے کام پر دن اور رات کس مستعدی سے مصروف ہے۔ اس کی دھوپ اور اس کی روشنی پر غور کرو کہ یہ چیزیں جمادات، نباتات اور حیوانات کی ہستی اور وجود پر اور ان کے نشو و نما پر کس درجہ اثر انداز ہیں اور یہ چیزیں مخلوقات کے لئے کتنے مہتم بالشان فوائد پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد چاند کا ذکر ہے کہ اس کے وجود اس کے افعال اور اس کے خواص پر غور کرو۔ اس کے انضباطِ اوقات کو دیکھو اور سوچو کہ وہ حکم کا بندہ کس طرح اپنے کام میں لگا ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں سالوں میں کبھی ایک دفعہ بھی اپنے کام میں ایک لمحہ کے ہزارویں حصے تک بھی تقدیم و تاخیر نہیں کی۔ اسی طرح پھر دن اور رات کا ذکر کیا ہے۔ اور زمین و آسمان کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ اور ہر روز اور ہر وقت آدمی کے سامنے ہوتی ہیں اور ہر لحظہ اس کے لئے درسِ عبرت کا کام دیتی ہیں۔

سب سے پیچھے انسان کو خود نفسِ انسانی کی یاد دلائی کیونکہ آدمی جہاں صحیفۂ عالم کی

مذکورہ بالا آیات سے عموماً غافل رہتا ہے وہاں خود اپنے آپ سے بھی جو ان آیات میں غالباً سب سے بڑی نشانی ہے اکثر غافل رہتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یعنی جس آدمی نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔" لیکن انسان ہے کہ اتنا اور کسی چیز سے غافل نہیں جتنا خود اپنے آپ سے غافل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں نفسِ انسانی کی قسم کھائی ہے گویا غافل انسان کو کہا ہے کہ دور مت جاؤ۔ آنکھیں بند کرکے خود اپنے اندر دیکھو کہ کتنی بڑی کائنات، کتنا بڑا عالم اور کتنا عظیم نظام خود تمہارے اندر موجود ہے۔ خود تمہارے نفس کی آیات کتنی روشن اور کتنی واضح ہیں۔ انہی میں تدبر کرو اور اپنے بنانے والے کی معرفت حاصل کرو۔

ان بیرونی اور اندرونی نشانیوں کے ذکر کے بعد کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو بنایا اور اس کے جسمانی اعضا اور ذہنی قویٰ کو صحت بخشی۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علم التشریح کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے کہ خداوند کریم نے آدمی کو جسمانی لحاظ سے اعضا کی کتنی مکمل تعدیل و تسویت عطا کی ہے اور علم النفس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ذہنی لحاظ سے انسانی قویٰ کی تسویت کس درجہ بے مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظاہری اور باطنی حواس کی بہت سی قوتیں مثلاً قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ اور قوتِ متخیلہ اور مفکرہ اور مذکرہ وغیرہ وغیرہ عطا کیں۔ جن کے ذریعے آدمی اپنے علم کو ترقی دے سکتا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ آدمی کو اعضا و قویٰ کی تسویت عطا کرنے کے بعد خداوند کریم نے آدمی کے دل میں بذریعہ الہام نیک و بد میں تمیز کرنے کی قوت القا کی۔ یہی قوت افہام و اعقال کی قوت ہے۔ یعنی عقل و فہم کی وہ طاقت جس کے ذریعے آدمی فجور و تقویٰ میں۔ نیک و بد میں۔ سیاہ و سفید میں اور گناہ و صواب میں تمیز کر سکتا ہے۔

پس عقل و فہم کی یہ قوت جو خدا نے انسان کے دل میں ڈالی ہے۔ دوسری اندرونی وجہ ہے آدمی کی ذمہ واری کی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا۔ کہ اب انسان چاہے تو اپنے نفس کا تزکیہ کر لے اور بامراد ہو۔ اور چاہے تو نفس کو گناہوں کی تاریکیوں میں گاڑ دے اور نامراد ہو۔

اختیار | انسانی ذمہ واری کی تیسری اندرونی بنا اس کا با اختیار ہونا ہے۔ یعنی اس کی طاقت میں ہے کہ وہ ایک راستہ اختیار کرے یا دوسرا۔ اس باب میں بھی انسان کو باقی مخلوق پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	تحقیق ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں کے
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ	سامنے اور زمین کے سامنے اور پہاڑوں کے
یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ	سامنے۔ پس انکار کیا سب نے اس کے اٹھانے
حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اِنَّهٗ كَانَ	سے۔ اور ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	انسان نے تحقیق وہ بے باک تھا اور نادان۔

یہ امانت جس کے اٹھانے سے زمین نے، آسمانوں نے اور پہاڑوں نے غرضکہ تمام مخلوقات نے انکار کردیا اور بے باک نادان انسان نے اٹھا لیا۔ کیا چیز ہے؟ اس کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ لیکن کثرتِ رائے اسی کے حق میں ہے کہ یہ امانت "اپنے عقائد و اعمال میں مختار ہونا ہے" جو اس کے مکلف ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ یہی وجہ تکلیف ہے جس سے باقی تمام مخلوقات ڈر گئی۔ لیکن آدمی نے اُسے قبول کرلیا۔ بظاہر تمام جانداروں میں تھوڑا بہت اختیار پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ نہ کچھ علم اور عقل بھی سب جانداروں میں موجود ہے۔ لیکن علم اور عقل کی طرح اختیار کے بارے میں بھی انسان کی حیثیت باقی تمام چیزوں سے ممتاز ہے۔

لاریب تمام حیوان ایک حد تک علم، عقل اور اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ چیزیں اتنے تنگ دائرے میں محدود ہیں کہ وہ وجہ تکلیف نہیں بن سکتیں۔ حیوانات میں یہ چیزیں صرف اتنی ہی مقدار میں پائی جاتی ہیں جتنی ان کے مقررہ اور روزمرہ کے اعمال و وظائف کی تعمیل و تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ برخلاف اس کے آدمی کے علم و عقل و اختیار کے امکانات غیر محدود و لا متناہی ہیں۔ موالیدِ ثلاثہ کے باقی دو فرد یعنی نباتات اور جمادات یا تو جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے قطعاً اور کلی طور سے علم و عقل و اختیار کی نعمتوں سے محروم ہیں، یا اُن میں اِن چیزوں کا کوئی وجود ہے تو قریب

قریب صفر کے برابر یعنی نہایت ہی تھوڑا جو نہ معلوم ہو سکے نہ محسوس نہ متصور۔ ان چیزوں کے درمیان اور ان کے خالق کے درمیان اگر کوئی نامہ و پیام سوال و جواب اور ایجاب و قبول ہوتا ہے تو وہ ہماری چشمِ بصارت و بصیرت سے تاحال پوشیدہ ہے۔

سورج دن رات اپنے کام میں مصروف ہے۔ چاند ستارے اور سیارے ہر وقت اپنے اپنے وظائف میں کوشاں و سرگرداں ہیں۔ زمین اپنی گردش میں پڑی ہوئی ہے۔ ہوا اور پانی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں میں دن رات سونا بن رہا ہے، چاندی بن رہی ہے، لعل، زمرد، یاقوت اور ہیرے بن رہے ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح خدا کے حکم سے ان کے لئے مقرر کیا گیا۔ انسان حکم عدولی کر سکتا ہے، یہ چیزیں نہیں کر سکتیں۔ انسان اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت کر سکتا ہے یہ چیزیں نہیں کر سکتیں۔ انسان کے سامنے کئی راستے کھلے ہوئے ہیں جس راستے پر چاہے چل سکتا ہے۔ ان چیزوں کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ باقی تمام راہیں ان کے لئے مسدود ہیں۔ انسان اپنے اعمال و افعال میں عجلت اور تاتی۔ تقدیم اور تاخیر کر سکتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ ان چیزوں کی فطرت۔ جبلت اور سرشت ہی ایسی ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض کی تعمیل میں مجبورِ مطلق ہیں۔ برخلاف اس کے انسان اپنے کاموں میں مختار ہے اور ایک معقول حد تک مختارِ کامل۔

فرشتوں کو ہی لیجئے جو بعض لحاظ سے انسان پر فضیلت رکھتے ہیں۔ لیکن فرشتے بھی اپنے وظائف اور فرائض کی تعمیل میں مجبور ہیں۔ وہ ہر وقت خدا کی حمد میں اور تسبیح و تقدیس میں مصروف ہیں۔ جو کام اُن کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ان کی تعمیل کرتے ہیں لیکن وہ اپنے کام میں نہ سستی کر سکتے نہ غفلت۔ نہ وہ خدا کے کسی حکم کو ٹال سکتے ہیں نہ کسی حکم کے برخلاف کچھ کر سکتے ہیں ان کی مجبوری بھی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی غیر ذی روح چیزوں کی۔

لیکن یہی اختیار ہے جو انسان کے مکلف ہونے کی سب سے بڑی بنا ہے۔ یہی اختیار ہے جو اس کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے اسے قبول کر لینے کی جرأت کی۔ یہی اختیار وہ بارِ امانت ہے جس کے

اٹھانے سے باقی تمام مخلوق ڈر گئی لیکن انسان نے اٹھا لیا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند (حافظ)

فی الواقعہ انسان نے بڑی جرأت کی۔ اسی جرأت کی وجہ سے اس نے ظلوم وجہول کا لقب پایا۔ اور اسی جرأت کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ انسان کا یوں ظالم وجاہل کہلانا فی الواقعہ مقامِ مدح میں ہے، مقامِ ذم میں نہیں۔ آپ کا نوکر یا غلام یا بیٹا یا کوئی جانی دوست آپ کے کسی حکم کی تعمیل میں یا آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اگر اپنی جان کو کسی خطرے میں ڈال کر کوئی عظیم الشان کام کر گزرے تو آپ بھی اسے کہیں گے کہ اے ظالم اے جاہل تو نے یہ کیا کیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس ظلم پر ہزاروں انصاف اور اس جہل پر لاکھوں علم قربان کئے جاسکتے ہیں۔

یہی تین اندرونی چیزیں یعنی علم۔ عقل اور اختیار۔ بنی آدم کی ذمہ واری کے بنیادی وجوہ ہیں۔ چنانچہ علم جتنا کم ہوتا جائے گا ذمہ داری بھی اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ اور مطلق جاہل آدمی کی ذمہ واری قریب قریب جانوروں کی ذمہ واری کے برابر رہ جائے گی۔ اسی طرح عقل کی کمی سے ذمہ واری کم ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی آدمی عقل سے مطلق بے بہرہ ہو یا کسی عارضے کی وجہ سے عقل سے محروم ہوجائے تو وہ قطعی طور سے مرفوع القلم ہوجاتا ہے۔

یہی حال اختیار کا ہے۔ جتنا اختیار زیادہ اتنی ہی ذمہ واری زیادہ۔ جتنا اختیار کم اتنی ہی ذمہ داری کم۔ اور اضطرار کی حالت میں اگر آدمی کا اختیار بالکل سلب ہوجائے تو مجبورِ مطلق آدمی اپنے کسی قول یا فعل کے لئے جوابدہ نہیں رہتا۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا کیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ حقایقِ اشیاء کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی اُسے عقل کی دولت بخشی ہے جس سے وہ فجور و تقویٰ میں، نیک و بد میں، گناہ و ثواب میں اور شرک و توحید میں تمیز کرسکتا ہے۔ اور اس پر اُسے اختیار بھی دیا ہے کہ جو راہ وہ چاہے اس پر گامزن ہو اور جب اِن اندرونی روشنیوں کے علاوہ اس کے پاس بیرونی

تعلیمات بھی پہنچتی رہی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام آتے، آسمانی کتابیں آئیں، وقتاً فوقتاً مصلحین اور مجددین آتے رہے، ہر زمانے میں ہر قوم میں اور ہر ملک میں استاد و پیر، مرشد اور ناصح، شمعِ ہدایت کا کام کرتے رہے۔ پھر وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان سیدھے راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پر چلتا ہے، اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرتا ہے، توحید کو چھوڑ کر شرک کرتا ہے، نیک کاموں کو چھوڑ کر بُرے کاموں کا ارتکاب کرتا ہے اور بعض دفعہ خدا کی ہستی سے بھی انکار کر دیتا ہے۔

اس سوال کا جواب قرآن مجید نے دیا ہے۔ ایک جامع اور مانع جواب، ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب۔ چنانچہ کفر و جحود کے اسباب جو کلام اللہ میں بیان ہوئے یہ ہیں:-

(۱) تقلیدِ آباؤ اکابر وغیرہ

(۲) اعراض

(۳) استکبار و استہزاء

اس مضمون میں صرف سبب اول یعنی تقلید کا ذکر مقصود ہے۔ اس سلسلے میں پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشادِ گرامی سنیئے:-

وعن ابی هريرة قال قال	ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ
رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی
ما من مولود الا يولد على الفطرة	ایسا بچہ نہیں جو فطرت پر پیدا نہ کیا جائے پس
فابواه يهودانه وينصرانه	اس کے ماں باپ اُسے یہودی بنا دیتے ہیں
او يمجسانه كما تنتج البهيمة	یا نصرانی یا مجوسی۔ جیسا کہ چارپایہ سالم
بهيمة جمعاء هل تحسون فيها	چارپایہ بچہ دیتا ہے۔ کیا تم اس میں کچھ نقصان
من جدعاء ثم يقول فطرة	معلوم کرتے ہو۔ پھر آپ نے پڑھی یہ آیت کہ
اللهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا	لازم پکڑو خدا کی پیدائش کو جس پر اس نے
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ	لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی پیدائش کو بدلنا (جائز)

الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ۔[1] (متفق علیہ)　　نہیں۔ یہی ہے صحیح مذہب۔

اس حدیث شریف سے چند در چند باتیں نکلتی ہیں۔

(۱) ہر ایک بچہ جو کسی قوم میں کسی ملک میں یا کسی مذہب کے پیرو خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی صحیح مومن اور صحیح مسلم پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک بچہ علم اور عقل اور اختیار کی اس استعداد کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی سرشت میں رکھدی ہے ایسی حالت اور ہیئت میں پیدا ہوتا ہے جو اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے تیار کرتی ہے اور جو اُسے خالق کی معرفت حاصل کرنے، دین کو قبول کرنے پر، دینِ اسلام اختیار کرنے پر اور نیک و بد میں تمیز کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ بشرطیکہ بیرونی عوارض اور موانع اس کو نظرِ صحیح اور فکرِ درست سے روک نہ دیں۔

(۲) اس اندرونی استعداد کی نشو و نما کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تقلیدِ آباء ہے چنانچہ فرمایا کہ پھر اس بچے کے ماں باپ اس کو غلط راستے پر ڈال کر اسے یہودی بنا دیتے ہیں، یا نصرانی یا مجوسی۔ گو اس تقلید میں جہاں ایک طرف بچے کی متابعت اور مطاوعت کارفرما ہوتی ہے وہاں دوسری طرف سے والدین کا جبر و قہر بھی شامل ہوتا ہے۔ تاہم آدمی اپنی فطری ذمہ واریوں سے کسی صورت میں سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کی اندرونی استعداد یں ہر وقت اور ہر حالت میں اسے صحیح راستے پر چلنے میں شمعِ راہ کا کام دیتی رہتی ہیں، یہ شمع کبھی بجھتی نہیں۔

(۳) آگے چل کر اس باطنی حقیقت کی توضیح ایک ظاہری مثال سے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جانور کا بچہ صحیح سالم پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ نقص نہیں ہوتا۔ اس کے کان، ناک، سینگھ، ہونٹ، ٹانگیں اور دُم، غرضیکہ سب اعضاء سالم ہوتے ہیں مگر بعد میں کسی کا کان کاٹ دیا جاتا ہے، اور کسی کی دُم۔ اگر اس طرح کی کوئی خارجی آفت اس کے حال کی معترض نہ ہوتی تو وہ ہمیشہ سالم رہتا۔

(۴) اصل دینِ قیم وہی ہے جو آدمی کی سرشت میں رکھدیا گیا ہے۔ پس آدمی کی فطرت میں

---

[1] مشکوۃ باب الایمان بالقدر۔ فصل اول۔

رکھی ہوئی ان استعدادوں میں تبدیلی پیدا کرنے کی تمام کوششیں غیر مستحسن ہوتی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے قوانین کے مطابق ان استعدادوں کے نشوونما پانے میں ان کی امداد کی جائے۔

قرآنِ کریم میں جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ آباؤ اکابر کی کورانہ تقلید نوعِ انسانی کے لئے نسلاً بعد نسلٍ گمراہی کا موجب بنتی رہی ہے۔ آفرینشِ آدم سے لے کر آج تک کی تاریخِ عالم اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک میں انسان کی علمی، روحانی، مذہبی اخلاقی اور مادی ترقی کی راہ میں یہی ذہنی غلامی جسے تقلید کہتے ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

ترجمان القرآن

جلد دوم

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عدیم المثال تفسیرِ قرآن ہے جسے عہدِ حاضر کی سب سے بہتر تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ یہ جلد اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی جلد سے بھی زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہے۔ اس کے حواشی نہایت مفصل، دلپذیر و دلکش اور بہت سے اہم اجتماعی اور اقتصادی مسائل پر مشتمل ہیں، سورہ انفال توبہ، یوسف، کہف، مریم وغیرہ کی تفسیر اسی حصہ میں ہے اس لئے کتاب علمی اور تاریخی خصوصیات کے اعتبار سے بھی بے مثل ہو گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام ایسے باکمال عالم کی ۳۰ سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے، سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک۔ ہدیہ بلا جلد آٹھ روپے آٹھ آنے مجلد خوش نما عہ/۹

منیجر مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

تہذیب وتمدنِ آشور

از جناب لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی ایم ایس

گذشتہ سال برہان میں ہمارا ایک مقالہ بعنوان "تاریخ کے دورِ آغاز میں آرین قومیں" شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں ہم نے کچھ اقوام کا ذکر کیا تھا۔ اس دفعہ انھیں اقوام میں سے ایک کا جو آشوری قوم" (Assyrians) کے نام سے منسوب ہے، ذکر تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قوم اپنی تہذیب اور تاریخ کے لحاظ سے بہت مشہور ہے اور اس کے متعلق بہت سے اہم تاریخی پہلو سامنے آئے ہیں جن کا تعلق قصص القرآن سے بھی بڑی حد تک ہے۔

آشور کی مملکت کی تاریخ تقریباً ۳۰۰۰ (تین ہزار) قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ہلالِ خصیب کے شمال میں دریائے ذاب خورد (Lesser zab) کے دہانے تک محدود تھا اس مملکت کا جنوبی حصہ ذاب بزرگ (Greater Zab.) اور ذابِ خورد کے دہانوں سے لیکر دریائے دجلہ تک پہنچ جاتا تھا۔ زیادہ تر اس علاقے کا شمالی حصہ پہاڑی ہے اور کچھ سطح مرتفع ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں اکثر وادیاں بھی موجود ہیں جو نہایت زرخیز ہیں، اور کاشتکاری کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ دریاؤں کے کنارے تو خاص طور پر نہایت زرخیز ہیں۔ اس علاقے کی اہمیت اس سے بھی دوبالا ہو جاتی ہے کہ تمام مشہور شاہراہیں جو ایران، کردستان اور عراق کو ملاتی ہیں یہاں ہی سے ہو کر گذرتی ہیں۔ ترکستان اور لبنان سے بھی ان شاہراہوں کا تعلق ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں ایک وسیع میدان ہے جو ایک طرف توکرکوک تک پہنچتا ہے اور دوسری جانب موصل تک چلا گیا ہے۔ اسی میدان کے وسط میں اربیل واقع ہے۔ اربیل سے موصل کی طرف جو میدان ہے یہ وہی مشہور میدان ہے جہاں سکندرِ اعظم اور دارا کے مابین جنگ ہوئی اور اسی جنگ کو جنگِ اربیلا

کہا جاتا ہے (نقشے کے لئے ہمارا مقالہ ملکِ طاؤس جو گذشتہ سال برہان میں شائع ہوا تھا، ملاحظہ ہو)۔

ان دریاؤں میں ماہِ اپریل سے طغیانیاں آنا شروع ہوتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں تمام شمالی سلسلۂ کوہستان برف پوش ہوجاتا ہے اور اپریل سے یہ برف پگھلنا شروع ہوجاتا ہے۔ ان طغیانیوں کی وجہ سے یہ علاقہ اور بھی زرخیز ہے۔ یہ دریا کردستان کے پہاڑوں سے نکل کر آتے ہیں یہ وہی کوہستانی علاقہ ہے جہاں سے گذر کر اول اول آرین گروہ ہلال خصیب میں پھیل گئے ہیں۔ اور کچھ گروہ آشور میں آباد ہوگئے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب ممالک پر کوئی قوم دھاوا بولتی ہے تو وہ اکثر پہاڑی علاقوں میں سے اترتی ہے، پہاڑی علاقوں کے باشندے اکثر جفاکش اور بہادر ہوتے ہیں۔

اول اول جب آرین اقوام کا یہاں ورود ہوا تو ہمیں یہاں کی آبادی کچھ ملی جلی نظر پڑتی ہے (Paloelithic Age) کے آثار بھی اس علاقہ میں ملتے ہیں۔ ڈیرہ زور کے علاقے Dair-az-Zor. میں تو بہت سے قدیم ہتھیار بھی دستیاب ہوچکے ہیں۔ نہ صرف یہاں، بلکہ نینوا (Ninerah) اور آشور (Ashur) جسے آج کل قلعہ شرکت کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی متعدد پرانی آبادیوں کے آثار ملے ہیں۔

اس علاقے سے حاصل شدہ اشیاء کی مشابہت اُر (Ur) سے برآمد شدہ چیزوں سے بھی بہت ہے اور چونکہ اُر (Ur) سے جو ہتھیار اور برتن ملے ہیں ان کے وقت کا تعین ۲۹۰۰ قبل مسیح کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ آشور کی تہذیب اس زمانے سے ملتی جلتی ہے جبکہ انسان نے اول دفعہ مٹی کے مصور برتن (Painted Pottery.) ایجاد کئے تھے ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس زمانے کی تاریخ ۳۵۰۰ قبل مسیح قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد انسان نے دھاتوں کا استعمال ایجاد کیا تو مٹی کے برتنوں کی صنعت (Pottery.) معدوم ہونا شروع ہوگئی۔ اسی لئے ۳۰۰۰ قبل مسیح سے پیشتر ہمیں آشور میں کوئی تہذیب کے نشانات نہیں ملتے۔ زیادہ تر جو ثبوت بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے وقت ۲۷۰۰-۳۰۰۰ قبل مسیح تک کا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وقفہ محض اس لئے پیدا ہوگیا ہے کہ ماہرین ان علاقوں میں مکمل طور پر کھدائی نہیں کرسکے۔ ابھی بہت سے قدیم مقامات یہاں دبے

پڑے ہیں۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جب سنحرب (Sennacherib.) نے دوبارہ نینوا کو تعمیر کیا تو اس نے اس کی بنیاد پر ایک بہت وسیع چبوترا بنوایا۔ ممکن ہے پرانی تہذیب اس کے نیچے ابھی پوشیدہ ہو کیونکہ اس چبوترے کو ابھی مکمل طور پر صاف نہیں کیا گیا۔ دوسرے اس علاقے میں ابھی بہت سے ٹیلے (Mounds.) موجود ہیں جہاں کھدائی شروع نہیں ہوئی۔ جنگ عظیم سے پیشتر اور اس کے دوران میں ترکی حکومت نے یہاں کھدائی ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور اس کے بعد تھوڑا بہت جو کام ہوا ہے وہ ابھی تک نامکمل ہے۔

اسی صدی میں جن ماہرین نے یہاں کام کیا ہے ان میں سے سب سے مشہور بوتا (Bota) ایک فرانسیسی آرکیولوجسٹ (Archeologist.) تھا۔ سڈنی سمتھ (Sydney Smith) مسٹر کنگ (L.W. King.) اور مسٹر راسم (Rassam.) تھے۔ گذشتہ صدی کے ماہرین جنھوں نے اس تحقیق کی بنیاد رکھی ان میں سب سے مشہور لے یارڈ (Layard) رالنسن (Rawlinson) اور ڈاکٹر ہنکس (Hincks.) تھے۔ یہ تمام ماہرین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا اس علاقے میں باقی رہ گیا ہے۔

ان ماہرین آثریات (Assyriologists.) کی راہ میں جو دقتیں پیش آئیں اس کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہوسکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بوتا (Bota.) نے کھدائی شروع کی تو اس کو اجازت لینے میں بہت دقت پیش آئی، ترکی حکومت کسی شرط پر بھی رضامند نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ ٹیلہ تھا جس پر آج کل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے یہ ٹیلہ موصل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور قدیم نینوا (Ninevah) کا ہی ایک حصہ ہے۔ اب تو اس ٹیلہ پر ایک قصبہ بھی قائم ہوچکا ہے بوتا (Bota) نے ایک اچھوتی چال چلی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اس نے اس ٹیلے پر چند ایک مکانات خرید کئے اور ان کے اندر سے اس نے کھدائی کا عمل خفیہ طور پر شروع کردیا۔ وہ اپنے اس فعل میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ کھدائی کے دوران میں اس کو دو سرنگیں ملیں جو محلات کی طرف پہنچتی تھیں یہ محلات سنحرب (Sennacherib.) کے تعمیر شدہ تھے۔ اسے ان سرنگوں میں

چند ایک بہت اہم کتبے اور بت بھی ملے۔ مگر کسی نے یہ راز فاش کر دیا۔

جب ترکی حکومت کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو بوتا کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا، ہماری دانست میں یہ جو رکاوٹ اسے پیش آئی اس کی وجہ محض مذہبی تعصب تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ شخص خفیہ طور پر حضرت یونس علیہ السلام کے مزار تک پہنچنا چاہتا ہے اور شاید وہاں اسے کسی خزانے کے ملنے کا امکان نظر آتا ہے۔ اس روز سے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ دوبارہ اس کام کو شروع کر سکے۔ ہمارا خیال ہے یہ ٹیلہ جس پر آجکل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار ہے سنحریب (Sennacherib) کے زمانے میں اس کے محل کا ایک حصہ تھا۔

آشور (Ashur) یعنی قلعہ شرکت جو مملکت آشور کا دارالخلافہ تھا یہاں بھی ایک کثیر رقم کھدائی میں صرف کی گئی مگر حسب توقع اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ آشور کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ دارالخلافہ اول اول ۲۶۵۰ - ۲۷۵۰ قبل مسیح کے درمیان بنا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ عراق کا محکمہ آثار قدیمہ عنقریب اس مقام پر از سرِ نو کام شروع کر دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ پھر اس علاقے کی قدیم داستان مکمل ہو جائے۔

اس علاقے کے متعلق جس قدر بھی روایات مشہور ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر روایتوں کی تصدیق نہیں ہوئی، تاہم یہ سب نہایت دلچسپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی تہذیب طوفانِ نوحؑ سے بھی قدیم تر ہے۔ چند ایک بادشاہوں کے نام خطِ میخی سے بھی حل ہو چکے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بھی پہلے کے تھے۔ ایک مورخ نے تو دس بادشاہوں کے نام لئے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے پیشتر مملکتِ آشور پر حکمراں تھے۔ یہ مورخ ایک کلدانی ہے اور سنحریب (Sennacherib) کے زمانے میں تھا۔ ممکن ہے یہ کلدانی انہی لوگوں میں سے ہو جن کو پکڑ کر سنحریب بابل سے لایا تھا۔ اس علاقے میں آجکل بھی کلدانیوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ اس کلدانی مورخ نے محض وہ قصے دوہرائے ہیں جو خود اس کے زمانے سے دو ہزار سال پیشتر کے واقعات تھے۔ ان قصوں کا ذکر سڈنی سمتھ (Sydney Smith) اپنی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف اسیریا (History of Assyria.) میں کرتا ہے۔

بہرکیف ماہرین آثارِ قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آشور کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے جس کا وقت ۳۰۰۰ قبل مسیح سے بھی بہت پہلے پہنچتا ہے یہانتک کہ اُر (Ur) کی تہذیب سے بھی بہت پہلے کی ہے

طوفانِ نوح کا قصہ سومیری کتبات سے بھی ثابت ہوتا ہے اس واقعہ کو وہاں گلگمیش (Gilgamesh) کی روایت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی سب سے پرانی روایت طوفان نوح کے متعلق معلوم ہوئی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسوقت سے بہت سے مقاموں کو اس واقعہ کے ساتھ منسوب کردیا گیا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان علاقوں کا جو طوفانِ نوح کے واقعہ کے ساتھ وابستہ ہیں، تھوڑا بہت ذکر کردیا جائے۔

ملک طاؤس والے مقالے میں ہم نے تین مقاموں کا ذکر کیا تھا، کوہ سفینہ، عین سفنی اور جبلِ سنجار۔ ان علاقوں کے ساتھ مندرجہ ذیل قصے منسوب ہیں:-

کوہ سفینہ، اربیل کے شمال کی طرف تقریباً ۱۰ میل مقام شقلاوہ کے قریب واقع ہے اس کو کوہِ سفینہ (یعنی کشتی والا پہاڑ) اس لئے کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پانی پر تیرتی ہوئی آنکلی تو اس پہاڑ کے پاس آکر رک گئی اور یہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سے اتارا۔

دوسرا مقام عین سفنی ہے اور یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۲۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں سے راستہ شیخ عدی اور بادیان (Bavian) کو جاتا ہے۔ یہاں ایک چشمہ اب بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ یہ روایت وابستہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب طوفان کی خبر دی گئی اور کشتی بنانے کا حکم ملا تو انھوں نے اسی مقام پر کشتی بنائی۔ اور یہ جو چشمہ موجود ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفان آگیا۔

تیسرا مقام جبل سنجار ہے یہ مقام موصل کے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس پہاڑ میں اب بھی غار موجود ہیں اور ان میں یزیدی رہتے ہیں۔ ان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب عین سفنی میں طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں آکر اس پہاڑ کے پاس رک گئی

یہ تینوں قصے ہمارے سننے میں وہاں آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں طوفانِ نوح سے متعلق ہندوستان میں ایک بحث شروع ہوئی تھی۔ اس بحث میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے، میاں محمد مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا، مرحوم مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی۔ لالہ بنانک پرشاد چریاکوٹی تلمیذ حضرت مولانا مولوی قاضی عنایت رسول صاحب۔ یہ تمام بحث ایک رسالہ کی شکل میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس رسالہ کا نام "احسن البیان فی تحقیق مسئلۃ الطوفان" ہے۔ اس تمام بحث میں خطِ میخی کے کتبات سے بحث کی گئی ہے اور موضوع یہ ہے کہ طوفان عام تھا یا کہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ تھا۔ سب سے دلچسپ بحث وہ ہے جو پنڈت صاحب نے شروع کی تھی۔ اپنڈوں اور دیگر ہندو کتابوں سے وہ یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہر جگ کے بعد ایک طوفانِ عظیم آتا رہا ہے۔

یہ باتیں ہمیں اس سے پیشتر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ ایک مقام جو بندھیل کھنڈ میں ہے اس کے متعلق بھی ہندوؤں میں اس طوفان کا قصہ پایا جاتا ہے یہ مقام ریاست بیجاور کے قریب بندھیل کھنڈ میں واقع ہے اور اس کو بھیم کنڈ کہتے ہیں۔ ہم نے اس مقام کو ۱۹۴۵ء میں دیکھا۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ایک کنواں ہے مگر قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کے اندر اچھی خاصی سیڑھیاں ہیں جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تیس اور چالیس کے درمیان ہے نیچے اتر کر ایک وسیع دالان میں آتے ہیں جس کے ایک طرف غار ہیں اور دوسری جانب پہاڑ کو تراش کر کمرے بنا دیئے گئے ہیں۔ پھر ایک سیڑھیوں کا اور سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام پر ایک تالاب ہے مختصر سا یہ تالاب درحقیقت چشمہ ہے۔ روایت ہے کہ اس تالاب کی گہرائی معلوم نہیں ہو سکی اور یہ واقعہ ہے کہ جب ہم نے اس کے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کی سطح نظر نہیں پڑتی تھی۔ پانی اس قدر نیلے رنگ کا تھا کہ سمندر کا پانی بھی اس قدر نیلا دیکھنے میں نہیں آیا، مگر نہایت شفاف تھا۔ تالاب کے دونوں جانب دو پتھر جو اس چٹان کے حصے تھے دور تک نیچے جاتے دکھائی دیتے تھے مگر تلے نظر نہ آتے تھے۔ اس تالاب کے عین اوپر پہاڑ سے چھت بنی ہوئی تھی جس میں ایک کافی بڑا سوراخ تھا اور اس سوراخ سے روشنی اندر آکر تمام

جگہ کو روشن کر رہی تھی۔ اس مقام کے ساتھ ہندوؤں نے یہ قصہ منسوب کر رکھا ہے کہ جو پہلا طوفان آیا وہ یہاں سے شروع ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس مقام کو بھیم کھنڈ کیوں کہا جاتا ہے یہ معلوم نہیں ہوسکا البتہ قیاس یہ کہتا ہے بھیم جو بادشاہ تھا اس کے ساتھ کوئی مناسبت ہوگی۔ کھنڈ سنسکرت میں تالاب کو کہتے ہیں اسی لئے بندھیل کھنڈ کے علاقے کا نام یہ پڑ گیا ہے کیونکہ اس علاقے میں جگہ جگہ تالاب اور جھیلیں ہیں۔

درحقیقت مستشرقین نے علاقہ طوفانِ نوح کے متعلق جو علاقہ تجویز کیا ہے وہ ارارات (Ararat) کا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات آشوریوں کی ہو رہی تھی۔

لفظ آشور کے متعلق ہم پچھلے کسی مقالہ میں لکھ آئے ہیں کہ یہ آشوریوں کا دیوتا تھا اسی کے نام پر مقام آشور (قلعہ شرکت) کا نام رکھا گیا اور اسی نام سے آشوری قوم کو (Assyrians.) یاد کیا جاتا ہے اس لفظ کا استعمال ہمیں خطِ میخی کے کتبوں میں دو طرح سے ملتا ہے ایک آشیر (Ashir.) اور دوسرے آشور (Ashur) ابتدا میں اس لفظ کو تین معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اول شہر یا بستی کے لئے۔ دوئم ملک یا زمین کے لئے اور سوئم دیوتا کے معنوں میں۔ ہمیں آشیر (Ashir) کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا میں لفظ رحمٰن اور رحیم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ سومیری (Sumerian.) زبان میں اسی لفظ کو آ۔ اُسار (A-Usar.) کہا جاتا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ یہ لفظ سامی Sematic زبان کا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ عبرانی (Hebrew.) زبان کے لفظ آشر کا مترادف ہو۔ آشوری زبان میں اس لفظ کو دو طرح لکھا جاتا تھا خطِ میخی میں یہ لفظ ملاحظہ ہو۔

۱-

۲-

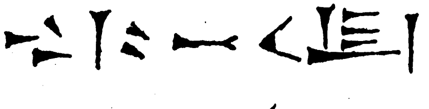

یہ آشوری کہاں سے آئے؟ تاریخ اس کے متعلق مختلف جواب دیتی ہے۔ ہمیں ان سب سے

اختلاف ہے۔ گذشتہ سال کے مقالوں میں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ بھی آرین اقوام کا ایک گروہ تھا۔ جو سومیری اقوام کے بعد اس علاقے میں پہنچا۔ اگرچہ سومیری خود اس علاقے میں سے ہوکر ہلال خصیب کے جنوب میں پہنچے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقہ کی تہذیب اُر (Ur) کی تہذیب سے قدیم تر ہو۔ اور یہ جو آثار ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب قدیم تر ہے تو غالباً اس اولین گروہ کے نشانات ہیں جو یہاں سے ہوکر گذریں اور سومیری کہلائیں۔ غالباً یہ گروہ آرمینیا (Armenia.) سے ہوتا ہوا کردستان پہنچا اور کردستان کو عبور کرکے ترکستان جس کو اس زمانے میں اناطولیا کہا جاتا تھا وہاں پہنچا اور پھر وہاں سے مملکتِ آشور آباد کی

مورخین یہ کہتے ہیں کہ آشوری حکومتِ بابل کے فرمانروا تھے اور اکادی تھے۔ ہمارے نزدیک یہ تشخیص غلط ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک زمانے میں آشور پر بابلیوں کی حکومت ہوگئی تھی جسے حمیرابو (Hammirab) نے اس کو فتح کرلیا تھا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے انجیل سے سند لیجاتی ہے

مورخین کہتے ہیں کہ باب پیدائش (۱۱:۱) میں مذکور ہے کہ آشور (نمرود) بابل سے باہر چلا گیا۔ اور نینوا کی بنیاد رکھی۔ ہماری دانست میں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آشور ہمیشہ ہی بابلیوں کے ماتحت رہا ہے، ان کی اپنی بھی حکومت تھی جو کئی صدیوں تک قائم رہی۔ بلکہ ہمیں تو بابلیوں کی تہذیب کا بھی آشوری تہذیب پر بہت کم اثر نظر آتا ہے۔ آکادی اور سومیری زبانوں کا بھی آشوری زبان سے دور کا تعلق نہیں۔ یہ دونوں زبانیں آشوری زبان سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ رسم الخط بہت ملتا ہے ممکن ہے یہ رسم الخط آشور ہی میں شروع ہوا ہو۔ جیسے کتبوں سے ثابت ہے کہ آشوریوں کی تہذیب سومیری تہذیب سے زیادہ پرانی تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح آشوری تہذیب یہاں تک ترقی کرچکی کہ ہمیں یہاں سیاسی اور ادبی ادارے ملتے ہیں۔ اور ان کے اپنے قانون ملک میں رائج تھے جن میں عورتوں کے حقوق کا باقاعدہ طور پر تحفظ کیا گیا تھا۔ ان کے وزرا اور امرا بھی سومیریوں سے زیادہ مہذب تھے جو اپنے محل اور لائبریریاں رکھتے تھے۔ یہ لائبریریاں اب متعدد جگہوں سے برآمد ہوچکی ہیں۔

مورخین کی ایک شاخ نے جب یہ محسوس کیا کہ آشوریوں کا تعلق اکادیوں اور سومریوں کے ساتھ ثابت نہیں ہو سکتا تو انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ ان کو سیمیٹک (Semetic.)

ثابت کیا جائے۔ اور بتایا جائے کہ یہ دراصل وسط عرب کے باشندے تھے۔ اس کی بنا یہ تھی کہ ان دونوں کی زبانوں میں مشابہت تھی۔

مگر دیگر امور اس تحقیق کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں۔ ممکن ہو سکتا ہے عربی نسل کو آشور کے ساتھ راہ و رسم ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایک تہذیب کا دوسرے پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ ان کی زبان سے آشوریوں نے بہت سے الفاظ اخذ کر لئے ہوں۔ لیکن ان دونوں کے کلچر میں بے حد تفاوت ہے مذاہب میں بہت اختلاف نمایاں ہے۔ شکل و شباہت میں آشوری سوریا کے آرامیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں (Armaens of Syria.) یہ مضبوط اور پست قد تھے اور ان کے بال گھونگر والے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ عربوں کا قد و قامت اس کے بالکل برعکس ہے۔

مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ آشوری ایشیائے کوچک (Asia Minor.) اور دریا سے

لہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیق میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ آشوری زبان پر واقعی قدیم عربی زبان کا اثر پڑا۔ اور اکثر الفاظ اب بھی عربی زبان کے خط میخی کے کتبوں سے حل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم لفظ اربیل (Arbil.) ہی کو لیتے ہیں۔ اس مقام کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم شہر ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور فقط یہی ایک شہر ہے جو کبھی تباہ و برباد نہیں ہوا۔ دمشق اور بیروت وغیرہ جو اس وقت موجود ہیں اسی زمانے کے شہر ہیں مگر کئی بار تباہ ہو چکے ہیں۔ مگر اربیل کبھی تباہ نہیں ہوا اور متواتر آباد چلا آیا ہے۔ اس شہر کا نام ہمیں اول اول اُر (Ur) کے تیسرے شاہی خاندان کے کتبوں میں ملتا ہے وہاں اس کو اُربلم (Urbillum.) لکھا ہے اس کے بعد آشوریوں نے اس لفظ میں معانی تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ اور بالآخر اپنی زبان کے مطابق اس کا نام اربعہ ایلو (Araba-ilu.) رکھ دیا۔ اس کا مطلب چار دیوتا ہے۔ اربعہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں اور ایلو آشوری زبان میں دیوتا کو کہتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ بعد میں ایلو یاہ (Iloha.) اور اللہ بن گیا یہی لفظ اربعہ ایلو بدلتے بدلتے اربیل بن گیا اور یہی لفظ آج کل مستعمل ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے۔ نقل الکلمہ کی جس کی تشریح ہم اسی عنوان کے مقالے میں، جو گذشتہ سال برہان میں شائع ہوا تھا، کر آئے ہیں۔

دجلہ کے مشرقی حصہ کے باشندے تھے۔ یہ علاقہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے ابھی ان کے لئے مقرر کیا ہے ان کا دوسری قوموں میں اختلاط بہت جلد ہو گیا اور انھوں نے دوسری قوموں میں لاتعداد شادیاں بھی کیں۔ آشوریوں کی تہذیب اور کلچر کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ایک مکمل کیلنڈر بھی ایجاد کیا تھا۔ ان کے مہینوں کے نام دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے اس لئے ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے تلفظ کے متعلق ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے۔ درحقیقت خط میخی کے کتبوں کے تو حل ہو گئے مگر اس زبان کا تلفظ کیا تھا اس کی تحقیق ابھی نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہونا ممکن ہے۔ جب تک ایک زبان کو بولا جائے نہ سنا جائے اس کا تلفظ متعین کرنا نامعقول ہے۔ بہر حال مہینوں[۱] کے نام مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ کرّاتے	Qarrate.
۲۔ تان؟ مارتے	Tan (?) Marte.
۳۔ سین	Sin.
۴۔ کوزآلی	Kuzalli.
۵۔ آلاناتے	Allanate.
۶۔ بیلتی ایکلیم	Belti-Ekallim.
۷۔ ساراتے	Sarate
۸۔ کینتے	Kinate.
۹۔ موہرالی[۲]	Muhr illi
۱۰۔ آب سرآنی	Absarani
۱۱۔ ہبور	Hibur
۱۲۔ سپیم	Sippem

---

[۱] یہ نام ہم نے سڈنی سمتھ کی کتاب ہسٹری آف آشیریا سے لئے ہیں۔

[۲] موہرالی غالباً مہرالی ہے جو حمیرابو (حمیرابی) کے کتبوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل ہے۔

پڑے ہیں۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جب سنحرب (Sennacherib.) نے دوبارہ نینوا کو تعمیر کیا تو اس نے اس کی بنیاد پر ایک بہت وسیع چبوترا بنوایا۔ ممکن ہے پرانی تہذیب اس کے نیچے ابھی پوشیدہ ہو کیونکہ اس چبوترے کو ابھی مکمل طور پر صاف نہیں کیا گیا۔ دوسرے اس علاقے میں ابھی بہت سے ٹیلے (Mounds.) موجود ہیں جہاں کھدائی شروع نہیں ہوئی۔ جنگِ عظیم سے پیشتر اور اس کے دوران میں ترکی حکومت نے یہاں کھدائی ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور اس کے بعد تھوڑا بہت جو کام ہوا ہے وہ ابھی تک نامکمل ہے۔

اسی صدی میں جن ماہرین نے یہاں کام کیا ہے ان میں سے سب سے مشہور بوتا (Bota) ایک فرانسیسی آرکیولوجسٹ (Archeologist.) تھا۔ سڈنی سمتھ (Sydney Smith) مسٹر کنگ (L.W. King.) اور مسٹر راسم (Rassam.) تھے۔ گذشتہ صدی کے ماہرین جنھوں نے اس تحقیق کی بنیاد رکھی ان میں سب سے مشہور لے یارڈ (Layard) رالنسن (Rawlinson) اور ڈاکٹر ہنکس (Hincks.) تھے۔ یہ تمام ماہرین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا اس علاقے میں باقی رہ گیا ہے۔

ان ماہرین آثریات (Assyriologists.) کی راہ میں جو دقتیں پیش آئیں اس کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بوتا (Bota.) نے کھدائی شروع کی تو اس کو اجازت لینے میں بہت دقت پیش آئی ترکی حکومت کسی شرط پر بھی رضامند نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ ٹیلہ تھا جس پر آج کل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے یہ ٹیلہ موصل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور قدیم نینوا (Nineveh.) کا ہی ایک حصہ ہے۔ اب تو اس ٹیلہ پر ایک قصبہ بھی قائم ہو چکا ہے بوتا (Bota) نے ایک اچھوتی چال چلی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اس نے اس ٹیلے پر چند ایک مکانات خریدے اور ان کے اندر سے اس نے کھدائی کا عمل خفیہ طور پر شروع کر دیا۔ وہ اپنے اس فعل میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ کھدائی کے دوران میں اس کو دو سرنگیں ملیں جو محلات کی طرف پہنچتی تھیں یہ محلات سنحرب (Sennacherib.) کے تعمیر شدہ تھے۔ اسے ان سرنگوں میں

چند ایک بہت اہم کتبے اور بت بھی ملے۔ مگر کسی نے یہ راز فاش کر دیا۔

جب ترکی حکومت کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو بوتا کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا۔ ہماری دانست میں یہ جو رکاوٹ اسے پیش آئی اس کی وجہ محض مذہبی تعصب تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ شخص خفیہ طور پر حضرت یونس علیہ السلام کے مزار تک پہنچنا چاہتا ہے اور شاید وہاں اسے کسی خزانے کے ملنے کا امکان نظر آتا ہے۔ اس روز سے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ دوبارہ اس کام کو شروع کر سکے۔ ہمارا خیال ہے یہ ٹیلہ جس پر آجکل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار ہے سنجرب (Sennacherib) کے زمانے میں اس کے محل کا ایک حصہ تھا۔

آشور (Ashur) یعنی قلعہ شرکت جو مملکت آشور کا دارالخلافہ تھا یہاں بھی ایک کثیر رقم کھدائی میں صرف کی گئی مگر حسب توقع اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ آشور کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ دارالخلافہ اول اول ۲۶۵ — ۲۷۵۰ قبل مسیح کے درمیان بنا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ عراق کا محکمہ آثار قدیمہ عنقریب اس مقام پر از سر نو کام شروع کر دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ پھر اس علاقے کی قدیم داستان مکمل ہو جائے۔

اس علاقے کے متعلق جس قدر بھی روایات مشہور ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر روایتوں کی تصدیق نہیں ہوئی، تاہم یہ سب نہایت دلچسپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی تہذیب طوفانِ نوحؑ سے بھی قدیم تر ہے۔ چند ایک بادشاہوں کے نام خط میخی سے بھی حل ہو چکے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بھی پہلے کے تھے۔ ایک مورخ نے تو دس بادشاہوں کے نام لئے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے پیشتر مملکتِ آشور پر حکمراں تھے۔ یہ مورخ ایک کلدانی ہے اور سنجرب (Sennacherib) کے زمانے میں تھا۔ ممکن ہے یہ کلدانی انہی لوگوں میں سے ہو جن کو پکڑ کر سنجرب بابل سے لایا تھا۔ اس علاقے میں آجکل بھی کلدانیوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ اس کلدانی مورخ نے محض وہ قصے دوہرائے ہیں جو خود اس کے زمانے سے دو ہزار سال پیشتر کے واقعات تھے۔ ان قصوں کا ذکر سڈنی سمتھ (Sydney Smith) اپنی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف اثریا (History of Assyria.) میں کرتا ہے۔

بہرکیف ماہرین آثارِ قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آشور کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے جس کا وقت ...۳۰ قبل مسیح سے بھی بہت پہلے پہنچتا ہے یہاں تک کہ اُر (Ur) کی تہذیب سے بھی بہت پہلے کی ہے طوفانِ نوح کا قصہ سومیری کتبات سے بھی ثابت ہوتا ہے اس واقعہ کو وہاں گلگمیش (Gilgamesh) کی روایت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی سب سے پرانی روایت طوفان نوح کے متعلق معلوم ہوتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسوقت سے بہت سے مقاموں کو اس واقعہ کے ساتھ منسوب کردیا گیا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان علاقوں کا جو طوفانِ نوح کے واقعہ کے ساتھ وابستہ ہیں، تھوڑا بہت ذکر کردیا جائے۔

ملک طاؤس والے مقالے میں ہم نے تین مقاموں کا ذکر کیا تھا، کوہ سفینہ، عین سفنی اور جبل سنجار، ان علاقوں کے ساتھ مندرجہ ذیل قصے منسوب ہیں:۔

کوہ سفینہ، اربیل کے شمال کی طرف تقریباً ۱۵ میل مقام شقلاوہ کے قریب واقع ہے اس کو کوہِ سفینہ (یعنی کشتی والا پہاڑ) اس لئے کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پانی پر تیرتی ہوئی چلی تو اس پہاڑ کے پاس آکر رک گئی اور یہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سے اتارا۔

دوسرا مقام عین سفنی ہے اور یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۲۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں سے راستہ شیخ عدی اور بادیان (Bavian) کو جاتا ہے۔ یہاں ایک چشمہ اب بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ یہ روایت وابستہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب طوفان کی خبر دی گئی اور کشتی بنانے کا حکم ملا تو انھوں نے اسی مقام پر کشتی بنائی۔ اور یہ جو چشمہ موجود ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفان آگیا۔

تیسرا مقام جبل سنجار ہے یہ مقام موصل کے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس پہاڑ میں اب بھی غار موجود ہیں اور ان میں یزیدی رہتے ہیں۔ ان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب عین سفنی میں طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں آکر اس پہاڑ کے پاس رک گئی

یہ تینوں قصے ہمارے سننے میں وہاں آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں طوفانِ نوح سے متعلق ہندوستان میں ایک بحث شروع ہوئی تھی۔ اس بحث میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے، میاں محمد مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا مرحوم، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی۔ لالہ بنائک پرشاد چریاکوٹی تلمیذ حضرت مولانا مولوی قاضی عنایت رسول صاحب۔ یہ تمام بحث ایک رسالہ کی شکل میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس رسالہ کا نام "احسن البیان فی تحقیق مسئلۃ الطوفان" ہے۔ اس تمام بحث میں خطِ میخی کے کتبات سے بحث کی گئی ہے اور موضوع یہ ہے کہ طوفان عام تھا یا کہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ تھا۔ سب سے دلچسپ بحث وہ ہے جو پنڈت صاحب نے شروع کی تھی۔ پانڈوں اور دیگر ہندو کتابوں سے وہ یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہر جگ کے بعد ایک طوفانِ عظیم آتا رہا ہے۔

یہ بات ہمیں اس سے پیشتر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ ایک مقام جو بندھیل کھنڈ میں ہے اس کے متعلق بھی ہندوؤں میں اس طوفان کا قصہ پایا جاتا ہے یہ مقام ریاست بیجاور کے قریب بندھیل کھنڈ میں واقع ہے اور اس کو بھیم کنڈ کہتے ہیں۔ ہم نے اس مقام کو ۱۹۴۵ء میں دیکھا۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ایک کنواں ہے مگر قریب پہنچکر معلوم ہوا کہ اس کے اندر اچھی خاصی سیڑھیاں ہیں جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تیس اور چالیس کے درمیان ہے نیچے اتر کر ایک وسیع دالان میں آتے ہیں جس کے ایک طرف غار ہیں اور دوسری جانب پہاڑ کو تراش کر کمرے بنادیئے گئے ہیں۔ پھر ایک سیڑھیوں کا اور سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام پر ایک تالاب ہے مختصر سا۔ یہ تالاب درحقیقت چشمہ ہے۔ روایت ہے کہ اس تالاب کی گہرائی معلوم نہیں ہوسکی اور یہ واقعہ ہے کہ جب ہم نے اس کے کنارے پر کھڑے ہوکر دیکھا تو اس کی سطح نظر نہیں پڑتی تھی۔ پانی اس قدر نیلے رنگ کا تھا کہ سمندر کا پانی بھی اس قدر نیلا دیکھنے میں نہیں آیا، مگر نہایت شفاف تھا۔ تالاب کے دونوں جانب دو پتھر جو اس چٹان کے حصے تھے دور تک نیچے جاتے دکھائی دیتے تھے مگر تلے نظر نہ آتے تھے۔ اس تالاب کے عین اوپر پہاڑ سے چھت بنی ہوئی تھی جس میں ایک کافی بڑا سوراخ تھا اور اس سوراخ سے روشنی اندر آکر تمام

جگہ کو روشن کر رہی تھی۔ اس مقام کے ساتھ ہندوؤں نے یہ قصہ منسوب کر رکھا ہے کہ جو پہلا طوفان آیا وہ یہاں سے شروع ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس مقام کو بھیم کھنڈ کیوں کہا جاتا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ قیاس یہ کہتا ہے بھیم جو بادشاہ تھا اس کے ساتھ کوئی مناسبت ہوگی۔ کھنڈ سنسکرت میں تالاب کو کہتے ہیں اسی لئے بندھیل کھنڈ کے علاقے کا نام یہ پڑ گیا ہے کیونکہ اس علاقے میں جگہ جگہ تالاب اور جھیلیں ہیں۔

درحقیقت مستشرقین نے علاقہ طوفانِ نوح کے متعلق جو علاقہ تجویز کیا ہے وہ ارارات (Ararat) کا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات آشوریوں کی ہو رہی تھی۔

لفظ آشور کے متعلق ہم پچھلے کسی مقالہ میں لکھ آئے ہیں کہ یہ آشوریوں کا دیوتا تھا اسی کے نام پر مقام آشور (قلعہ شرکت) کا نام رکھا گیا اور اسی نام سے آشوری قوم کو (Assyrians.) یاد کیا جاتا ہے اس لفظ کا استعمال ہمیں خطِ میخی کے کتبوں میں دو طرح سے ملتا ہے ایک آشیر (Ashir.) اور دوسرے آشور (Ashur) ابتدا میں اس لفظ کو تین معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اول شہر یا بستی کے لئے۔ دوم ملک یا زمین کے لئے اور سوئم دیوتا کے معنوں میں۔ ہمیں آشیر (Ashir) کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا میں لفظ رحمٰن اور رحیم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ سومیری (Sumerian.) زبان میں اسی لفظ کو آ۔ اُسار (A-Usar.) کہا جاتا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ یہ لفظ سامی (Sematic) زبان کا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ عبرانی (Hebrew.) زبان کے لفظ آشر کا مترادف ہو۔ آشوری زبان میں اس لفظ کو دو طرح لکھا جاتا تھا خطِ میخی میں یہ لفظ ملاحظہ ہو۔

۱-

۲- 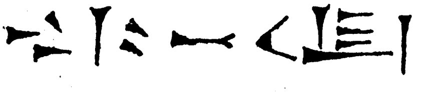

یہ آشوری کہاں سے آئے؟ تاریخ اس کے متعلق مختلف جواب دیتی ہے۔ ہمیں ان سب سے

اختلاف ہے۔ گذشتہ سال کے مقالوں میں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ بھی آرین اقوام کا ایک گروہ تھا جو سومیری اقوام کے بعد اس علاقے میں پہنچا۔ اگرچہ سومیری خود اس علاقے میں سے ہوکر ہلال خصیب کے جنوب میں پہنچے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقہ کی تہذیب اُر (Ur) کی تہذیب سے قدیم تر ہو۔ اور یہ جو آثار ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب قدیم تر ہے تو غالباً اس اولین گروہ کے نشانات ہیں جو یہاں سے ہوکر گذریں اور سومیری کہلائیں۔ غالباً یہ گروہ آرمینیا (Armenia.) سے ہوتا ہوا کردستان پہنچا اور کردستان کو عبور کرکے ترکستان جس کو اس زمانے میں اناطولیا کہا جاتا تھا وہاں پہنچا اور پھر وہاں سے مملکتِ آشور آباد کی

مورخین یہ کہتے ہیں کہ آشوری حکومتِ بابل کے فرمانروا تھے اور اکادی تھے۔ ہمارے نزدیک یہ تشخیص غلط ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک زمانے میں آشور پر بابلیوں کی حکومت ہوگئی تھی جسے حمیرابو (Hammirab) نے اس کو فتح کرلیا تھا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے انجیل سے سند لیجاتی ہے

مورخین کہتے ہیں کہ باب پیدائش (۱۰:۱۱) میں مذکور ہے کہ آشور (نمرود) بابل سے باہر چلا گیا۔ اور نینوا کی بنیاد رکھی۔ ہماری دانست میں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آشور ہمیشہ ہی بابلیوں کے ماتحت رہا ہے، ان کی اپنی بھی حکومت تھی جو کئی صدیوں تک قائم رہی۔ بلکہ ہمیں تو بابلیوں کی تہذیب کا بھی آشوری تہذیب پر بہت کم اثر نظر آتا ہے۔ آکادی اور سومیری زبانوں کا بھی آشوری زبان سے دور کا تعلق نہیں۔ یہ دونوں زبانیں آشوری زبان سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ رسم الخط بہت ملتا ہے ممکن ہے یہ رسم الخط آشور ہی میں شروع ہوا ہو۔ جیسے کتبوں سے ثابت ہے کہ آشوریوں کی تہذیب سومیری تہذیب سے زیادہ پرانی تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح آشوری تہذیب یہانتک ترقی کرچکی کہ ہمیں یہاں سیاسی اور ادبی ادارے ملتے ہیں۔ اور ان کے اپنے قانون ملک میں رائج تھے جن میں عورتوں کے حقوق کا باقاعدہ طور پر تحفظ کیا گیا تھا۔ ان کے وزراء اور امراء بھی سومیریوں سے زیادہ مہذب تھے جو اپنے محل اور لائبریریاں رکھتے تھے۔ یہ لائبریریاں اب متعدد جگہوں سے برآمد ہوچکی ہیں۔

مورخین کی ایک شاخ نے جب یہ محسوس کیا کہ آشوریوں کا تعلق اکادیوں اور سومریوں کے ساتھ ثابت نہیں ہوسکتا تو انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ ان کو سمیٹک (Semetic.)

ثابت کیا جائے۔ اور بتایا جائے کہ یہ دراصل وسط عرب کے باشندے تھے۔ اس کی بنا یہ تھی کہ ان دونوں کی زبانوں میں مشابہت تھی۔

مگر دیگر امور اس تحقیق کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں۔ ممکن ہو سکتا ہے عربی نسل کو آشور کے ساتھ راہ و رسم ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک تہذیب کا دوسرے پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ ان کی زبان سے آشوریوں نے بہت سے الفاظ اخذ کر لئے ہوں۔ لیکن ان دونوں کے کلچر میں بے حد تفاوت ہے مذاہب میں بہت اختلاف نمایاں ہے۔ شکل و شباہت میں آشوری سوریا کے آرامیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں (Armaens of Syria.) یہ مضبوط اور پست قد تھے اور ان کے بال گھونگر والے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ عربوں کا قد و قامت اس کے بالکل برعکس ہے۔

مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ آشوری ایشیائے کوچک (Asia Minor.) اور دریاسے

لہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیق میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ آشوری زبان پر واقعی قدیم عربی زبان کا اثر پڑا۔ اور اکثر الفاظ اب بھی عربی زبان کے خط میخی کے کتبوں سے حل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم لفظ اربیل (Arbil.) ہی کو لیتے ہیں۔ اس مقام کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم شہر ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور فقط یہی ایک شہر ہے جو کبھی تباہ و برباد نہیں ہوا۔ دمشق اور بیروت وغیرہ جو اس وقت موجود ہیں اسی زمانے کے شہر ہیں مگر کئی بار تباہ ہو چکے ہیں۔ مگر اربیل کبھی تباہ نہیں ہوا اور متواتر آباد چلا آیا ہے۔ اس شہر کا نام ہمیں اول اول اُر (Ur) کے تیسرے شاہی خاندان کے کتبوں میں ملتا ہے وہاں اس کو اُربلم (Urbillum.) لکھا ہے اس کے بعد آشوریوں نے اس لفظ میں معانی تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ اور بالآخر اپنی زبان کے مطابق اس کا نام اربعہ ایلو (Araba-ilu.) رکھ دیا۔ اس کا مطلب چار دیوتا ہے۔ اربعہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں اور ایلو آشوری زبان میں دیوتا کو کہتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ بعد میں ایلو یاہ (Iloha.) اور اللہ بن گیا۔ یہی لفظ اربعہ ایلو بدلتے بدلتے اربیل بن گیا اور یہی لفظ آج کل مستعمل ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے۔ نقل الکلمہ کی جس کی تشریح ہم اسی عنوان کے مقالے میں، جو گذشتہ سال برہان میں شائع ہوا تھا، کر آئے ہیں۔

دجلہ کے مشرقی حصہ کے باشندے تھے۔ یہ علاقہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے ابھی ان کے لئے مقرر کیا ہے ان کا دوسری قوموں میں اختلاط بہت جلد ہو گیا اور انھوں نے دوسری قوموں میں لاتعداد شادیاں بھی کیں۔ آشوریوں کی تہذیب اور کلچر کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ایک مکمل کیلنڈر بھی ایجاد کیا تھا۔ ان کے مہینوں کے نام دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے اس لئے ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے تلفظ کے متعلق ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے۔ درحقیقت خطِ میخی کے کتبوں کے تو حل ہو گئے مگر اس زبان کا تلفظ کیا تھا اس کی تحقیق ابھی نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہونا ممکن ہے۔ جب تک ایک زبان کو بولا جائے نہ سنا جائے اس کا تلفظ متعین کرنا نامعقول ہے۔ بہرحال مہینوں[۱] کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ کرّاتے	Qarrate.
۲۔ تان ؟ مارتے	Tan (?) Marte.
۳۔ سین	Sin.
۴۔ کوزآلی	Kuzalli.
۵۔ آلاناتے	Allanate.
۶۔ بیلتی ایکلیم	Belti-Ekallim.
۷۔ ساراتے	Sarate
۸۔ کینتے	Kinate.
۹۔ موہرالی[۲]	Muhr illi
۱۰۔ آب سرآنی	Absarani
۱۱۔ ہبور	Hibur
۱۲۔ سپیم	Sippem

---

[۱] یہ نام ہم نے سڈنی سمتھ کی کتاب ہسٹری آف آئیریا سے لئے ہیں۔

[۲] موہرالی غالباً اہرالی ہے جو حمیرا بو (حمیرابی) کے کتبوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل ہے۔

ادبیات

تبرکات

از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

ذیل میں وہ قطعۂ تاریخ درج کیا جاتا ہے وہ حضرتِ مرحوم نے راندیر ضلع سورت کی بڑی مسجد کی تعمیر پر بطور قطعۂ تاریخ کے لکھا تھا۔ یہ قطعہ راندیر کے یم ذی ملاجما کی معرفت ہم کو ملا ہے۔ (برہان)

اللہ اللہ اہلِ راندیر بر ہمتِ شان صد آفرین است
تجدید نمودہ مسجدے کو ز آثارِ قدیم فاتحین است

در زینت وخوبی ونکوئی خجلت دہِ نقشہائے چین است
ہر رنگ کز دست لعل پیدا است ہر نقش درست ودلنشین است

بر روئے زمیں ز رحمتِ حق فردوس برائے مومنین است
بشنو کہ چساں زبانِ حالش بر ذات عماد مکہ چین است

ایں مسجد اگر دیگر مساجد ہستند ببین بہترین است
حیرت چہ کنی مگر نہ بینی متولی او امامِ دین است

پر نور شد سپاہی والڑہ کیں شمعِ ہدیٰ درو مکین است
قائم بادا برفعت وشان تا سایۂ چرخ بر زمین است

ابر کرم وسخا محمد[۱] بر پا کن ایں حصارِ دین است
راندیر کند چو فخر بر سطے سرمایۂ نازشش ہمین است

یسعیٰ ویفید ہم فینسی مشہور بہ فینسی ازین است
اربابِ کرم ز قوم بوہرہ چوں ہمتِ شان بکارِ دین است

تائید وعطائے ایں کریماں از عمدہ معاونین این است
با دام ودرم کسے کہ یارب در خدمتِ ایں شعارِ دین است

الطافِ تو کارسازِ او باد فضلِ تو علیہم اجمعین است
تاریخ بناش بے تشش وپنج زیبا نہا للناظرین است
۱۳۳۴ھ

جس گھڑی اتمام مسجد کا ہوا کان میں یہ غیب سے آئی صدا
ہے بیاے محمود تاریخ بنا سجدہ گاہِ اغنیائے باصفا
۱۳۳۴ھ

اہتمامِ کارِ مسجد جب ہوا میں نے چاہا لکھوں تاریخ بنا
ہاتفِ غیبی نے دی فوراً ندا ثانی بیت المقدس ہے بنا
۱۳۳۴ھ

بشنو بشنو ز زبانِ ہاتف سال او ثانی بیتِ معمور
۱۳۳۴ھ

[۱] جناب محمد فینسی مرحوم مراد ہیں جن کے اہتمام سے مسجد کی تعمیرِ جدید ہوئی۔

نوائے سروش

از جناب ماہر القادری

حُنین و بدر میں وہ غازیوں کی تکبیریں
نظر کے ساتھ بدلتی گئی ہیں تقدیریں

خموشیوں سے نمایاں ہے جذبِ سوزِ دروں
یہ سلوٹیں ہیں جبیں پر کہ دل کی تحریریں

یہ سجدہ ہائے ریائی کے داغ ارے توبہ!
کہ مسجدوں میں بنا دی گئی ہیں تصویریں

یہ کون پچھلے پہر رات کو ہے محوِ سجود
دعا کو ڈھونڈ رہی ہیں ابھی سے تاثیریں

حدیثِ عشق کی تشریح کوئی کھیل نہیں
جگر کے خون سے لکھی گئی ہیں تفسیریں

میں کیا کہوں مرے ظلمت کدے کا رنگ ہے کیا؟
گزر گئی تھیں ادھر سے بھی چند تنویریں

ہر احتیاط پہ ذوقِ طلب نے چٹکی لی
جنوں کو راس نہ آئیں خرد کی تدبیریں

مجاہدوں سے کہو اس قدر نہ ہوں تنگ دل
کہیں کہیں سے ذرا مڑ گئی ہیں شمشیریں

غم و الم کی شکایت میں کیا کروں ماؔہر
کہ میرے خواب پریشاں کی ہیں یہ تعبیریں

غزل

از جناب آلم مظفرنگری

دنیا کہاں نگاہِ حقیقت نگر کہاں — آیا ہوں جستجو میں کسی کی مگر کہاں

ہیں ظلمتیں ہی ظلمتیں ہستی سے تا عدم — میری شبِ فراق کی ہوگی سحر کہاں

بابِ قبول بھی تو انھیں کی ہے بارگاہ — لایا مری فغاں کو فریبِ اثر کہاں

کیا دیکھتا ہے زخم کو یہ دیکھ چارہ گر — دل میں خلش نواز ہے تیرِ نظر کہاں

تم بے نقاب آئے مگر وقتِ واپسیں — اب چشمِ انتظار میں تابِ نظر کہاں

ہر منظرِ بہشت ہے ساقی نگاہ میں — ساغر میں تیرے ڈوب کے پہنچی نظر کہاں

بلبل کو درسِ ضبط چمن میں نہ دے کوئی — طوفانِ آب و رنگ کہاں، مشتِ پر کہاں

تھی وقتِ مرگ زیرِ مژہ ایک لہو کی بوند — رکھی چھپا کے میں نے متاعِ جگر کہاں

پروانہ کہہ رہا تھا یہ جل جل کے شمع پر — دیکھو ہوا ہے قصۂ غم مختصر کہاں

ہر جلوہ عکسِ آئینہ ہے بزمِ دہر میں — آئینہ بھی یہاں نہیں، آئینہ گر کہاں

راہِ عدم ہے یہ کہ رہِ ہست و بود ہے — مجھکو خبر نہیں کہ ہوں گرمِ سفر کہاں

ہر ذرہ دے رہا ہے آلم دعوتِ جمال

تبصرے

اسلامی تقاریب مرتبہ مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم۔اے۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۲۱ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۸؎ پتہ:۔ ادارہ اشاعتِ اسلامیات حیدرآباد دکن۔

ہر قوم کے لئے سال بھر میں کچھ دن ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں اس کے افراد روزمرہ کے مشاغلِ کسبِ معاش سے بے نیاز ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے ہنسی خوشی ملتے ملاتے اور جشنِ مسرت مناتے ہیں۔ ان دنوں کو قومی تہوار کے نام سے پکارا جاتا ہے اور ان تہواروں کو جس طرح منایا جاتا ہے اس سے اس قوم کی اخلاقی اور تہذیبی حالت و حیثیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس عام کلیہ سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان کے اپنے بھی تہوار اور قومی اجتماعات ہیں لیکن مسلمانوں کو بہ نسبت دوسری قوموں کے اس باب میں بھی یہ امتیازِ خصوصی حاصل ہے کہ اُن کے ہاں ان تقریبات کو منانے کے جو طریقے ہیں ان میں کسی قسم کی عریانی اور فحاشی نہیں ہوتی۔ وہ ان مواقع پر عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ اپنی عام حیثیت سے بڑھ کر عمدہ کھانے کھاتے اور کھلاتے ہیں، داد و دہش کرتے ہیں اور سارا دن ہنسی خوشی ملنے ملانے میں بسر کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ ان ہنگامہائے مسرت و انبساط میں ان سے کوئی ایک ایسی حرکت بھی سرزد ہو سکے جو خدا پرستی کے خلاف ہو اور جس سے کسی طرح بھی بداخلاقی کی بو آتی ہو۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں لائق مرتب نے انہی تقریباتِ اسلامی سے متعلق متعدد مفید و دلچسپ مقالات جمع کر دیئے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ملک کے مشاہیر اربابِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان سے ہر تقریب کے متعلق تاریخی اور دینی معلومات بھی حاصل ہوں گی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے منانے کا صحیح اسلامی طریقہ کیا ہے اور جہالت کے عام ہونے کی وجہ سے آج کل ان تقریبات کو جس طرح منایا جاتا ہے ان میں اسلامی نقطۂ نظر سے کیا کیا خرابیاں ہیں اور اس بنا پر وہ طریقے

غیر مشروع اور ناجائز ہیں۔ اس مجموعہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مقالہ "خطابہ الم و توضیحہ شہادت" اور "عید الفطر" مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقالہ "عید قرباں" "شب قدر" اور "شب برات" اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا مقالہ "میلاد نبی العالم" "یوم فتح مکہ" خاص طور پر بہت دلچسپ۔ ولولہ آفریں اور سبق آموز ہیں۔

جنگ مشرق و خاتمہ جاپان | از مولوی محمد اسحاق صاحب و ذوبیدہ تبسم صاحبہ تقطیع متوسط ضخامت ۲۲۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:۔ ادارہ نشریات اردو حیدرآباد دکن۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں جناب مصنف و مصنفہ نے جاپان کی جنگ اور اس کے عبرت انگیز خاتمہ کے حالات مختصر لکھے ہیں۔ شروع میں پس منظر کے طور پر جاپان و چین کی تاریخ ماضی و حال، ان کے عادات و خصائل۔ مختلف علاقے۔ یورپ سے ان کے تعلقات وغیرہ کو بیان کیاہے اور ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے جاپان جنگ میں شریک ہوا اور آخر کار اس نے زبردست شکست کھائی۔ ایک باب میں دنیا کے ان بڑے آدمیوں کے حالات بھی لکھدیئے ہیں جن کو گذشتہ جنگِ جاپان سے فوجی اور سیاسی قسم کا تعلق تھا۔ کتاب عام قاری کے لئے دلچسپ اور اضافہ معلومات کا سبب ہوگی۔ البتہ زبان و بیان کے اعتبار سے متعدد خامیاں ہیں جو نہ ہونی چاہیے تھیں۔

تصوراتِ اقبال | از شاغل فخری مرحوم تقطیع متوسط ضخامت ۲۵۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے پتہ:۔ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

اقبال مرحوم پر اردو میں کثرت سے کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے چنانچہ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کے مصنف شاغل فخری اردو زبان کے ایک ہونہار ادیب تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ان کی عمر وفا کرتی اور انھیں اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے ادبی مشاغل جاری رکھنے کا موقع ملتا تو وہ ایک روز صفِ اول کے ادیب ہوتے مرحوم کی یہ ادبی یادگار ان کی فطری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف عنوانات مثلاً

"اسلام و مومن" "روحانیت و مادیت" "دین و سیاست" "ملوکیت و اشتراکیت" "قومیت و بین الاقوامیت" "شعر و حکمت" وغیرہ کے ماتحت کلام اقبال کے مختلف مجموعوں سے اشعار پیش کرکے ہر عنوان سے متعلق اقبال مرحوم کے خیالات و افکار کی ترجمانی اور تشریح کی ہے۔ اس سلسلہ میں لائق مصنف نے جا بجا قرآن مجید کی آیات سے بھی استشہاد کیا ہے۔ زبان شگفتہ اور ادیبانہ ہے اور یہ امر موجب مسرت ہے کہ جوانمرگ مصنف نے سوشلزم ایسے نازک مسئلہ پر اقبال کی ترجمانی کرتے ہوئے نقطۂ اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے اور ہمارے خیال میں فکرِ اقبال کی صحیح عکاسی کی ہے۔ قومیت اور بین الاقوامیت کی بحث میں انھوں نے جو تنقید کی ہے بنیادی طور پر ہم اس سے متفق ہیں۔ تاہم قومیت کی افادی حیثیت کی تشریح میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کا قلم کئی جگہ جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔ لیکن کتابت و طباعت کی اغلاط بہت زیادہ ہیں جن سے بعض جگہ عبارت غیر مربوط اور اشعار ناموزوں ہو گئے ہیں۔ شروع میں شاغل کی پُر از حسرت و یاس زندگی سے متعلق جو مقدمہ ہے وہ بجائے خود پڑھنے کے لائق ہے۔

اسلام کا نظامِ سیاست و عدالت | از مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی تقطیع متوسط ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ ۱۲ پتہ:۔ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدر آباد دکن۔

آج جبکہ انسان کے اپنے بنائے ہوئے مختلف نظامات عدل و سیاست کی ناکامی روز روشن کی طرح واضح اور مشاہد ہو چکی ہے اور دنیا ایک ایسے نظام کی تشنگی شدت سے محسوس کر رہی ہے جو انسانیت کے لئے حقیقی فوز و فلاح اور امن و عافیت کی کفیل ہو۔ سخت ضرورت ہے کہ اسلام کے نظامِ عدل و سیاست کو وقت کے جدید قالب میں منظرِ عام پر لایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اب تک متعدد اداروں کی طرف سے بعض مستحسن کوششیں معرضِ ظہور میں آ بھی چکی ہیں۔ یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کتاب دو ابواب پر تقسیم ہے۔ پہلے باب میں اسلامی سیاست کی اصل روح۔ اس کے مختلف گوشے اور پہلو۔ دوسرے نظام ہائے سیاسی سے اس کا مقابلہ و موازنہ۔ ان چیزوں پر مستند مآخذ کے حوالہ سے روشنی ڈالی گئی ہے اور تاریخی واقعات سے ان کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے۔ دوسرا باب

نظامِ عدالت سے متعلق ہے جس میں عدالت کی تعریف۔ اس کے اجزاء اور عناصر۔ اسلامی عدلیہ کے مختلف ادوار۔ اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کے چیدہ چیدہ اور مفید و دلچسپ اور مشہور فقہاء و مقننینِ اسلام کے سبق آموز حالات لکھے گئے ہیں۔ زبان شگفتہ اور عام فہم ہے۔ امید ہے کہ اہلِ علم اور اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے اور فاضل مصنف کی محنت و کاوش کی داد دیں گے۔

فلسفۂ ایمان | از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۴۸ صفحات کتابت و طباعت متوسط۔ قیمت ۹ ر پتہ :۔ ادارہ دعوت الحق بیگم بازار کوچہ گھانسمنڈی حیدر آباد دکن۔

یہ ایک فاضلانہ مقالہ ہے جس میں ایمان کی حقیقت۔ عمل اور کردار سے اس کا تعلق۔ اس کے مختلف اجزا اور عناصر۔ اسلامی نظام کی اساس اور بنیاد۔ مومن و کافر کے امتیازات۔ خیر و شر کی پہچان عہدِ حاضر کے مختلف عقیدوں کی ناکامی وغیرہ ان مسائل پر بصیرت افروز اور ایمان پرور انداز بیان سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مقالہ اس لائق ہے کہ وقت کی مروجہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر اس کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے۔ البتہ اس ایک مختصر مقالہ پر دیباچہ اور مقدمہ کا بار بہت زیادہ ہے، ان کی چنداں کوئی ضرورت نہ تھی۔

رسولِ خدا | از مولوی ابوالحسن صاحب صدیقی غازی پوری تقطیع خورد ضخامت ۷۱ صفحات۔ کتابت جلی۔ قیمت ۸ ر پتہ :۔ مکتبۂ دینیہ غازی پور۔

یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے چیدہ چیدہ واقعات و حالات اور آپ کے اخلاق و عادات عام فہم اور سلیس و آسان زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ واقعات سب کے سب مستند ہیں اور ہر سبق کے آخر میں بہ طور نتیجہ کے بچوں کے لئے اس کا خلاصہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ بچوں کے نصاب تعلیم میں شامل کی جائے۔

حسنؓ حسینؓ | از مولوی فضل الرحمٰن صاحب استاذ جامعہ ملیہ دہلی تقطیع خورد ضخامت ۴۴ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت ۷ ر پتہ :۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ رضی اللہ عنہما کے مستند حالات عام فہم اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب اگرچہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن عام مسلمان مرد اور عورتیں بھی اس سے فائدہ اٹھا کر کاشانۂ نبوت کے ان دو گوہرانِ شب چراغ کے صحیح حالات و واقعات معلوم کر سکتے ہیں۔

اسلام کا اقتصادی نظام

تیسرا ایڈیشن

"ندوۃ المصنفین کی اس اہم، مفید، اور مقبول ترین کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن غیر معمولی اضافوں کے بعد وجود میں آیا ہے۔

$\frac{20 \times 26}{21 \text{ سطر}}$ مسطر کے باوجود کتاب کا حجم ۴۰۴ صفحات تک پھیل گیا ہے۔ اس دفعہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی معاشیات کے مفکرینِ خاص حافظ ابنِ حزم اندلسیؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ حافظ ابنِ قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ان نظریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو ان حضرات نے قرآن و سنت کی روشنی میں خالص معاشی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے پیش فرمائے ہیں۔ اسی کے ساتھ موجودہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی راس و اساس مسئلہ سود پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ حک و فک، حذف و اضافہ اور بہت سی دیگر خصوصیتوں کی وجہ سے اس کتاب کی حیثیت ایک جدید تالیف کی ہو گئی ہے۔ اسی لئے اسے مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین ۱۹۴۵ء کے سلسلہ میں رکھا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد صہ

مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

برہان

جلد ہفدہم   شمارہ (۲)

اگست ۱۹۴۶ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۶۶
۲۔ حدیث افتراقِ امت	جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی	۶۹
۳۔ اسبابِ کفر و جحود	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد	۸۷
۴۔ علم النفسیات کا ایک افادی پہلو	لفٹنٹ کرنل جناب خواجہ عبد الرشید صاحب آئی ایم ایس	۱۰۱
۵۔ مولانا نانوتویؒ سرسید کی نظر میں	جناب سید محبوب صاحب رضوی	۱۲۰
۶۔ ادبیات:۔		
منظرِ بہار	جناب ماہر القادری	۱۲۴
غزل	جناب آلم مظفر نگری	۱۲۵
۷۔ تبصرے	م ۔ ح	۱۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے برہان کی گذشتہ اشاعت کے نظرات میں ایک شدید علمی غلطی یہ ہوگئی کہ میرے قلم سے اندلس کی مرثیہ گوئی کے ذکر میں ابنِ بدرون کی جگہ بیاختہ "ابنِ زیدون" نکل گیا۔ میں نے "بیاختہ" اس لئے کہا کہ لکھتے وقت ذہن پر "ابنِ زیدون" کے نام کا استیلا اس درجہ تھا کہ میں لکھنا چاہتا تھا "ابنِ بدرون" لیکن قلم سے نکلا "ابنِ زیدون" اور پھر بھی خیال یہی رہا کہ میں نے "ابنِ بدرون" لکھا ہے۔ ممکن ہے عام بول چال کے مطابق آپ اس ذہنی کیفیت کو بدحواسی کہیں۔ بہر حال دماغی نفسیات کی اصطلاح میں اس کو (Obsession) کہتے ہیں۔ اس مرتبہ پریس والوں کی عنایت سے برہان کے پروف پڑھنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی اس بنا پر جہاں پرچہ میں طباعت و کتابت کی غلطیاں کثرت سے رہ گئیں مندرجہ بالا غلطی کی اصلاح بھی نہیں ہوسکی۔ میں ان سب کے لئے قارئینِ برہان سے معذرت خواہ ہوں۔

خدا ہی کو علم ہے اس نوع کی اور دوسری اس سے بھی فاحش اور شدید غلطیاں کیسی کیسی اور کہاں کہاں زندگی میں کتنی مرتبہ ہوئی ہیں لیکن اس وقت اپنی کتاب "وحی الٰہی" کی اس قسم کی ایک فروگذاشت یاد آگئی اسے بھی سن لیجئے۔ وحی الٰہی کی تصنیف کے دوران میں ایک مرتبہ خلف احمر اور حماد راویہ سے متعلق یاقوت حموی کی کتاب معجم الادباء سے بعض عبارتیں نقل کر رہا تھا ان عبارتوں کے ختم پر میں نے جلد اور صفحہ کا حوالہ لکھا لیکن لطف یہ ہے کہ بجائے معجم الادباء کے اسی مصنف کی دوسری کتاب معجم البلدان کا نام لکھا گیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ موخر الذکر کتاب جغرافیہ میں ہے اُسے اربابِ شعر و ادب کے حالات سے کیا واسطہ! جب کتاب چھپ کر سامنے آئی اور یونہی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ غلطی نظر سے گذری تو سخت ندامت اور شرمندگی ہوئی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا "قد جف

القلم بما ھو کائن" کا معاملہ تھا۔ اب کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ہی اس کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ گذشتہ نظرات میں عرض کیا گیا مولانا حالی کا شعر سنتے ہی فوراً راقم الحروف کے ذہن کا انتقال "مغربی" سے "ابن بدرون" کی طرف ہوا تھا لیکن اب مولانا محمد شیریں مغربی کے حالات اوران کے کلام کے مطالعہ کی نوبت آئی تو یہ خیال پختہ ہوگیا کہ مولانا حالی کی مراد انھیں سے ہے ابن بدرون کا احتمال بہت ہی ضعیف اور مرجوح نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے فاضل دوست مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم اسٹیٹ لائبریری رامپور نے اپنے ایک کرمنامہ میں مغربی کے متعلق ایک مفید اور پراز معلومات نوٹ لکھکر بھیجا ہے افادۂ عام کے خیال سے اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"دیوانِ مغربی کا ایک قلمی نسخہ ہمارے یہاں ہے۔ ناپ عام کتابی، صفحات ۱۴۲، اور فی صفحہ ۲۱ سطریں ہیں۔ ۱۱۵۹ ہجری میں سید ابراہیم علی المعروف بہ نظام الدین احمد المانکپوری نے مولوی سید شاہ رحمت اللہ صاحب کے لئے اسے لکھا ہے۔

مولانا محمد شیریں نام اور مغربی تخلص ہے۔ اس تخلص کے اختیار کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مغرب (مشرقی افریقیہ) کے کسی بزرگ نے انھیں خرقۂ خلافت عطا کیا تھا۔

یہ صوفی شاعر ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ اسمٰعیل سیسی کے مرید تھے، جو نورالدین عبدالرحمٰن اسفرائینی کے رفقا میں گنے جاتے ہیں۔

میران شاہ متوفی ۱۴۰۸ء کے متوسل تھے۔ جب ان کے دوست کمالِ خجندی کو میران شاہ کے دربار میں عروج حاصل ہوا، تو ان کی بات بگڑ گئی، چنانچہ ان دونوں شاعر دوستوں کی دوستی بھی دشمنی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر اشپرنگر نے فہرست کتابخانہائے شاہ اودھ میں لکھا ہے کہ مغربی نے فتوحات مکیہ پر عربی میں ایک حاشیہ اور جام جہاں نما کی شرح بھی لکھی تھی۔

تقی اوحدی نے اصفہان کے ایک گانو نائن کو مقامِ پیدائش بتایا ہے۔ مولانا جامی کے بیان کے مطابق سنہ ۸۰۹ھ (سنہ ۱۴۰۶ء) میں بعمر ۶۰ سال مغربی کا انتقال ہوا ہے، اس حساب سے سالِ پیدائش سنہ ۷۴۹ھ کے لگ بھگ ہوگا۔

مغربی کے حالات کے لئے، نفحات الانس جامی، حبیب السیر جلد ۳ جزو ۳ ص ۹۱، اودھ کیٹیلاگ، ص ۱۹، خلاصۃ الافکار، مجمع الفصحا ج ۲ ص ۳۰ تاریخ للافکار ص ۲۷۲ ید بیضا، مجالس العشاق، فہرست کتابخانہ بانکی پور پٹنہ، فہرست برٹش میوزیم، فہرست باڈلین لائبریری، فہرست انڈیا آفس لائبریری، فہرست برلین لائبریری، تقی اوحدی کی عرفات العاشقین، مجمع النفائس خاں آرزو، نشترِ عشق، ملاحظہ کی جائیں۔

مغربی کی تاریخ وفات اور مدفن میں بعض تذکرہ نگاروں کو اختلاف ہے مگر میں نے اکثریت کا فیصلہ نقل کیا ہے۔"

نومسلم انگریز مسٹر محمد اسد (Leopold Weiss.) صحیح بخاری کے انگریزی مترجم اور (Islam at the Crossroads.) کے مصنف کی حیثیت سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پہلے سے متعارف ہیں۔ موصوف کے ایک والانامہ سے پچھلے دنوں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ وہ اب "عرفات" نامی ایک انگریزی ماہنامہ جاری کر رہے ہیں جس کا مقصد اسلام کی تعلیماتِ حقہ کو غل و غش سے پاک کرکے پیش کرنا ہوگا۔ اربابِ ذوق و استطاعت مسلمانوں سے توقع ہے کہ وہ کم از کم "عرفات" کی خریداری قبول کرکے اپنے قابلِ احترام اور مخلص و بے غرض بھائی کی امداد کریں گے اور اس طرح انھیں اسلام اور مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ مفید خدمات انجام دینے کا موقع دیں گے۔ سالانہ چندہ ۸؍ اس پتہ سے طلب کیجئے۔

مینیجر "عرفات" ڈلہوزی۔ (پنجاب)

حدیث افتراقِ امت

(۴)

از جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

فرقۂ ناجیہ کی تحقیق ما انا علیہ و اصحابی — الجماعۃ — السواد الاعظم

درحقیقت یہی وہ مسطر ہے جس کو سرور کونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے تیار کیا تھا کہ صفحاتِ عالم پر آئندہ عقائد و اعمال کی جب کوئی سطر کھینچی جائے تو وہ اسی مسطر سے برابر کر لی جائے۔ مضمونِ بالا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا آپ کو آسان ہوگا کہ وہ جماعت کونسی ہے جس کو معیارِ حق و باطل قرار دیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ راسخ العلم جماعت ہے جو نہ تو الفاظ کی جکڑ بندیوں میں اتنی مقید ہے کہ عقل کو بالائے طاق رکھدے نہ عقل کے گھوڑے پر ایسی سوار ہے کہ آنکھ بند کر کے علم سلف کو پامال کرتی چلی جائے بلکہ علمِ صحیح اور فہمِ صحیح کی دو روشنیوں میں اس طریق کا پورا احترام رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا طریق تھا۔ اس راہ مستقیم پر نہ تو اختلافات کی کھائیاں ہیں اور نہ بغض و عناد کی پہاڑیاں بلکہ یہ وہ راہ ہے جس کے دن رات دونوں برابر ہیں لیلہا و نہارہا سواء۔

اختلاف کی تشریحات پڑھنے کے بعد اب یہ یقین کر لینا آپ کو آسان ہوگا کہ صحابہ کی جماعت میں کوئی اختلاف نہیں تھا وہ صرف فروعی مسائل میں جہاں ضروری سمجھتے اجتہاد کر لیتے تھے ان کے دور میں عمل ہی کا چرچا تھا اس لئے ایک مکمل دین کے جو طے شدہ مسائل تھے وہی مشغلہ ان کے لئے کافی تھا۔ فرضی مسائل، ذات و صفات کے مباحث سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اگر دین کے عملی حصہ کو صرف عمل کے لئے دیکھا جائے تو وہ آج بھی اتنا ہی مختصر اور صاف نظر آئیگا مگر افسوس تو یہ ہے کہ دورِ فتن نے بدنصیبی سے ہمارے

حصہ میں عمل کی بجائے اختلاف کا مشغلہ لگا دیا ہے۔

اختلاف امتی رحمۃ کی تشریح

یہ ایک ضعیف الاسناد[1] حدیث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس کی شرح میں علماء کے مختلف خیال ہیں قاسم بن محمد فرماتے ہیں۔

"کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے عملی اختلاف میں ہمارا یہ بڑا فائدہ رکھا ہے کہ اب اگر کوئی شخص ان میں کسی کے مطابق بھی عمل کرے تو اس کے لئے اتنی گنجائش نکل آئی ہے۔"

ابن وہب اس کی مزید تشریح نقل فرماتے ہیں:۔

"قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ مجھے خلیفۂ عدل عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول بہت پسند ہے کہ: مجھکو یہ تمنا نہیں ہوتی کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اگر کہیں مسائل دینیہ میں ایک ہی قول ہوتا تو بعض صورتوں میں لوگوں کے لئے وہ عملی تنگی کا باعث ہو جاتا لیکن اب ان کے اختلاف سے دین میں عمل کی مختلف راہیں نکل آئیں چونکہ وہ ہمارے مقتدی ہیں اس لئے اب اگر ان میں کسی کا قول اختیار کر لیا جائے تو وہ بھی دین کی ایک سنت پر عمل سمجھا جائیگا۔"[2]

اس کا بظاہر حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام چونکہ زیر سایۂ نبوت تربیت یافتہ تھے۔ شریعت کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے اور رعایت کرنے والے تھے اس لئے ان کے اختلاف کی وجہ سے ایک عمل کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں وہ سب دین ہی کی راہیں کہلائیں گی اور سب مقبول ہونگی اگر ان کے اختلاف کی بدولت ہمارے سامنے یہ مختلف صورتیں نہ آتیں اور ایک عمل کی ایک ہی

---

[1] صاحب مقاصد حسنہ فرماتے ہیں کہ حدیث "اختلاف امتی رحمۃ" کو بیہقی نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ طبرانی اور دیلمی اور ضحاک نے اس کو منقطع طور پر روایت کیا ہے۔ عراقی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف مرسل ہے۔ خطابی کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ بیضاوی کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث کو سبکی وغیرہ نے ذکر کیا ہے مگر محدثین کے طبقہ میں یہ حدیث معروف نہیں (الموضوعات ص ۹۱) ان چند نقول سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کا سندی پایہ کمزور ہے تاہم بے اصل بھی نہیں۔

[2] الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۶

صورت ہوتی تو بعض حالات میں اسی ایک صورت پر عمل کرنا دشواریوں کا موجب بن سکتا تھا۔ اس بنا پر ان کے اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب دین میں عملی وسعت ہوگا۔ امام شاطبیؒ کو یہاں ایک اور دشواری پیش آگئی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی کج فہم اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ حسب خواہش وہ جب چاہے، جس صحابی کا قول چاہے اختیار کر سکتا ہے یہ بالکل غلط ہے اس لئے فرماتے ہیں۔

"یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے ہر ہر مسئلہ میں جزئی جزئی مصلحت کے علاوہ ایک کلی مصلحت بھی ہے۔ جزئی مصلحت تو خاص اس مسئلہ کی دلیل اور حکمت سے ظاہر ہوتی ہے لیکن کلی مصلحت یہ ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقادی، قولی، عملی ہر پہلو میں آئینِ شریعت کا مقید رہے اور ایک سانڈ کی طرح آزاد نہ رہ سکے اس کی ہر ہر نقل و حرکت شریعت کے اشاروں پر ہو۔" [1]

اس کے بعد پھر قاضی اسمٰعیلؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اختلاف سے جو وسعت ہم کو حاصل ہوئی ہے وہ دین میں اجتہاد کرنے کی وسعت ہے کیونکہ ان کا اختلاف اس کی دلیل ہے کہ غیر منصوص مسائل میں انھوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس اجتہاد ہی کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کے مختلف افعال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہو گیا ہے۔" [2]

"ابن عبدالبر نے قاضی اسمٰعیل کی رائے پسند کی ہے اور اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔" [3]

قاضی اسمٰعیلؒ کا مطلب یہ ہے کہ گوناگوں واقعات اور مختلف حوادث کے لئے ہمیشہ نص صریح کا ملنا تو دشوار ہے اس لئے امت کے لئے دینی مسائل میں اجتہاد کرنا ایک ناگزیر مسئلہ تھا جس کے لئے

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ۱۳۱ - [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۳۲۔ [3] ج ۲ ص ۷۸ تا ۹۲)

متاخرین امت کو ابتدائی قدم اٹھانا بہت مشکل ہوجاتا جب صحابہ کرام میں اختلافات ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ اختلافات ان کے اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اب امت کے لئے بھی اجتہاد کا جواز نکل آیا، یہی وہ رحمت ہے جس کی طرف اختلاف امتی رحمۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اگر ان میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ ثابت ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ ہم سے پیشرو امت نے دین کے باب میں اجتہاد کیا ہے یا نہیں ان حالات میں ہمارے لئے از سر نو اجتہاد کا دروازہ کھولنا بہت مشکل تھا ادھر اجتہاد کرنا مشکل، اُدھر ہر جزئی مسئلہ میں نصِ صریح ملنا ناممکن۔ پھر دین کی مشکلات حل ہوتیں تو کیونکر ہوتیں۔ صحابہ کرام کے اختلاف نے ہماری یہ مشکل حل کردی اور اب عملی طور پر ہمارے لئے اجتہاد کا اسوہ حسنہ ثابت ہوگیا۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا یہ مطلب غلط ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہوار کے موافق صحابہ کے اقوال میں انتخاب کرلینے کا حق حاصل ہے کیونکہ اس کا مطلب تو بالفاظِ دیگر یہ ہے کہ شریعت کی کسی پر کوئی گرفت ہی نہیں کیونکہ بعض مرتبہ مسائل فروعیہ میں اختلاف نفی و اثبات کا اختلاف ہوجاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی عمل نفی و اثبات کے دائرہ سے عقلاً باہر نہیں رہ سکتا پس اگر اس تقدیر پر ہر شخص کو صحابہ کے افعال میں انتخاب کا حق حاصل ہوجائے تو اس کا جو عمل بھی ہوگا وہ یقیناً شریعت کے دائرہ میں کہلائے گا اور شریعت کا وجود و عدم برابر ہوجائے گا۔ اور آپ معلوم کرچکے ہیں کہ یہ سرے سے شریعت کے مقاصد کلیہ کے بالکل برخلاف ہے وہ انسان کو اتنا آزاد چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

تلاش کرکرکے صرف شرعی رخصتوں پر عمل کرنا فسق ہے

حافظ ابن حزمؒ اس پر تو اجماع نقل کرتے ہیں کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ [1]

بہرحال صحابہ کرام کے اختلافات دیکھکر اختلافِ امت کے رحمت ہونے کا مطلب خواہ صرف جواز اجتہاد کی حد تک ہو یا امت کے سامنے ایک عمل کی مختلف صورتوں کی وسعت بھی اس کے مفہوم میں داخل رہے۔ دونوں صورتوں میں صحابہ کرام کے اختلاف کی نوعیت، دوسری جماعتوں کے اختلاف کی نوعیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر شخص کو مختلف اقوال میں

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ۱۴۴۔

حسب دلخواہ انتخاب کا حق حاصل نہیں، اس کے ضوابط و قواعد مستقل ہیں۔ ہماری غرض یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ صحابہ کرام میں اصولاً تو کوئی اختلاف ہی نہ تھا ہاں فروعی اختلاف تھا مگر وہ ہمارے لئے باعثِ رحمت ہوا نہ کہ باعثِ تفریق و زحمت۔

مجتہدینِ امت کا اختلاف

مجتہدین کے دور تک عمل کی گاڑی اسی طرح مشترکہ طور پر کھنچتی رہی۔ شدہ شدہ بے علمی کا دور آیا۔ ادھر تکوینی طور پر کچھ اہلِ علم کسی خطہ یا جماعت میں روشناس ہوگئے۔ بے علم جماعتوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے پھر معاصر علما نے ان کا علم، خلوص و دیانت آزما کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اس طرح ایک زمانہ دراز تک اہلِ علم اور غیر اہلِ علم کی متفقہ آواز نے ان کو دنیا میں ایک غیر معمولی حیثیت دیدی ان کے فروع و اصول مکمل طور پر قلمبند کئے گئے اور بحث و تمحیص کے تسلسل سے دیگر مجتہدین کے بالمقابل ان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے دائرہ تلمذ کے مطابق ان کا مذہب اس مجموعی صورت میں پھیلتا رہا۔

تدوینِ دین میں فطری ارتقار

فطری ارتقا، احساسِ ضرورت، اور جذباتِ خدمت، کی بنا پر جس طرح قرآن صحف سے مصحف، مصحف سے مصاحف، اور مصاحف سے اعراب و سور و رکوعات کے مدارجِ ارتقائی طے کرتا چلا آیا اور بلا شبہ ان ارتقائی منازل کے بعد یہ قرآن وہی قرآن تھا جو دورِ اول میں موجود تھا۔

سنت میں ارتقار

اسی طرح سنت کے بھی ارتقائی دور ہیں، گو قرآن و سنت کے مراتب کے لحاظ سے عملِ انسانی کو یہاں کچھ زیادہ آزادی حاصل ہوئی اس لئے وہ دورِ صحابہ سے گذر کر دورِ مجتہدین میں اور منضبط ہوئے پھر اس انضباط میں کچھ اور ترقیات ہوئیں اور ایک زمانہ تک حدیث و فقہ ایک ہی جگہ مدون چلتی رہی۔ اسی احساسِ ضرورت نے پھر مجبور کیا کہ دونوں فن علیحدہ علیحدہ کر دیئے جائیں شروع میں صرف یہ قدم بھی نیا اور قابلِ اعتراض معلوم ہوا، آخر کار اس کے فوائد دیکھکر تمام دنیا نے اس کو مانا اور تمام علما کی یہی متفقہ پالیسی بن گئی۔

فقہی ارتقار اس فطری ارتقاء اور تکوینی اسباب کے ماتحت لاکھوں اہلِ علم اور کروڑوں انسانوں میں

یہ دین بہ حیثیتِ مجموعی سفر کر رہا ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کا نام تم شافعیت وحنفیت رکھ کر دنگل قائم کر دو، یا اسے انحطاطِ دور کے لحاظ سے قدرت کی ایک اعانت تصور کر لو، جس نے تمہاری سہولت کے لئے، تمہاری ضرورت کے بقدر مرتب شدہ دین تمہارے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

حنفیت وشافعیت کے اختلاف کی حقیقت

حنفیت وشافعیت کا اختلاف بھی دین میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے نہ یہ اختلافِ اہوا پر مبنی ہے نہ اتباعِ متشابہات کا نتیجہ ہے، نہ علمِ سلف سے بے خبری اُس کی بنیاد ہے بلکہ "اختلاف امتی رحمۃ" کا وہ حصہ ہے جو ہر زمانہ میں بقدرِ ضرورت امتِ مرحومہ میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اگر نااہلوں اور بے علموں نے اُس کو پارٹی بندی کا ذریعہ بنا لیا ہے تو یہ قصور اُن کا ہے۔

ما انا علیہ واصحابی کی تحقیق

اس کے بعد ہمیں عنوانِ بالا پر غور کرنا ہے۔ بظاہر یہاں آپ کا جواب سوال کے پورا پورا مطابق نظر نہیں آتا۔ صحابہ کا سوال فرقۂ ناجیہ کے متعلق تھا آپ کا صاف جواب "انا واصحابی" ہونا چاہئے تھا یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ بلاشبہ اُس وقت فرقۂ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اور اگر اس سے بڑھ کر کوئی آئین کی بتانا مقصود تھا۔ تو وہ کتاب و سنت ہے بلکہ "ما انا علیہ واصحابی" کا حاصل بھی یہی ہے پھر آپ کے اصحاب کا طریقہ آپ کے طریق کے سوا کوئی اور طریق نہیں تھا اس کے مستقل طور پر بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہونی چاہئے۔

ان سوالات کے حل کی طرف جب انسان توجہ کرتا ہے تو اس کو صاحبِ نبوت کے ایک ایک لفظ کا کمال کھلتا چلا جاتا ہے بیشک متبادر یہی تھا کہ جواب "انا واصحابی" ہوتا مگر یہاں سائل کا مقصود اس کے زمانہ کی جماعتِ حق کی تعیین نہ تھی وہ دورِ فتن میں حق جماعت کی تعیین کا طالب تھا اگر اُسے آپ صرف کتاب و سنت ہی کا معیار بتاتے تو یہ جواب اُس دور کے مناسب حال نہ ہوتا جس میں ہر باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہی کتاب و سنت کا حامل ہے اس لئے یہاں آپ نے وہ فیصلہ کن آئین بتانا چاہا ہے جو اس زمانہ کے بھی مناسب حال ہو، وہ صرف کتاب و سنت نہیں بلکہ اُس کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے اپنے صحابہ کے سامنے بطریق

اسوہ پیش فرمائی تھی، صحابہ کرام نے اُس کے ایک ایک خط و خال کو دیکھا اور ہو بہو اس کی نقل کی۔ اب ادہر یہ اسوۂ حسنہ اُدہر اس کا وہ مکمل نقشہ تھا۔ پوچھنے والوں کے لئے اس سے زیادہ صاف بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو صراطِ مستقیم کو دریافت کرنے آتا اُسے آنکھوں سے دکھا دیا جاتا اور زبان سے سمجھا دیا جاتا کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے اس لئے یہاں افراد و اشخاص کی بحث چھوڑ کر اُن اوصاف کو بتلا دیا گیا ہے جو فرقۂ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لئے کارآمد ہوں۔

الفاظ میں احتمالات باقی رہتے ہیں اس لئے فیصلہ کن ان کی صورت عملی ہو

اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دورِ فتن میں کچھ ایسا تعصب نمودار ہو جاتا ہے کہ اُس زمانہ کی کٹ حجتی ختم کرنے کے لئے صرف الفاظ کافی نہیں ہوتے، یہاں حقیقت و مجاز، عموم و خصوص کے احتمالات پیدا کر دینے کا سہارا باقی رہتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو ٹوک عمل ہی وہ کھلی ہوئی شریعت ہے جس میں یہ احتمالات نہیں چلتے۔ اسی لئے دورِ فتن کا بنیادی مسئلہ اسی تفصیلی شریعت کا انکار ہوا کرتا ہے۔ قرآن کریم سے زیادہ لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور حدیث سے زیادہ فقہ کا

صحابہ کرام پر آپ کا مکمل اعتماد

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے تو اس کی وجہ بظاہر اس کامل اعتماد کا اظہار کرنا ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کی فہم پر حاصل تھا۔ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں کسی مافوق العادت امر کا تذکرہ ہوتا جیسے حیوانات کا تکلم تو آپ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی غیر حاضری میں یہ کلمات فرما دیئے ہیں "آمنت انا وابوبکر و عمر" میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی اس پر ایمان لائے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے ان کے ایمان کی شہادت دینا یہ اُن پر کمال وثوق کی طرف ہی اشارہ تھا۔

صحابہ کے بعض افعال کی صورت گو عہدِ نبوت میں نہ ملے مگر وہ مقاصدِ شریعت کے تحت ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعض اعمال کی صورت گو دورِ سنت میں ہمیں نظر نہ آئے مگر مقاصدِ شریعت کے لحاظ سے اس کا عین شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن دورِ فتن میں صحابہ کے متعلق یہ حسنِ ظن قائم رہنا مشکل ہے۔ اس لئے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے ان کے طریق کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے

۷۶

مثال کے طور پر تراویح کا مسئلہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تراویح کی یہ اجتماعی صورت جو آج ہمارے دور میں رائج ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس اجتماعی صورت کو شروع کیا۔ اس وقت طبائع میں کتنی سلامتی، کتنا اتحاد، کتنی یکسوئی، کتنا انقیاد تھا کہ سب نے اس کی اتباع کی اور کوئی اختلافی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ یہ درست تھا کہ تراویح کا یہ دور آپ کے زمانہ میں نہ تھا مگر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس التزام جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھنے سے جو بات مانع آئی تھی وہ صرف یہ کہ ماہِ رمضان کا مبارک مہینہ، نزولِ وحی کا دور موجود، اس میں صحابہ کرام کا پرخلوص اجتماع اگر اسی طرح مسلسل ہوتا رہا تو اس کا بہت امکان تھا کہ یہ اجتماعی ہیئت جو اب تک اختیاری تھی آئندہ لازم قرار نہ دیدی جائے اور جب ان بادہ نوشوں کا دور ختم ہو تو آئندہ جام وسبو کی یہ گردش کہیں بار نہ ہو جائے اس لئے حضرت عمر فاروقؓ کو جب دیگر مہماتِ اسلام سے فرصت ملی تو فوراً تراویح کے باجماعت ادا کرنے کی ترغیب دی کہ اب وحی بند ہو چکی تھی۔ اور وجوب کا کوئی احتمال نہ تھا اس کی ایک مثال نہیں بہت سی مثالیں ہیں کہ صحابہ کے دور کا کوئی عمل گو صرف اپنی صورت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظر نہ آئے لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپ کے منشاء کے اتنا مطابق ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما ہوتے تو یہی فرماتے یہ ہمارا حسن ظنی نہیں بلکہ عہد مبارک ہیں۔

قرآن کا حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کرنا ان کے دینی مزاج شناسی کی دلیل تھی

خود وحی الٰہی کی حضرت عمرؓ کی باربار تصویب کرنا اس بات کی کھلی ضمانت تھی کہ آئندہ بھی ان کی اصابت رائے امت کو تسلیم ہونا چاہئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو موجودہ بے احتیاطیوں کو دیکھکر عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کر دیتے اس اختلافِ صورت اور اتحادِ مقصد کے پیش نظر مناسب ہوا کہ "ما انا علیہ" کے ساتھ ساتھ "واصحابی" کا لفظ اور اضافہ کر دیا جائے۔

منصب تشریع اور منصب اجتہاد کی تقسیم

خالق نے اپنے رسول کو منصب تشریع سے نوازا تھا۔ اس کے

رسول نے اپنے صحابہ کو منصبِ اجتہاد سے نواز دیا اور اس طرح جو نعمت رسول کے حصہ میں آئی تھی امت کا بھی اس میں ایک حصہ لگ گیا۔

السواد الاعظم ۔ الجماعۃ ۔

ان الفاظ کی تفسیر میں صاحب اعتصام نے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں ہمارے خیال میں حدیث کے گذشتہ الفاظ ہی اس کی تشریح کے لئے کافی ہیں یعنی جماعت اور سوادِ اعظم سے وہی جماعت اور وہی سوادِ اعظم مراد ہے جو ماانا علیہ واصحابی (یعنی کتاب وسنت کی متبع) ہے۔ اگر ان پر سہ الفاظ کا خلاصہ نکالو تو یہ ہوگا کہ اہلِ حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو اور نہ صرف یہی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے طریق کا بھی احترام کرنے والی ہو اگر کوئی جماعت صرف آپ کے طریقہ کا احترام کرتی ہے لیکن صحابہ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ ان الفاظ کے حدود سے باہر ہے دورِ فتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے مابین تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے۔

خدائے قدوس اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اور رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے مابین تفریق کا روادار نہیں

اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اسی طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ انتہائی نادانی اور کجروی ہے کہ جو جماعت امت اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہے، اس کے اقوال وافعال کو ہم تک پہنچانے والی ہے، اسی پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر خدا کا رسول خود اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے، بادشاہوں سے اور قبائل کفار سے گفت وشنید اُن ہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت ان پر اعتماد نہ کرے۔ ایک عالمگیر دین جس جماعت سے نکلتا ہے اگر وہی جماعت ناقابلِ اعتماد ہے تو پھر آئندہ دور میں اُس دین کا خدا حافظ۔

اسوۂ صحابہ کی اہمیت

اسی اہمیت کے پیشِ نظر الفاظِ بالا میں صحابہ کرام کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدا تعالیٰ کے طریقہ سے علیحدہ نہیں ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں اس لئے فرقہ ناجیہ کی ایک

بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو بہ حقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی و احترام کی قائل ہو بلکہ اس پر گامزن بھی ہو۔ خوارج نے صرف سنتِ رسول کو لیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھیرایا یہی ان کے ناحق ہونے کی پہلی علامت تھی اور اسی کی طرف حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی اپنے کلام میں اشارہ فرمایا تھا۔

حواریین اور صحابہ کرام کا مقابلہ عیسائیوں کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت سے مقابلہ کرتے ہیں ناکامی رہی۔ اسی طرح حواریین اور آپ کے صحابہ کرام کے مقابلہ میں بھی ناکامی رہی ہے بلکہ ان کو حسرت ہے کہ اگر کہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری بھی آپ کے صحابہ کی طرح جانباز اور اتنے ہی فداکار ہوتے تو اس طرح مسیحی دین صدیوں گمنامی کے عالم میں پڑا نہ رہتا۔

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب عروۃ قریش کی جانب سے شرائطِ صلح پر گفتگو کے لئے آتا ہے تو جن الفاظ میں صحابہ کی وفاداری کا نقشہ اس نے خود قریش کے سامنے کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک کافر کے قلب پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا وہ کہتا ہے۔

"کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن جو والہانہ عقیدت کا منظر یہاں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو گردنیں جھک جاتی ہیں اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ نظر بھر کر کوئی شخص ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا بلغم زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ وہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔"

اسی لئے اس قوم کا احساسِ خودداری و وفاشعاری کی داستانیں پڑھنے والے مسلم و کافر اس پر متفق ہیں کہ اس سے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کیا۔

صحابیت کا احترام نجات کی علامت ہے الغرض چونکہ ایک صحابیت کے احترام ہی کا مخالف ہونا مقدر تھا اس لئے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت صحابیت کا وقار و احترام بھی قرار دیدیا گیا ہے

جو اُس کا احترام نہیں کرتا وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا احترام نہیں کرتا۔[۱]

شانِ اجتماعِ حق کی بینت ہے دوسری علامت جماعت کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتی ہے کہ ان میں شان جمعیت و وحدت نمایاں ہونا چاہیئے۔ افتراق و تشتت بغض وعناد اُن سے دور دور رہنا چاہیئے اور سوادِ اعظم کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ افراد ایسے موقر ہونا چاہئیں کہ ان کا وجود ایک جماعت کی شکل میں بھاری باشوکت اور بارعب نظر آئے۔

چنانچہ عبداللہ بن مبارک سے جب دریافت کیا کہ وہ جماعت کون ہے تو جواب میں ابوبکرؓ وعمرؓ سے شروع کرکے محمد بن ثابت اور حسین بن واقد کے دور تک پہنچ گئے جب ان سے کہا گیا کہ ان حضرات کی تو وفات ہوگئی تو فرمایا کہ پھر ابوحمزہ السکری[۲]۔[۳]

افراد کی اکثریت معیارِ صداقت نہیں یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے غور کرنا چاہیئے کہ دورِ فتن میں اہلِ حق کی اکثریت کب ہوسکتی ہے۔ پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دیدینا اور بھی نافہمی ہے۔ اگر آج ایک طرف بے دینی۔ دہریۃ مذہبی حریتہ۔ فواحش و منکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دیکر فرقۂ ناجیہ کا مصداق ٹھہرالے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح اختلاف کی بحث میں بتایا جاچکا ہے کہ اختلاف سے عقائد کا اصولی اختلاف مراد ہے۔ اسی طرح "ما انا علیہ واصحابی" میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عقائد کے اصول ہی مراد ہیں، ہر بحث وجدل کے موقعہ پر اس حدیث کو پڑھنا درحقیقت حدیث کی توہین کرنا ہے۔ حدیث لا تجمع امتی علی ضلالۃ اگر بلحاظِ سند درست ہو تو اس کی مراد بھی یہی ہے کہ امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ اس میں حق پر کوئی باقی نہ رہے اور سب گمراہی پر متفق ہوجائیں بلکہ ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ یہاں بھی اکثریت کا فیصلہ مذکور نہیں ہے۔ دنیا میں اکثریت ہمیشہ حق کے خلاف ہوتی ہے مگر اس کی حقانیت کی یہ دلیل ہے کہ غلبہ آخر کار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

---

[۱] دیکھو مقدمۂ اصابہ فصل ثالث۔ [۲] ان کا اسم مبارک محمد بن میمون مروزی ہے۔ [۳] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۲۲۶-

اسی مضمون کو صحیح بخاری میں بالفاظ دیگر یوں ارشاد فرمایا ہے۔

لن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی اللہ

لایضرھم من خالفھم حتی یأتی امر اللہ

حدیث لن تزال کا مصداق

روایتِ بالا میں ھذہ الامۃ کا لفظ ہے مگر عمرو بن ھانی کی روایت میں " طائفۃ من امتی " اور یزید بن اصم کی روایت میں " عصابۃ من امتی " کا لفظ ہے جس کا یہ منشا ہے کہ یہ اوصاف جمہور امت کے نہیں بلکہ اس امت میں صرف ایک طائفہ وجماعت کے اوصاف ہیں۔ بلکہ ابن حزم تو یہ کہتا ہے کہ طائفہ لغتِ عرب میں بعض شئے کو کہتے ہیں اس لئے طائفہ کا اطلاق ایک شخص پر بھی آسکتا ہے۔

والطائفۃ فی لغت العرب یقع علی الواحد فصاعداً۔ [1]

امام بخاری جزم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ طائفہ اہلِ علم کا طائفہ ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اہلِ حدیث ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امام احمد کی مراد اہلِ سنت ہیں ان تینوں الفاظ کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ اہلِ حدیث اور اہلِ علم اور اہلِ سنت ایک ہی معنی کی مختلف تعبیریں ہیں بعض نافہم اس کو بھی اختلاف سمجھ لیتے ہیں۔ صاحب موافقات نے جلد رابع میں اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے

اقوال مفسرین اور الفاظ شارحین حدیث میں اکثر اختلاف عبارت ہوتا ہے اُسے اختلاف حقیقت نہ بنانا چاہیے۔

ماکان ظاھرہ الخلاف ولیس فی الحقیقۃ کذلک واکثر مایقع ذلک فی تفسیر الکتاب والسنۃ فتجد المفسرین ینقلون عن السلف فی معانی الفاظ الکتاب اقوالا مختلفۃ فی الظاھر فاذا اعتبرتھا وجدتھا تتلاقی۔ [2]		یعنی جہاں ظاہر میں اختلاف نظر آئے اور درحقیقت اس میں کوئی اختلاف نہ ہو، یہ صورت زیادہ تر کتاب وسنت کی تشریحات میں نظر آتی ہے تم دیکھو گے کہ مفسرین قرآنِ کریم کے الفاظ کی شرح میں مختلف تعبیرات نقل کرتے ہیں لیکن جب ان کو بغور ملاحظہ کرو گے تو ان سب کا نقطہ نظر ایک ہی بات ہو گی صرف الفاظ مختلف ہوں گے۔

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۰۹۔ [2] ج ۱ ص ۲۱۴۔

حافظ ابنِ تیمیہؒ نے بھی اس کو مفصل لکھا ہے۔ دیکھو توجیہ النظر۔

بہرحال یہ ایک طویل بحث ہے ہم نے یہاں ضمنی فائدہ کے طور پر صرف تنبیہ کردی ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو دین میں اختلافات کا بہت بڑا باب جو ہماری نافہمی سے اختلاف کی صورت میں نظر آرہا ہے بند ہوجاتا ہے۔ ماانا علیہ واصحابی۔ الجماعۃ۔ السواد الاعظم۔ اسی سلسلہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی سوادِ اعظم اور جماعۃ سے وہی طائفہ مراد ہے جس کو مذکورہ بالا روایت میں ذکر کیا گیا ہے اُس طائفہ کے اوصاف پر غور کرنے سے اس کے سوادِ اعظم فرمانے کی وجہ بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔ حدیث بالا یہ کہتی ہے کہ مختلف رکاوٹوں اور ناسازگاری ماحول کے باوجود وہ جماعت خدا کے دین پر قائم رہے گی اور بلحاظ اپنے عزم واستقلال دوسروں پر اتنی بھاری ہوگی کہ مخالفین کی مخالفت ان کو اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے گی۔ گویا اگر ایک طرف تکوینی طور پر فرقہ منحرفہ کی یکثرت رہے گی تو دوسری طرف ایک طائفہ ایسا بھی ضرور باقی رہے گا جو اقلیت میں ہو کر بھی اپنی شانِ جمعیت اور عزم واستقلال کی وجہ سے کبھی اکثریت سے مرعوب نہ ہوگا۔ لہ

لہ **نبوۃ ختم ہوچکی اس لئے امت کو عام گمراہی سے محفوظ رہنا چاہیے** — جس امت میں نبوت ختم ہوچکی ہے اُس امت میں نبوت کی خدمات انجام دینے کے لئے ایک طائفہ مقدر ہونا چاہیے جو ان فرائض کو انجام دیتا رہے اور جس طرح کہ نبی وقت تن تنہا ہونے کے بعد بھی کفر کا مقابلہ کیا کرتا ہے اب اس جماعت کو باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور جس طرح کہ تمام روئے زمین کی مخالفت اُسے اپنی جگہ سے ایک انچ جنبش نہیں دیسکتی اسی طرح زائغین اس طائفہ کے قدم بھی دینِ متین سے متزلزل نہیں کرسکتے

طائفہ میں امتی کا وجود جماعتی شکل پر ہونا ضروری نہیں ہے — حافظ ابنِ حجر تصریح فرماتے ہیں کہ اس طائفہ کا ایک جگہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے بلکہ جو افراد بھی اپنی اپنی جگہ منتشر طور پر احیاءِ سنت میں مشغول ہوں وہ شرعی نظر میں سب ایک جماعت اور اسی طائفہ کے افراد کہلائیں گے۔ لہذا یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ اجتماعی شکل میں کسی گوشہ یا کسی خاص خطہ میں یکجا موجود ہوں۔

مجددین کی اجمالی تشریح — جیسا کہ ہر صدی پر مجددین کی آمد کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ مجدد کا فرد واحد ہونا ضروری ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ دین کی مختلف ضروریات کی تجدید شخصِ واحد کی بجائے ایک طائفہ سے حاصل ہوجائے اور بہ حیثیتِ مجموعی یہی طائفہ مجدد دین کہلائے۔ (دیکھو فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۲)

اب سوچو کہ فرقۂ ناجیہ کی اس سے زیادہ صاف تشریح اور کیا ہو سکتی تھی اور اسی لئے جب تک عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ باقی رہا یہ اختلافات بھی رونما نہ ہوئے لیکن جونہی کہ آپ کا عہدِ باسعادت

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) یہ تو واقعی بھی ایک مصیبت عظمیٰ ہے کہ عوام اور بعض خواص خود اپنی جانب سے کسی حدیث کی کوئی شرح سمجھ لیتے ہیں اور جب اس کے خلاف کوئی حقیقت سامنے آتی ہے تو اس سے کان کھڑے کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ بات اپنی جگہ بالکل صاف ہوتی ہے۔

امت کا پہلا مجدد بعض اشخاص پر مجدد کے لقب کی شہرت نے یہ تخیل پیدا کر دیا ہے کہ مجدد گویا بزرگی کا کوئی منصب ہے حالانکہ امت نے سب سے پہلے یہ لقب خلیفہ عدل عمر بن عبد العزیزؒ کے لئے استعمال کیا تھا۔ پھر اس کے بعد امام شافعیؒ کے متعلق کہا گیا ہے اسی طرح آیندہ بھی تخمینی طور پر یہ لقب جاری رہا ہے۔ بہر حال مجددین کے لئے نہ دعویٰ کرنا ضروری ہے نہ اس کا ایک فرد میں انحصار ضروری ہے بلکہ آخری دین کی یہ مختلف اصلاحی صورتیں ہیں جو تکوینی طور پر، کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی، صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مجدد دین۔ طائفۃ من امتی۔ ما انا علیہ واصحابی ہے۔ السواد الاعظم سب اسی کے شعبے ہیں بات ایک ہے لفظ مختلف۔

اصلاح دین کا تکوینی نظام صحیح بخاری میں اس روایت کے ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا وجود تکوینی ارادہ کے ماتحت ہے۔ اختلاف کے نئے سے نئے شاخسانے دنیا میں رونما ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی نئی سے نئی تدبیر قدرت پیدا کرتی رہے گی اسی خیر و شر کے ہنگامہ کا نام عالم اختلاف ہے جسے دنیا کہتے ہیں۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین	جس کے متعلق خدا خیر کا ارادہ کرتا ہے اُسے
ولن یزال امر ھذہ الامۃ مستقیما	دین میں سمجھ دیدیتا ہے اور اس امت کا دین ہمیشہ
حتی تقوم الساعۃ الخ	مستقیم رہے گا یہانتک کہ قیامت آجائے گی۔

دین کی استقامت کے لئے دین کی سمجھ ضروری ہے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدین ارادۂ الٰہیہ کے ماتحت نصیب ہوتا ہے، کسب کا ثمرہ نہیں اسی طرح دین کی استقامت کی راہیں بھی تکوینی ہیں۔ بے شک جس دین میں ختم نبوت مقدر ہو چکا ہے اس میں بقاءِ استقامت کی بشارت اور اس کے تکوینی انتظامات کی خبر بھی ضروری امر تھا۔

کرمانی شارح بخاریؒ فرماتے ہیں کہ الفاظِ بالا سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ استقامت میں تفقہ فی الدین داخل ہے اور اسی ارتباط کی وجہ سے حدیث میں دونوں باتیں ایک سیاق میں ذکر کی گئی ہیں۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۰)

اور صحابہ کا دورِ مسعود ختم ہوا تو "ما انا علیہ واصحابی" کی وہی کھلی ہوئی بات اب ایک معمہ بن کر رہ گئی حتیٰ کہ جس قدر اس زمانہ کو بعد ہوتا گیا اختلافات کی خلیج اسی قدر زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ لہٰذا ہر باطل سے باطل اور منحرف سے منحرف بھی دعویٰ کر رہا ہے کہ ما انا علیہ واصحابی کا مصداق وہ ہے لیکن اب وہاں نہ صحابہ ہیں نہ ان کے دور کے دیکھنے والے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایک جماعت خدا کی صفات کی ہی سرے سے منکر ہے اور خالص توحید اسی کا نام رکھتی ہے معتزلہ مدعی ہیں کہ اہل توحید و عدل وہی لوگ ہیں مشبہ چیخ رہے ہیں کہ صفات پر صحیح ایمان صرف ان کو حاصل ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل میں وہی قرآن و سنت ہے غرض ہر ایک کا گمان یہی ہے کہ فرقہ ناجیہ اسی میں منحصر ہے بہرحال صحیح صورتِ عمل مخفی ہونے کے بعد اب یہ مشرح الفاظ بھی صرف ایک رسہ کشی کا میدان بنے ہوئے ہیں اسی کو سورۂ روم میں ارشاد فرمایا تھا۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔

منحرف جماعتیں دعویٰ حقانیہ میں دلیر ہوتی ہیں

گویا منحرف جماعتوں کا یہ بھی ایک خاصہ بن کر رہ جاتا ہے کہ غور و تفکر کی بجائے انھیں صرف اپنی حقانیت کا زعم باطل ہو جاتا ہے۔ عالمِ اختلاف کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھکر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے۔ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ یعنی یہ اختلاف اسی طرح باقی رہے گا اور بساطِ عالم کو اسی اختلاف کے لئے بچھایا بھی ہے۔

حدیث قرطاس میں ایک انوکھی تنبیہ

اسی لئے شاید وفات کے وقت کوئی ایسی بات آپ لکھتے لکھتے رہ گئے تھے اگر کہیں وہ لکھدی جاتی تو امت میں مستقل اختلاف کا خطرہ مٹ جاتا۔

ھلم اکتب لکم کتابا لاؤ تمہارے لئے ایک ایسی بات لکھدوں کہ

لن تضلوا بعدہ اس کے بعد پھر کبھی گمراہ نہ ہو سکوگے۔

اگر کہیں یہ کتاب قیدِ کتابت میں آجاتی تو ممکن تھا کہ امت کی امت لا یزالون مختلفین سے نکل کر سب الا من رحم ربک کے نیچے داخل ہو جاتی مگر آخرکار تقدیر غالب آئی اور ایسے حالات

رونما ہو گئے کہ یہ تحریر وجود میں نہ آسکی۔ [1]

تقدیر ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں کا ساتھ نہیں دیتی

ایک مرتبہ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ شب قدر کا صاف صاف علم بتا دیا جائے مگر مسجد نبوی میں کچھ شور برپا ہو گیا آخر وہ علم بھی اسی طرح مستور رہ گیا یہاں بھی کچھ قصد مبارک تھا کہ لاؤ کوئی ایسی بات بتلادی جائے کہ آئندہ تفرقہ کا اندیشہ ہی نہ رہے مگر یہاں بھی کچھ شور ہو گیا آخر کار وہ نوشتہ جوں کا توں رہ گیا۔ عالم تقدیر و تکوین کا یہ تماشہ بھی قابلِ دید ہے کہ اگر کبھی عالم تدبیر نے کبھی وحدت و اجتماع کے لئے زور لگایا بھی تو اسی وقت پردۂ غیب کے کسی اندرونی ہاتھ نے اس کا سارا کھیل بکھیڑا برباد کر دیا ہے۔ یہاں پہنچکر قلم بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ قلم اینجا رسید سر بشکست۔

تقدیر اسباب کے پردہ میں نمایاں ہوتی ہے

خیر و شر دو متضاد قوتیں ہیں جب ایک ابھرے گی تو دوسری مغلوب ہو جائیگی قدرت خود انھیں زیر و زبر کیا کرتی ہے۔ بندۂ اسباب یہاں شکست و فتح کی دھن میں لگا رہتا ہے وہاں یہ منظور ہی نہیں کہ میدان کسی فریق کے بھی یکطرفہ ہاتھ آجائے اس لئے شکست و فتح کا ڈول باری باری کھنچتا ہی رہتا ہے اور یہ بازی اس وقت تک برابر کھیلی جائے گی جب تک کہ عالم اختلاف کو آباد رکھنا ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض۔

گویا نظام قدرت کی طرح یہ بھی اس کا ایک نظام ہے کہ وہ صوامع و بیع و مساجد کے اختلاف کو بساطِ عالم پر سجائے رکھے اور اگر کوئی طاقت اس کے برخلاف ابھرے تو اس کے مقابلہ کے لئے خود سامنے آکر ان کو ایسے حدود پر روک دے جس کے بعد کسی کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگے اس اختلاف کی آبادی کے لئے دنیا مشغولِ جنگ رہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ جنگ اسبابِ موت ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اسبابِ بقا یہی ہے ہاں اگر قدرت کا ہاتھ نہ ہوتا تو اب تک ایک پارٹی نے غلبہ پا کر دوسری کو فنا کر دیا ہوتا اور چونکہ عالمِ اختلاف کی فطرت کے خلاف اس کو جینے کا حق نہیں ہے اس لئے اُسے بھی فنا ہونا پڑتا یہ واضح رہنا چاہئے کہ عالمِ تشریع و عالمِ تقدیر کے مابین ہمیشہ مطابقت ضروری نہیں ہے۔

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۸۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام برادرانِ یوسف کو چشم زخم نہ لگنے کی تدابیر کئے جائیں گے مگر تقدیر نے جس کے مقدر میں جیل خانہ لکھ دیا ہے وہ جیل جاکر رہے گا۔

حدیث کی صاف صاف تشریح کے بعد اختلاف عالم تکوین کے ماتحت ہے

الحاصل اگر "ما انا علیہ واصحابی" کے صاف صاف بات ہونے کا آپ یہ مطلب سمجھے تھے کہ اس فیصلہ کے بعد اختلاف کا تخم ہی دنیا سے مٹ جائے گا تو آپ نے غلط سمجھا تھا اور اگر شریعت کے سر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے فرقۂ ناجیہ کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کی تو یہ اس سے زیادہ غلط سمجھے ہیں۔ عالمِ تشریع بصائر یعنی کھلی کھلی باتیں آپ کے سامنے بیان کرتا رہے گا۔ مگر عالمِ تکوین شبہات کے گرد اڑا اڑا کر اس کو تاریک و مکدر بناتا رہیگا آپ سلسلۂ اسباب میں راہِ حق تلاش کرنے کی تگ و دو جاری رکھئے اگر آپ کا نام "الا من رحم ربک" میں درج ہو چکا ہے تو جو راہ سب سے زیادہ صاف آپ کو نظر آئے گی وہ یہی "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ ہوگی اور خدانہ خواستہ اس فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے تو ایک تنکا بھی آپ کو پہاڑ معلوم ہوگا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ	سو جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ	ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے اور جس کو چاہتا ہے کہ
اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا	گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو بے نہایت تنگ
حرجاً کانما یصعد فی السماء۔	گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تدبیر کو چھوڑ کر آپ کو تقدیر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں بلکہ اختلاف کا مفہوم، اس کے اسباب فرقہائے منحرفہ کی شناخت پر تا مقدور بحث کرکے آخر میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہاں اختلاف کے ان اسباب ظاہر کے ساتھ خاص طور پر اس کا ایک تکوینی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے ولذلک خلقھم سے اشارہ فرمایا ہے اور اسی لئے اس افتراق کو دیکھکر یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حدیث کے قصور بیان کا ثمرہ ہے۔ بیان تو اتنا واضح ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے مگر چونکہ خطابِ تکلیف علیحدہ ہے اور خطابِ تقدیر علیحدہ اس لئے کبھی کبھی ایک صاف بات بھی چیستان بن کر رہ جاتی ہے اگر آج بھی کوئی شخص "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے دروازے

کھلے ہوئے ہیں پس اشکال یہ نہیں ہے کہ فرقۂ ناجیہ مبہم ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے دریافت کے جو اسباب ہیں خواہشِ نفس اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ بقول اکبر مرحوم

اللہ کی راہیں سب ہیں کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو بحث یہاں کی گئی ہے وہ خدیثی مذاق کے موافق کی گئی ہے ایک مؤرخ کو حق ہے کہ وہ تاریخ کے مطابق اسباب اختلاف بتائے۔ اصحابِ تاریخ کا خیال ہے کہ ابتدا میں سیاست و مذہب مدغم تھے، اس لئے سیاسی تحریکات سب مذہبی رنگ میں ہی نمایاں ہوتی تھیں اس وقت ان دونوں عناصر کی تحلیل بہت ہی مشکل تھی پھر جب قومیت نے مذہبی جذبات کی روح حاصل کرلی تو اس وقت سے سیاست کو مذہب کا جامہ پہننے کی ضرورت نہ رہی اس لئے مورخین نے مذہبی اختلافات کو سیاسی اختلافات کی بنیاد قرار دیا ہے مگر بنظر غور اگر آپ اس بنیاد کی بھی کوئی بنیاد تلاش کریں گے تو وہ یہی اسباب پائیں گے جس کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تازہ ترین علمی و ادبی تصنیف

غُبارِ خاطر

مولانا کے علمی و ادبی خطوط کا دلکش اور عنبر بیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں اپنے علمی محبِ خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے، اس مجموعے کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمع فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے۔ اِن خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گرد پوش چار روپے۔

مکتبہ برہان دہلی۔ قرول باغ

اسبابِ کفر وجحود

(جو قرآن مجید میں بیان ہوئے)

پہلا سبب۔ تقلیدِ آباؤ اکابر وغیرہ

(۲)

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

اب قرآن مجید کی اُن آیات پر غور کیجئے جن میں تقلیدِ پیشینیاں کی مضرت بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ	اور جب کہا جاتا ہے انھیں کہ پیروی کرو اُس
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ	چیز کی جسے اتارا اللہ نے۔ تو کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم
مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ	پیروی کریں گے اس چیز کی جس پر ہم نے اپنے آباد
اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا	اجداد کو پایا۔ کیا یہ لوگ (یونہی کریں گے) اگرچہ اُن کے
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔	باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ یافتہ ہوں۔

یہاں تمام بنی آدم سے خطاب ہو رہا ہے اور یہ آیت کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں بلکہ عام طور سے نوعِ انسانی کا یہ خاصہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کبھی انھیں سمجھایا جاتا ہے کہ خدا کے احکام کی تعمیل کرو۔ خدا کے رسول کی متابعت کرو اور خدا کی کتاب کی پیروی کرو۔ تو وہ جواب میں یہی کہتے ہیں کہ نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اسی راہ پر چلیں گے جس راہ پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ یہ نہیں سوچیں گے کہ ان کے آبا و اجداد صحیح رستے پر تھے یا نہ۔ وہ لوگ

کچھ سمجھتے بھی تھے یا نہ۔ بلکہ کیا یہ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے بزرگ گمراہ تھے انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔

حقیقتِ حال بھی یہی ہے کہ نوعِ انسانی کی ایک بہت بھاری اکثریت ہمیشہ سے یونہی کرتی چلی آئی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر تدبر و تفکر کے، بغیر اپنی عقل سے کام لئے آنکھیں بند کرکے اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتی گئی۔ خداوندکریم نے آدمی کو علم دیا اور عقل دی تاکہ وہ اپنے عقائد و اعمال کے بارے میں قدم قدم پر سوچے سمجھے اور نیک و بد میں تمیز کرکے نیکی کی راہ اختیار کرے۔ قرآن مجید میں بیشمار مقامات پر اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ صحیفۂ کائنات کی آیاتِ بینات سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تفکر و تفقہ اور تعلّم و تعقّل سے کام لیتے ہیں۔ جا بجا یہ اور اسی قسم کے اور الفاظ قرآن میں دہرائے گئے ہیں لقوم یتفکرون۔ لقوم یعقلون۔ لقوم یذکرون۔ اور لقوم یعلمون وغیرہ وغیرہ۔ لیکن انسان ہے کہ صرف کورانہ تقلید کو ہی اپنے لئے "مشعلِ راہ" سمجھتا ہے اور "نورِ عرفاں" کے باقی تمام سرچشموں کو اپنے اوپر بند رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ دنیا کے تمام یہودی محض اس لئے یہودی مذہب کے پیرو ہیں کہ اُن کے باپ دادا یہودی تھے۔ تمام عیسائی صرف اسی لئے مسیحی مشرب کے قائل ہیں کہ ان کے آباؤاجداد عیسائی تھے۔ ہندو بس اسی لئے ہندو ہیں کہ ان کے بزرگ ہندو تھے۔ مسلمان بھی صرف اسی وجہ سے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے۔ الاماشاءاللہ۔ باپ دادا خواہ صحیح رستے پر تھے خواہ غلط رستے پر۔

کسی صورت میں اور کسی حالت میں آدمی تفکر و تعقل کے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اور کورانہ تقلید بہر حال اس کے لئے ناجائز ہے۔ قرآن مجید نے ہر مقام اور ہر موقعہ پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے عقائد کا بیان ہو یا اعمال کا۔ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ سوچے سمجھے بغیر یہ بات مان لو۔ اگر کسی مذہب کا کوئی آدمی یہ دعوی کرے کہ میرے آباؤاجداد صحیح رستے پر تھے اس لئے میں ان کے نقشِ قدم پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔ میرے لئے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش غیر ضروری ہے تو اس کے مقابلے میں تمام دوسرے مذاہب کے لوگ بھی یہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ ہر حال میں آخری فیصلہ علم کرے گا اور عقل کرے گی کہ کون سیدھے رستے پر ہے اور کون گمراہ۔ اندریں صورتِ حالات آنکھیں بند کرکے بزرگوں کی تقلید کرنا

نہ مسلمانوں کے لئے روا ہے، نہ عیسائیوں کے لئے، نہ ہندوؤں کے لئے جائز ہے اور نہ یہودیوں کے لئے۔ غرضیکہ کوئی مذہب ہو یا کوئی مسلک، محض بزرگوں کی تقلید کو شمع راہ نہیں بنایا جاسکتا بلکہ نورِ ہدایت کا اصلی چشمہ خود انسان کے اندر موجود ہے یعنی اس کا علم اور اس کی عقل۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى	اور جب کہا جاتا ہے انھیں کہ آؤ اس چیز کی طرف
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ	جو اتاری ہے اللہ نے اور آؤ رسول کی طرف۔ تو
قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا	وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کچھ کافی ہے جس پر
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ	ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا یہ لوگ اسی بات پہ
لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا	اڑے رہیں گے گو ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے
يَهْتَدُوْنَ۔	ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔

سورۂ مائدہ کے اس مقام پر کفر کی بعض رسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مشرک لوگ مواشی میں کوئی بچہ بت کی نیاز رکھتے اور نشان کی خاطر اس کا کان پھاڑ دیتے اور اس کو بحیرہ کہتے۔ اسی طرح کوئی جانور بت کے نام پر آزاد کر دیتے اور اس کو اس کے اختیار پر چھوڑ دیتے وہ سائبہ کہلاتا۔ اسی طرح کی اور کئی غلط رسمیں ڈال کر ان کو حکم شرعی سمجھتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا کوئی حکم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا بلکہ یہ ان کا فرول کا افترا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ ان مشرکانہ رسموں کو چھوڑ دو اور اس ہدایت کی پیروی کرو جو خدا کا رسول تمہارے لئے لایا ہے تو یہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں کسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے وہی طریق عمل کافی ہے۔ جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں۔

اس آیت میں پھر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آباؤ اجداد کی تقلید کافی نہیں بلکہ یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہمارے آبا جس راہ پر چلتے رہے ہیں وہ راہ سیدھی تھی یا نہیں۔ محض تقلید کو اپنے لئے کافی سمجھ لینا گویا اپنے قوائے عقلی و فکری کو معطل کر دینا ہے جو جائز نہیں۔ افسوس سے ماننا پڑتا ہے کہ آج مسلمانوں میں بھی کئی اسی طرح کی مشرکانہ رسمیں جاری ہیں اور مسلمان بھی باپ دادا کی تقلید میں ہی ان رسموں کو ادا کرتے ہیں اور کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ یہ رسمیں شرعاً درست ہیں یا نہیں۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً قَالُوْا	اور جس وقت وہ بیحیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ
وَجَدْنَا عَلَیْھَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ	ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس پر پایا اور اللہ نے
اَمَرَنَا بِھَا قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا	ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہہ کہ اللہ بیحیائی
یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی	کا حکم نہیں کرتا۔ کیا تم اللہ پر ایسی باتیں کہتے ہو
اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔	جنہیں تم نہیں جانتے۔

اس آیت سے پہلے تمام بنی آدم سے خطاب ہے کہ شیطان سے بچو تاکہ وہ تمہیں گمراہ نہ کر دے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ تم شیطان کو دیکھ نہیں سکتے اور اس لئے معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کس کس راہ سے تمہیں بدراہ کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب تم سن چکے کہ پہلے باپ نے شیطان کا فریب کھایا پھر باپ کی کیوں سنو لاتے ہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید بھی ایک شیطانی فریب ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا۔ تقلید کرنے والے لوگ عموماً یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ خدا کے حکم کے مطابق ہے حالانکہ انھوں نے اپنی عقل سے کام لیکر کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ کام عقلاً خدا کے حکم کے مطابق ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔

قَالُوْا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ	کہا انھوں نے کیا آیا ہے تو ہمارے پاس اس لئے
وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ	کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کریں اور چھوڑ دیں
یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتِنَا بِمَا	اُسے جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا
تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ	پس لے آ تو ہمارے پاس وہ (عذاب) جس کا
الصّٰدِقِیْنَ ۝	تو وعدہ کرتا ہے۔ اگر تو سچا ہے۔

یہ ذکر قوم عاد کا ہے جب انھیں حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو، کیونکہ سوائے اس کے اور کوئی معبود نہیں تو انھوں نے جواب میں یہی کہا کہ کیا تو ہمارے پاس اسی لئے آیا ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا۔ اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا۔ کائنات کی بے شمار بیرونی نشانیوں سے اور اپنے نفس کی لاتعداد اندرونی آیات سے آنکھیں بند کرلیں اور نبی کی تعلیم سے جو خود ان کی فطرت اور ضمیر کی آواز کے مطابق تھی محض اس لئے انکار کردیا کہ وہ تعلیم اُن کو اس رستے سے ہٹانے والی تھی جس رستے پر ان کے باپ دادا چلتے آئے تھے۔ کورانہ تقلید نے انھیں اس قدر اندھا کردیا تھا اور ان کے قوائے عقلی وفکری کو اس درجہ بے کار کردیا تھا کہ انھوں نے بڑی بے باکی سے نبی کو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تو سچا ہے اور ہم جھوٹے تو ہم پر خدا کا عذاب کیوں نازل نہیں ہوتا۔

قَالُوٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا	انھوں نے کہا کیا آیا ہے تو ہمارے پاس تاکہ پھیردے
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ	تو ہم کو اس چیز سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ
فِي الْاَرْضِ ۔ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا	دادوں کو۔ اور ہووے تم دونوں کے لئے دنیا میں
بِمُؤْمِنِيْنَ ۔	بڑائی اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں۔

یہ فرعون اور اس کی قوم کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ان کے پاس آئے اور انھیں خدائے واحد پر ایمان لانے کے لئے کہا۔ تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ کیا تم ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے راستے سے ہٹانے کے لئے آئے ہو۔ ہم ہرگز ایسا کرنے پر تیار نہیں۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا	انھوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے ہمیں تجھ پر بڑی
مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ	امید تھی، کیا تو ہمیں منع کرتا ہے اس چیز کی عبادت
اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا	کرنے سے جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے
وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ	چلے آئے ہیں۔ اور جس چیز کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے
اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ؀	ہمیں اس میں شک ہے قلق ڈالنے والا۔

یہ قوم ثمود کا ذکر ہے جب حضرت صالح علیہ السلام نے انھیں کہا کہ اے میری قوم ایک خدا کی پرستش کرو۔ سوائے اس کے اور کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا اور وہی تمہاری آبادی اور معموری کا باعث ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ تجھ پر ہم کو امید تھی یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ

روشن کرے گا۔ تو لگا اس کو مٹانے۔

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا۔ دلیل کتنی سادہ اور عام فہم تھی کہ جس خدا نے تمہیں پیدا کیا ہے، صرف وہی تمہاری پرستش کا حق دار ہے۔ اتنی بات خود ثمود کے لوگ بھی سمجھتے تھے۔ کیونکہ کوئی ایسی مشرک قوم دنیا میں نہیں گزری اور نہ اب ہے۔ جو خدائے واحد کو نہ پہچانتی ہو۔ ثمود کے پاس دلیل کا جواب تو تھا ہی نہیں۔ کہا کہ ہم اپنے بزرگوں کی راہ کو کیوں چھوڑیں۔ تو اچھا باپ دادے کا نام روشن کرنے آیا ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ	انھوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز یہ حکم کرتی
تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ	ہے کہ چھوڑ دیں ہم اس چیز کو جسے ہمارے باپ دادا
اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ	پوجتے تھے یا ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے
اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۔ اِنَّكَ لَاَنْتَ	مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ تو تو بڑا حلم والا
الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ۔	اور بھلائی والا ہے۔

مدین والوں کو جب حضرت شعیب علیہ السلام نے سمجھایا کہ خدائے واحد کے بغیر اور کوئی پرستش کے قابل نہیں۔ اور ماپ تول میں انھیں دیانت داری کرنے کی نصیحت کی تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم اپنے باپ دادا کے رستے پر ہی چلیں گے۔ کوئی نئی راہ اختیار کرنے پر ہم تیار نہیں اور طنزاً حضرت شعیب علیہ السلام کو کہا کہ تم بڑے بردبار اور نیکوکار ہمیں سمجھانے آئے ہو۔

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا	انھوں نے کہا کہ تم بھی ہماری طرح کے آدمی ہو۔
تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا	تمہارا ارادہ ہے کہ ہمیں اس چیز سے روک دو جس
كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا	کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے تھے۔ پس لاؤ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۔	ہمارے پاس کوئی ظاہر دلیل۔

یہ عاد و ثمود کے بعد کی مختلف قوموں اور ان کے پیغمبروں کا قصہ ہے۔ جب ان کے پاس ان کے رسول آئے تو انھوں نے بھی جواب میں تقلید آبا کو ہی اپنا مسلک بتایا اور اس مسلک کے خلاف ہر

بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔

جن قوموں اور جن پیغمبروں کا قرآن مجید میں اس سلسلے میں خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور سب قومیں بھی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ پیغمبروں کو یہی جواب دیتی رہی ہیں۔ اس سے تقلید اور اس کی تباہ کن مضرتوں کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ	جب اُس نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو کہا کہ یہ
التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ	مورتیاں کیا چیزیں ہیں کہ تم ان کا اعتکاف کرتے ہو
قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ	تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں
قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ	کو ان کی پرستش کرتے پایا۔ اس نے کہا کہ یقیناً تم
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝	اور تمہارے آباواجداد ظاہر گمراہی میں تھے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کے والد اور ان کی قوم کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ہدایت بخشی اور منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو انھوں نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار رہے اور جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ پتھر کی مورتیاں کیا چیز ہیں کہ تم ان کی پوجا کرتے ہو۔ بات تو آسان تھی اور یہ لوگ اس بات کو سمجھتے بھی تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے علم و عقل کی قوتوں کو معطل کرتے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلائل پر غور کرنے سے بدیں وجہ انکار کر دیا کہ جب ہمارے بزرگ اور پیشرو مورتی پوجا کرتے چلے آئے ہیں۔ تو ہم بت پرستی کیوں چھوڑیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے انھیں بتایا کہ تمہارے آباؤاجداد غلط راہ پر تھے اور تم بھی ان کی تقلید میں غلط راہ پر ہو۔ اور پھر اپنے اس دعویٰ پر دلیلیں بھی پیش کیں اور دلیلیں بھی ایسی جن کی تائید خود انسانی فطرت بھی کرتی ہے لیکن تقلید کے جذبے نے ان لوگوں کو ایسا اندھا کر دیا ہوا تھا کہ ان کی کھلی ہوئی آنکھیں بھی کچھ دیکھ نہ سکیں۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ	پس اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ
قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	یہ تو تمہاری مانند ایک آدمی ہے۔ چاہتا ہے کہ

يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔

تم پر بڑائی حاصل کرے۔ اور اگر چاہتا اللہ تو اتارتا فرشتے۔ ہم نے یہ بات اپنے پہلے باپ دادوں میں نہیں سُنی۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے جب انھوں نے اپنی قوم کو کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا اور کوئی تمہارا معبود نہیں (تم سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی کیوں بت پرستی کرتے ہو) کیا تم ڈرتے نہیں۔ تو ان کی قوم نے بھی یہی کہا کہ جو بات تم کہتے ہو۔ وہ ہم نے اپنے بزرگوں میں نہیں سنی۔ ہم تو اپنے آباؤ اجداد کے رستے کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۔

انھوں نے کہا (ایسا نہیں) بلکہ ہم تو اپنے آبا و اجداد کو یہی کچھ کرتے دیکھتے آئے ہیں۔

یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ جب انھوں نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو کہا کہ تم کس چیز کی پوجا کرتے ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں اور انہی کا اعتکاف کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا کہ جب تم ان مورتیوں کو پکارتے ہو تو کیا وہ سنتی ہیں۔ یا کیا یہ مورتیاں تمہیں کچھ نفع دیتی ہیں، یا ضرر پہنچا سکتی ہیں تو ان لوگوں نے جواب میں بس یہی کچھ کہا کہ ہمارے باپ دادا ان کی پوجا کرتے تھے اس لئے ہم بھی کرتے ہیں۔

دیکھیے اِن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کی دلیلوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ حق بات یہ ہے کہ انھوں نے اِن دلیلوں کو سنا ہی نہیں۔ ان کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے علم اور عقل سے کام لینا ہی چھوڑ رکھا تھا۔ اپنے عقاید و وظائف کے حسن و قبح پر کبھی انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا اور جو شمعیں خداوند تعالیٰ نے خود ان کے اندر روشن کر رکھی تھیں۔ ان پر تہ در تہ سیاہ پردے ڈال رکھے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بزرگوں کی کورانہ تقلید کو اپنے لئے کافی سمجھنے لگ جاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ اپنے قوائے عقلی و فکری کو بالکل بے کار بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اگر نوعِ انسانی اِس ذہنی غلامی کے

گراں بار طوق کو اپنی گردن میں نہ ڈال لیتی۔ تو آج دنیا کے علمی اور فنی خزانے موجودہ خزانوں سے سوگنا سے بھی زیادہ ہوتے۔ انسانی علوم میں آج تک جتنی کچھ ترقی بھی ہوئی ہے وہ انھیں تھوڑے سے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جنھوں نے اپنی گردنوں سے غلامی کے اس طوق کو اتار پھینکنے کی جرأت کی اور اہلِ زمانہ کی طعن و تشنیع سے بددل نہ ہوئے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا	پس جب آیا ان کے پاس موسیٰ ہماری ظاہر
بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ	نشانیوں کے ساتھ۔ تو انھوں نے کہا یہ تو جادو
مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ	ہے جو اس نے بانندھ لیا ہے اور یہ بات ہم نے
اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔	اپنے پہلے آباو اجداد میں نہیں سنی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعونیوں کے پاس دینِ فطرت کی سیدھی سادی تعلیم لے کر آئے۔ معجزات سے بھی اُن لوگوں کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نامراد قوم نے ان کی تعلیم و تبلیغ اور معجزات کو صرف اس لئے جادو کہہ کر مسترد کردیا کہ ان کی تعلیم ان لوگوں کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف تھی۔ اگر کسی جھوٹی بودی دلیل سے ہی حضرت موسیٰؑ کی دلیلوں کا جواب دیتے تو پھر کچھ بات تھی لیکن یہ لوگ تدبر و تفکر کا تو نام ہی نہیں لیتے تھے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ	اور جب کہا جاتا ہے انھیں کہ پیروی کرو اس چیز
اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا	کی جو اتاری ہے اللہ نے تو کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ	اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ
الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى	دادا کو پایا۔ کیا (یہ لوگ اسی بات پر اصرار کرتے رہیں گے)
عَذَابِ السَّعِيْرِ۔	اگرچہ شیطان انھیں عذاب دوزخ کی طرف بلا رہا ہو۔

یہ آیت کسی خاص قوم کے متعلق نہیں بلکہ عام نوعِ انسانی کا ذکر ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقلیدِ آبا کا مرض کسی ایک قوم میں نہیں۔ بلکہ عام بنی آدم میں پایا جاتا ہے اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تقلید شیطان کا آلۂ کار ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کو بہکاتا ہے اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ یہ

لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کی یہ روش تلبیسِ ابلیس تو نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کورانہ تقلید کے شیدا سوچنے اور سمجھنے کی تکلیف برداشت ہی نہیں کرنا چاہتے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے لوگ کافی سوچ چکے ہیں اس لئے اب عقل سے کام لینا ضروری نہیں رہا۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ — جس دن پھیرے جائیں گے ان کے منہ آگ میں
يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا — تو کہیں گے اے کاش کہ ہم نے اللہ کی اور رسول
الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا — کی فرمانبرداری کی ہوتی اور کہیں گے اے ہمارے
سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا — رب ہم نے فرمانبرداری کی اپنے سرداروں کی اور
السَّبِيلَا ۝ — اپنے بڑوں کی پس انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

یہ دوزخیوں کا ذکر ہے جب انھیں دوزخ میں ڈالا جائے گا تو کہیں گے اے کاش کہ ہم خدا کا اور اس کے رسول کا حکم مانتے۔ پھر یہ لوگ معذرت کے طور پر خدا سے کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی پیروی کی اور ان کے حکموں پر چلے پس ہماری گمراہی کا باعث وہ ہیں۔ لیکن ان لوگوں کا یہ عذر اس لئے مقبول نہ ہوگا کہ خدا نے انھیں علم اور عقل کی دولت بخشی تھی پس انکا فرض تھا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھاتے خدا کی اس داد کو انھوں نے پسِ پشت ڈال دیا اور آسانی کی طرف مائل ہو گئے کہ ہم کیوں سوچیں، ہمارے سردار اور ہمارے بڑے ہمارے لئے بھی سوچ چکے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کفار کی یہ بیماری اس وقت کافروں اور مشرکوں میں اتنی شدید نہیں جتنی مسلمانوں میں ہے۔ اگر انھیں کہہ دیا جائے کہ فلاں صاحب نے یہ کہا ہے یا فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے تو بس وہ سوچے سمجھے بغیر اس کو اپنے لئے سند بنا لیتے ہیں اور اسی کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں عبرت کا مقام ہے

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا — اور جب اُن پر ہماری ظاہر نشانیاں پڑھی جاتی
بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ — ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک آدمی ہی ہے جو
يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ — چاہتا ہے کہ ہمیں اُس چیز سے روک دے جس کی
يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَقَالُوا مَا هَٰذَا — ہمارے آباء پرستش کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ یہ تو

اِلَّآ اِفْکٌ مُّفْتَرًی۔ ایک جھوٹ ہے جو اس نے باندھ لیا ہے۔

یہ آیت بھی کسی خاص قوم سے متعلق نہیں۔ عام قوموں کا ذکر ہے جو اپنے اپنے رسولوں کی تعلیم کو اس لئے رد کرتی رہیں کہ وہ تعلیم ان کے باپ دادا کی روش کے خلاف تھی۔

یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ کہیں گے ناتوان تکبر کرنے والوں کو کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ تکبر کرنے والے قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰکُمْ عَنِ الْهُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَکُمْ بَلْ کُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ ناتوانوں کو کہیں گے۔ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا۔ حالانکہ ہدایت تمہارے پاس آچکی تھی نہیں بلکہ تم ہی مجرم تھے۔

دیکھئے متکبرین کا جواب کیا ہے وہ اپنے پیرووں کو کہتے ہیں کہ تمہارے اندر بھی ہدایت کی شمعیں روشن تھیں۔ رسول بھی تمہاری رہنمائی کے لئے آئے۔ پھر تم نے ان کو چھوڑ کر ہماری فرمانبرداری کیوں کی، یہ تمہارا اپنا قصور ہے، یہ قیامت کے دن کا ذکر ہے جب مخلوق اپنے خالق کے سامنے پیش ہوگی۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ فَهُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ یُهْرَعُوْنَ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَکْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ۔ انھوں نے پایا تھا اپنے باپ دادا کو غلط رستے پر۔ پھر یہ ان کے نقشِ قدم پر دوڑے جاتے ہیں۔ البتہ گمراہ ہوگئے ان سے پہلے بہت سے پہلے لوگ۔

یہ دوزخیوں کے ذکر میں ہے کہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں گمراہ ہوگئے۔ یہاں سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ تقلید کرنے والے اپنے پیش رووں کے نقشِ قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی سوچ سمجھ کر قدم نہیں اٹھاتے۔ تقلید کی ایک بڑی مضرت یہی ہے کہ تقلید کرنے والا اپنے سامنے ایک بنا بنایا رستہ دیکھتا ہے اور اس پر اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ خود سوچنے کی تکلیف نہیں کرتا اور اس طرح اپنے قوائے عقلی کو قطعاً معطل کر دیتا ہے۔ دوسری بات جو ان آیات میں بیان ہوئی یہ ہے کہ ہر زمانے میں اکثر لوگ اسی تقلید کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ نہیں سنی ہم نے یہ بات پچھلے دین میں۔ یہ بات
اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ اس نے اپنے دل سے گھڑلی ہے۔

یہ مقام بھی کسی خاص قوم سے متعلق نہیں۔ عام لوگوں کا ذکر ہے کہ جب انھیں کہا جاتا ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک خدا ہے تو وہ اس کے جواب میں یہی کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا بت پرستی کرتے چلے آئے ہیں ہم بھی ایسا ہی کرتے چلے جائیں گے۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا بلکہ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آبا کو ایک
عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ راہ پر پایا اور ہم انہی کے نشانِ قدم پر راہ پانے
مُّهْتَدُوْنَ۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا والے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے
مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ کسی بستی میں کوئی ایسا ڈرانے والا نہیں بھیجا جسے
اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ قوم کے بڑوں نے یہی جواب نہ دیا ہو کہ ہم نے
اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ اپنے آبا کو ایک راہ پر پایا اور ہم انہی کے نقشِ قدم
مُّقْتَدُوْنَ۔ کی پیروی کریں گے۔

اس مقام پر پہلے توحید کے چند در چند دلائل بیان ہوئے۔ پھر ان لوگوں سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس بھی شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے تو بتاؤ۔ لیکن ان لوگوں نے جواب میں صرف یہی کہا کہ ہمارے باپ دادا کا رستہ یہی تھا۔ ہم بھی اسی پر چلیں گے۔

یہاں صاف طور سے بتایا گیا ہے کہ جتنے پیغمبر مصلح۔ مجدد اور ناصح دنیا میں آئے۔ ان سب کی قوموں نے انھیں یہی کہا کہ ہم آپ کے بتائے ہوئے رستے پر نہیں چلیں گے۔ بلکہ اپنے باپ دادا کے رستے پر گامزن ہوں گے۔

اس سے تقلید کی ہمہ گیری معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی یہی حال ہے۔ مذاہب کے معاملے میں تو الا ما شاء اللہ تمام دنیا اسی مرض میں مبتلا ہے۔ باقی دنیاوی علوم و فنون اور صنعت و حرفت اور کاروبار کی ترقی میں بھی اسی ذہنی غلامی نے رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔

آباؤ اکابر کی تقلید کے علاوہ اپنے معاصر رشتہ داروں اور دوستوں کی تقلید بھی کفر و انکار کا باعث ہوتی ہے۔ جیسا کہ آیتِ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ	اور (حضرت ابراہیمؑ نے) کہا کہ بات یہ ہے کہ تم نے
اللَّهِ أَوْثَانًا. مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ	خدا کے علاوہ بتوں کو پکڑ لیا ہے۔ حیاتِ دنیا میں
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. ثُمَّ يَوْمَ	ایک دوسرے کی دوستی کی وجہ سے۔ پھر قیامت
الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ	کے دن بعض تمہارے بعض سے منکر ہو جائیں گے
وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا.	اور بعض تمہارے بعض پر لعنت کریں گے۔ اور
وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم	تمہارے رہنے کی جگہ آگ ہے اور تمہارا کوئی
مِّن نَّاصِرِينَ.	مددگار نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں کہ تم نے اپنے معاصرین رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت میں اور ان کی تقلید میں بت پرستی شروع کر رکھی ہے۔ لیکن قیامت کے دن یہ لوگ تمہارے کام نہ آئیں گے بلکہ وہاں تم ایک دوسرے پر لعنت کرو گے کہ ہم ان کی وجہ سے کافر ہوئے، وہاں نہ تمہارے دوست اور رشتہ دار اور نہ تمہارے معبود بُت تمہاری کچھ مدد کر سکیں گے۔

قرآن مجید کے مذکورہ بالا مقامات سے قطعی طور سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانے میں یعنی ہر ملک میں اور ہر قوم میں کفار اور مشرکین کی گمراہی اور کفر و جحود کا باعث زیادہ تر یہی تقلیدِ آبا کی بیماری تھی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اس بیماری کی اتنی ہی شدت باقی ہے جتنی پہلے تھی۔

اہلِ دنیا کے دل و دماغ پر تقلید کا اتنا گہرا اثر ہو چکا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے علم و عقل سے کام لے کر کسی معاملے کے متعلق سوچنے کی کوشش کرے اور دنیا کے پامال رستے سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہونا چاہے تو لوگ طعن و تشنیع کی بوچھاڑ سے اس کا ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں "ھم رجال و نحن رجال" کہنے والے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اُن کی آواز صدا بصحرا سے زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ ایسے لوگوں پر عموماً اس قسم کے آوازے کسے جاتے ہیں کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ پہلے زمانہ کے تمام عاشق اہلِ نظر نہ تھے اور آج کل کے تمام حسن پرست بوالہوس نہیں ہیں۔ ہر آدمی کو خدا نے علم دیا ہے اور عقل دی ہے۔ اس لئے ہر آدمی کا حق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے علم و عقل کی بساط تک سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

نگارستانِ چیں دانم نخواہد شد سرایت لیک
بنوکِ کلکِ رنگ آمیز نقشے می نگار آخر
چو باد از خرمنِ دوناں ربودن خوشہ تا چند
زہمت توشہ بردار و خود تخمے بکار آخر

تصحیح

گذشتہ جولائی کے برہان میں صفحہ ۴۱ کے دوسرے پیراگراف میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں ازراہِ کرم اب اس پیراگراف کو اس طرح پڑھئے۔

"اس صدی میں جن ماہرین نے یہاں کام کیا ان میں سب سے مشہور سڈنی اسمتھ (Sydney Smith) کنگ (L.W. King.) اور ویلیس بج (Wallace Budge) ہیں۔ گذشتہ صدی کے ماہرین جنھوں نے اس تحقیق کی بنیاد رکھی وہ راسم (Rassam.) لے یارڈ (Layard) بوتا (Bota.) رالنسن (Rawlinson) اور ہنکس (Hinks.) تھے۔ یہ تمام ماہرین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس علاقہ میں ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی رہ گیا ہے۔"

علم النفسیات کا ایک افادی پہلو

لفٹیننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ایم۔ایس

علم النفس کی متعدد تعریفیں کی جاچکی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو اس اصطلاح کو پوری طرح واضح کرکے زندگی کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتی ہو۔ اکثر کتابوں میں جو تعریف ہمیں ملتی ہے وہ یوں ہے کہ "علم النفسیات ذہن (یا روح) اور ذہنی عملیہ (Mental Process.) کا علم ہے"

ہمارے نزدیک یہ تعریف نامکمل ہے، کیونکہ تعریف جب تک ایک اصطلاح، لفظ یا عبارت کی مکمل طور پر تشریح نہ کردے وہ تعریف کہلانے کی مستحق نہیں ہے علم النفس کی تعریف میں روح یا ذہن کا لفظ موجود ہے۔ جو بذات خود مزید تعریف کا مقتضی ہے۔ اسی لئے اگر ایک لفظ یا اصطلاح کی تعریف میں مزید تعریف کی ضرورت پڑے تو وہ تعریف نہ ہی صرف نامکمل بلکہ ناقص بھی ہوتی ہے اور تعریف کے معانی اور مقاصد بھی یہی ہیں کہ جو کچھ ایک لفظ یا عبارت کے اندر معانی پنہاں ہوں وہ صاف صاف ظاہر ہوجائیں اور سمجھنے میں دقت نہ پیش آئے۔

مثلاً میں ایک میز پر بیٹھا اس وقت لکھ رہا ہوں۔ اگر سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے دریافت کروں کہ میز کیا چیز ہے تو وہ یقیناً یہی کہے گا کہ یہ ایک لکڑی کی ایسی ترکیب ہے جس کے چار یا تین پاؤں ہوتے ہیں اور ان کے اوپر ایک مناسب لمبائی چوڑائی کا تختہ ہوتا ہے جس پر سہارا لیکر لکھتے ہیں تو گویا اس تعریف سے ہم سمجھ گئے کہ یہ میز ہوتی ہے لیکن اگر وہ صرف اتنا کہا ہے کہ یہ ایک لکڑی کا ڈھانچا ہے جو لکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو یہ بات بہت بہت مہمل سی ہوگی کیونکہ لکڑی کے بہت سے

ڈھانچے بنائے جاسکتے ہیں جو لکھنے کے کام آتے ہیں مگر ہیر نہیں ہوتے۔ تو یہ دوسری تعریف نامکمل ٹھہری کیونکہ مزید تشریح چاہتی ہے۔

یہی ہمارا مطلب علم النفسیات کی تعریف سے ہے کہ جو عام طور پر رائج ہے وہ نامکمل اور ناقص ہے۔ ہم علم النفس کی تعریف یوں کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا علم ہے جو انسانی سیرت (Behaviour.) کی تحلیل (Decipherment or Interpretation) کرتا ہے۔ اس تعریف سے تمام وہ خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں جو علم النفس کی اصطلاح کے اندر مخفی ہیں چونکہ علم النفس کا تعلق روح یا ذہن کے ساتھ ہے اور روح اپنی حقیقت کو حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کے ذریعہ ظاہر کرتی رہتی ہے اس لئے ہم نے سیرت کا لفظ استعمال کر کے روح کی ایک صفت کو نمایاں کر دیا ہے۔ صرف سیرت (Beharour) ہی زندگی کا ایک ایسا نفسیاتی پہلو ہے جو روح کا تعلق جسم کے ساتھ ظاہر کرتا ہے اور یہی تعلق ہے جہاں علم النفس زندگی کے مختلف شعبوں میں مداخلت کرتا ہے۔ زمانہ قدیم سے علماؤ حکما نے روح یا ذہن کی تعریف کرنی چاہی مگر وہ آج تک اس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور نہ ہی تعریف کر سکے۔ اور جب کبھی انہیں کوئی مناسب تعریف سوجھی تو وہ تعریف نہ ہوئی بلکہ ایک تشریح ہوتی تھی جس میں تعریف طلب جزئیات پھر بھی رہ جاتی تھیں اور وہ اس کی صفات کا ایک بیان ہوتا تھا۔

رہی یہ بات کہ روح اور جسم کا تعلق کیا ہے تو یہ قدیم نظریوں سے ذرا زیادہ خصوصیت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ جدید نفسیات میں یہ تمام نظریے موجود ہیں مگر یہ وہی ہیں جو زمانہ قدیم سے چلے آتے ہیں۔ لاطینی کے بعد عربی میں منتقل ہوئے اور عربی سے اب انگریزی میں منتقل ہو رہے ہیں مگر عوام چونکہ ان زبانوں سے ناواقف ہیں اس لئے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بالکل نئی چیز ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بالڈون (Baldwin) اپنی مشہور کتاب تاریخ علم النفسیات حصہ دوئم (History of Psychology Vol II ...) میں یہ ذکر کرتا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے اس تعلق کو معلوم کیا وہ ابن رشد (Averroes.) تھا۔ بہر حال جہاں تک

تعریف کا تعلق ہے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر اعلان کردی تھی۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ط — اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے روح کے بارے میں سوال
قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ — کرتے ہیں تو کہدے، روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے
وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ — اور تمہیں (اسرارِ کائنات کا) علم جو کچھ دیا گیا ہے وہ بہت
اِلَّا قَلِيْلًا۔ — تھوڑا ہی (اس سے زیادہ تم نہیں پا سکتے)۔"

بہرحال روح کی تعریف نہیں ہوسکتی اور نہ ہی آج تک کسی نے کی ہے۔ اس کی محض یہی وجہ ہے کہ انسان کا علم اس سے متعلق بہت قلیل ہے اور ہمارے نزدیک قرآن عزیز کے اس جواب سے بہتر اور جواب کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ کہکر اس نے وہ تمام دروازے بند کردیئے جو شک اور الحاد کے تیر انسان کے قلب میں اتار دیتے ہیں۔ اسی لئے جب انسان نے یہ محسوس کیا کہ وہ روح کی تعریف کرنے سے قاصر ہے تو اس نے اس کی صفات بیان کرنا شروع کردیں، ٹھیک جس طرح اس نے اپنے رب کا جستجو میں سراغ نہ پایا تو اس کی صفات کو بیان کرنا شروع کردیا۔

اس مختصر سی تمہید سے ہمارا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ علم النفس کی جو تعریف آجکل کی جاتی ہے وہ ناقص ہے اور اس سے کسی طرح بھی مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اور زندگی کا نفسیاتی پہلو معلوم کرنے کے لئے لازم ہے کہ اول یہ معلوم ہو کہ علم کیا ہے۔ ہم نے جو تعریف ابھی سطورِ بالا میں کی ہے یعنی علم النفس انسانی سیرت کی تحلیل کو کہتے ہیں۔ اس کو پیشِ نظر رکھکر ہم زندگی کے نفسیاتی پہلو کو، جو ہمہ تن افادیت سے پُر ہے، پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مقالہ حافظہ سے لکھا جارہا ہے اگر امثال و اقوال میں کہیں ترتیب غلط ہوگئی ہو تو نظر انداز کردیجئے۔

روح اور جسم کا تعلق

علمی دنیا میں اس تعلق کا بہت گہرا مطالعہ کیا جاچکا ہے اور ہم کہہ آئے ہیں کہ اس تعلق کو سب سے پہلے واضح کرنے والا شخص ابنِ رشد (Averroes.) تھا۔ جو نظریے اس وقت تک ہماری نگاہ میں آئے ہیں ہم انھیں اختصاراً یہاں بیان کردیتے ہیں تاکہ آئندہ صفحات کو

سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

اول وہ نظریہ ہے جس کو میٹریل ازم (Materialism.) کہا جاتا ہے۔ میٹرلسٹ (Materialist.) کہتا ہے کہ وجود (یعنی مادہ) روح پر اثر کرتا ہے اور اس سے حرکات صادر ہوتی ہیں مثال کے طور پر وہ یہ بات پیش کرتا ہے کہ اگر جسم پر چوٹ لگ جائے تو انسان درد محسوس کرتا ہے یہ شعور اس بات کا ثبوت ہے کہ مادہ نے روح پر اثر کیا۔

دوسرا نظریہ آئیڈیل ازم (Idealism.) کا ہے جو کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ روح، جسم یعنی مادے پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے ثبوت میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم خوفزدہ ہوتے ہیں یا اور کوئی بُری خبر سنتے ہیں تو فوراً ہمارے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے حلق خشک ہو جاتا ہے اور غالباً ہمارا بلڈ پریشر (Blood Pressure. .) بھی خبر کے مطابق بڑھتا گھٹتا رہتا ہے جدید طب نے انٹرنل سیکریشن (Internal Secretion. .) کا نظریہ پیش کر کے اس چیز کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب ہمارے ذہن پر کسی ایسی خبر یا حالت کا اثر ہوتا ہے تو ہمارے جسم کے اندر چند ایک ایسے غدود (Glands) ہیں جن سے لعاب (Secretions) پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ لعاب (Secretions) جب خون میں مل کر اس کے ساتھ دورہ کرتے ہیں تو قلب اور جگر پر پہنچ کر مختلف قسم کے اثرات پیدا کرتے ہیں جو ہمیں دل کی حرکت اور دیگر علامات میں نظر آتے ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں نظریے بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں مگر تحقیق یہاں رک نہیں جاتی اور ایک قدم اور آگے بڑھ کر ان نظریوں کی تردید کر دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ ہی صرف روح جسم پر یا جسم روح پر اثر کرتے ہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے پر متواتر اور یکساں طور پر اثر کرتے رہتے ہیں اور اس نظریے کو ان محققوں نے انٹرایکشن ازم کے نام (Interactionism) سے منسوب کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلسل حرکت اور جدوجہد انسانی جسم میں پھیر جاتی ہے۔ اس نظریے پر ایک زبردست اعتراض یہ کیا گیا کہ یہ ناممکن ہے کہ غیر مادی چیز

مادی اشیاء پر اثر کرکے حرکت یا قوت (Energy.) پیدا کرے۔ حالانکہ قانونِ حفظِ قوت (The Law of Conservation of Energy.) کے مطابق یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ ہر حالت میں حرکت یا قوت (Energy.) پیدا کرنے کے لئے بعض مادی اشیاء کا دوسری مادی اشیاء پر اثر انداز ہونا ضروری ہے ورنہ حرکت یا قوت پیدا کرنا ناممکن ہے۔

اس صدی میں علم النفس کے اور بھی مذاہب پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں بتاتے وہی زندگی کے چند موٹے اصولوں پر غور و فکر کرکے ان کو ذرا پھیلا دیتے ہیں اور جدید تہذیب اور تمدن کے مطابق ان کو اپنا لیتے ہیں۔

امریکن مذہب سیرت (Behanourism) کی تائید کرتا ہے وہ تمام تر زور انسانی حرکات و سکنات پر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ علم النفس محض انسانی حرکات و سکنات کا علم ہے یہ تعریف ہمارے نظریے سے بہت حد تک تطابق رکھتی ہے اور ہم اسی تعریف کو اختیار کرکے مزید گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

دیگر نفسیاتی مذاہب میں سب سے نمایاں ہمیں ڈاکٹر زگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud.) کا مذہب دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر ژنگ (Dr. Jung..) اور ڈاکٹر ایڈلر (Dr. Adler..) کے مذاہب بھی اسی کی شاخیں ہیں۔ دراصل ژنگ اور ایڈلر، ڈاکٹر فرائڈ ہی کے شاگرد تھے جنھوں نے ان کے نظریات کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنا اپنا مذہب بنایا۔ ان تمام جدید نفسیاتی مذاہب میں سب سے زیادہ جس مذہب میں ہمیں زندگی کا افلاطی پہلو نظر آتا ہے وہ ڈاکٹر ایڈلر ہی کا مذہب ہے اگرچہ ڈاکٹر فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی (Psychoanalysis.) میں بھی کارآمد جُز موجود ہیں۔ تاہم اس کے نظریوں میں اکثریت تک بندیوں کی ہے۔ اور کوئی نئی تحقیق وہ پیش نہیں کرتے۔ ڈاکٹر فرائڈ کا خوابوں کی تعبیر کا نظریہ اس کی (Theory of Sex...) کے ساتھ منضبط ہے۔ انسان کے نفسیاتی ارتقا کے مسئلہ پر وہ اسی نظریہ کے ماتحت بحث کرتے ہیں مگر یہ بھی کوئی اچھوتا نظریہ نہیں۔ اس قسم کے نظریے مدت سے موجود ہیں۔

البتہ انھوں نے جو نظریہ لاشعوریت (Theory of The Unconscious.)

پیش کیا ہے وہ کسی حد تک مفید ثابت ہو رہا ہے لیکن وہ بھی جہاں تک اس کا تعلق تحلیلِ نفسی (Psychoanalysis) کے ساتھ ہے ایک تک بندی ہے۔ تحلیلِ نفسی کے عمل کو ہم کسی حد تک عقل و ادراک (Commonsense.) کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ڈاکٹر فرائڈ کا ایک ادنیٰ تجربہ بیان کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر فرائڈ ریل میں سفر کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی ان کا ہم سفر تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس نوجوان نے ایک لاطینی محاورے کا لفظ غلط استعمال کر دیا۔ غالباً اسے لاطینی زبان میں اتنی مہارت نہ تھی مگر ڈاکٹر فرائڈ نے اس غلطی سے اور ہی نتیجہ اخذ کرنا چاہا۔ چنانچہ ڈاکٹر فرائڈ نے تجویز پیش کی کہ وہ اس کی تحلیل نفسی (Psychoanalysis.) کر کے اس کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس غلطی کی وجہ کیا ہے۔ درحقیقت اس سے ڈاکٹر فرائڈ کا منشا یہ تھا کہ اس نوجوان کے غیر شعوری ذہن میں جو اثرات موجود ہوں ان کو ظاہر کر کے اس غلطی کی وجہ معلوم کر لی جائے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر فرائڈ نے اس نوجوان کو اور یقین دلانے کے لئے اپنا کارڈ پیش کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ نوجوان بہت خوش ہوا اور اس میں اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی چنانچہ اس نے اپنے آپ کو اس عمل کے لئے ڈاکٹر فرائڈ کے حوالے کر دیا۔

یہاں یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ یہ جو لاطینی زبان کا لفظ اس نے غلط بولا تھا تو وہ لفظ کچھ لفظ (Liqious.) کی مانند تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فرائڈ نے اپنا عمل Free Assciation. کا شروع کیا۔

یہاں یہ بات بھی گوش گذار کر دینی نامناسب نہ ہوگی کہ ڈاکٹر فرائڈ کے استاد ڈاکٹر شارکو (Charcot) نے جو طریقہ اس عمل کے لئے اول استعمال کیا تھا اس کا نام انہوں نے (Mental Catharsis.) رکھا تھا۔ مگر ڈاکٹر فرائڈ کو یہ رد کر دینا پڑا اور اپنا یہ نیا طریقہ ایجاد کرنا پڑا جس کا نام اس نے (Free Assocuation Method.) رکھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ شارکو (Charcot) کے عمل میں میسمریزم (Mesmerism.) کا استعمال لازمی تھا اور چونکہ یہ عمل

عوام کے لئے مشکل تھا اسی لئے انھوں نے ایک آسان طریقہ ایجاد کرلیا۔ اس عمل کے مطابق جس شخص کی تحلیلِ نفسی کرنا مقصود ہوتا ہے اسے سامنے بٹھالیا جاتا ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر اس پر سوالات کئے جاتے ہیں جو زیادہ تر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ پھر جو کچھ اس کے ذہن میں ہوتا ہے وہ بلا تامل ایمانداری سے بتادیتا ہے۔ پھر ان جوابات کو اکٹھا کرکے ان سے اس کے غیر شعوری ذہن (Subconscious Mind.) میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو ظاہر کردیا جاتا ہے یہی وہ ذہن کا حصہ ہے جس میں تمام گذشتہ تجربات محفوظ رہتے ہیں اور ماہرین ضرورت کے وقت ان کو برآمد کرلیتے ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر فرائڈ نے اس نوجوان سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مندرجہ ذیل سوال کئے جسے ہم ایک مکالمے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرائڈ :- بتاؤ اس وقت تمہارے ذہن میں کیا خیال گھوم رہے ہیں؟

نوجوان :- میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ ایک باغ میں بھاگا جارہا ہوں اور میرے پیچھے ایک حسین لڑکی روتی ہوئی بھاگتی آرہی ہے۔

ڈاکٹر فرائڈ :- یہ جو لفظ تم لاطینی زبان کا غلط بول گئے ہو، کیا اس کے لگ بھگ تمہیں کوئی اور لفظ بھی یاد ہے؟

نوجوان :- ہاں- Liquid (1) Liquor (2) Liquification (3)

ڈاکٹر فرائڈ :- (کچھ دیر ٹھیر کر اور ان کے جوابات کو کاغذ پر نقل کرتے ہوئے) اب کیا سوچ رہے ہو؟

نوجوان :- اس وقت مجھے یسوع کا وہ معجزہ یاد آگیا تھا جہاں خون شہد بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرائڈ :- (کچھ اور دیر کے بعد) اس وقت کیا خیال تمہارے دماغ میں ہے؟

نوجوان :- اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک کیلنڈر نمودار ہوا تھا اور میں اس پر تاریخوں کے نشان دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر فرائڈ نے سوالات کا سلسلہ بند کردیا اور کچھ عرصہ کے لئے کاغذ کو لیکر اس میں

محو ہو گئے۔ چند منٹ کے بعد تو جوان کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ میں نے وجہ معلوم کر لی ہے تمہاری اس غلطی کی۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بیوی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہے جس میں حیض کی بے قاعدگی کی وجہ سے درد ہوتا ہے اور جس کو (Dysmenorrhea) کہتے ہیں!! نوجوان یہ سن کر چونک اٹھا اور اُس نے اِس حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

اب رہی یہ بات کہ ڈاکٹر فرائڈ نے مندرجہ بالا سوال و جواب سے یہ کس طرح اخذ کر لیا تو یہ بات تھوڑے سے غور کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان جوابات کی تشریح اشاری (Symbolical) ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ جو جواب ہو اُس کو اسی طرح سمجھ لیا جائے بلکہ اس سے اور اشارات بھی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر فرائڈ نے، عورت، خون، رونا، کیلنڈر، ان تمام امور کو جمع کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اس نوجوان کی بیوی کو یہ مرض لاحق تھا اور اس کا اثر اس کے ذہن پر اس قدر تھا کہ اس نے مجبور کیا کہ یہ لفظ غلط ادا ہو۔

یہ واقعہ ایک معمولی مثال ہے تحلیلِ نفسی کی، جو ڈاکٹر فرائڈ نے غالباً اپنے لکچرز میں بیان کی ہے۔ میں یہ حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ کتاب پاس نہیں ورنہ حوالہ دیدیا جاتا۔ اس مثال کو خواہ کسی نگاہ سے دیکھا جائے اس میں بہت حد تک تُک بندی نمایاں ہے۔ ہم ایسی تشریحات Symbolical Interpretation) کے لئے کوئی خاص قانون مقرر نہیں کر سکتے۔ ہر چیز کو کسی خاص تعبیر کے ساتھ وابستہ کر دینا درست نہیں۔ اگر یہ درست ہے تو کیا یہ تُک بندی نہ ہوئی؟ ہمارا اس چیز کو بیان کرنے سے مقصد یہ تھا کہ انسانی حرکات و سکنات خواہ وہ جسمانی ہوں یا زبانی، ہر ایک میں معانی پنہاں ہوتے ہیں۔ جو ایک دقیق نظر رکھنے والا سمجھ جاتا ہے اور ایسی باتوں کی وجہ معلوم کر سکتا ہے خواہ وہ کوئی ہی طریقہ استعمال کرے۔ یہی چیز ترقی کرتے کرتے نفس شناسی اور کشف کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ ہر حرکت، یہاں تک کہ جسم کی ساخت اور چہرے کی بناوٹ بھی چند امور اور وجوہات پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یقیناً یہ وجہ معلوم کی جا سکتی ہے۔ چہرے کی بناوٹ، زندگی کے تجربات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور اسی طرح انسان کے خیالات اس کے

فکری تجربات کے مطابق نشوونما پاتے رہتے ہیں مگر ابھی تک یہ علم اتنا ترقی نہیں کر گیا کہ عوام اس سے مستفید ہو سکیں۔ ہر شخص کے تجربات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور ان سے ہی وہ اپنے زندگی کے اصول کو پرکھتا ہے۔

انسان کی زندگی میں بہت سے فعل کچھ عجیب طرح سے واقع ہو جاتے ہیں جن کو وہ خود محسوس نہیں کرتا مگر بعد میں اس کو ان کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن چونکہ یہ افعال خاص تاثرات کے ماتحت ہوتے ہیں اس لئے جاری رہتے ہیں تاوقتیکہ وہ خود ان کی وجوہات کی تہ تک نہ پہنچ جائے یا کوئی ماہر نفسیات اس کی نفسی تحلیل (Psychoanalysis) نہ کرے۔ ایسے افعال نہ صرف جسمانی حرکات و سکنات میں سرزد ہوتے ہیں بلکہ گفتگو اور تحریر میں بھی اکثر دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان میں حرکات و الفاظ کی نقل کچھ اس طرح ہو جاتی ہے کہ جو الفاظ یا حرکات پیش نظر ہوتے ہیں ان سے بالکل مشابہ حرکات اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں مگر ان کے معانی اور مقاصد بالکل برعکس نکل آتے ہیں۔ بسا اوقات اس میں ایک مزاحیہ رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تقریر میں بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اس فعل کو انگریزی زبان میں سپونرازم .... (Spoonerism.) کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح ڈاکٹر سپونر (Spooner) کے نام کے ساتھ وابستہ ہے جن کی زندگی ایسے حادثات سے پُر تھی۔ چند ایک کا یہاں بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سپونر (Dr. Spooner) کی عادت تھی کہ وہ اپنے کام سے بہت دیر کے بعد فارغ ہوتے تھے۔ چنانچہ گھر واپس لوٹنے میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ان کا یہ رویہ ان کی بیوی کو بہت ناگوار گذرتا۔ اور اکثر ان کی اسی بات پر ناراضگی رہتی۔ گویا یہ تنازع ہر روز جاری رہتا۔ ڈاکٹر سپونر کا یہ قاعدہ تھا کہ جب گھر کو کام سے فارغ ہو کر واپس لوٹتے تو موٹر سے اتر کر ورانڈے میں آتے اور اپنی ٹوپی کھونٹی پر لٹکا دیتے اور چھڑی پاس ہی ایک کونے میں کھڑی کر دیتے۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کو معمول سے زیادہ دیر ہو گئی اور آپ بہت گھبرا گئے کہ آج خوب گت بنے گی۔ چنانچہ اسی خیال میں گھر پہنچے اور ارادہ کیا کہ آج چپکے سے موٹر دوسری جگہ کھڑی کروں گا اور آہستہ سے ورانڈے میں داخل ہو جاؤں گا جب وہ ورانڈے میں پہنچے تو حسب معمول ان کی بیوی منتظر نہ تھی۔ اس بات کو دیکھ کر وہ اور گھبرا گئے

اوران کی پریشانی بڑھ گئی چنانچہ اس گھبراہٹ میں جلدی سے انھوں نے چھڑی کو بجائے ٹوپی کے کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود بجائے چھڑی کے جا کر کونے میں کھڑے ہو گئے۔ بہت عرصہ یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد ان کی بیوی باہر نکلی اور اس نے یہ ماجرا دیکھا تو بیساختہ ہنس پڑی۔

اسی طرح تقریر میں بھی یہ چیز اکثر ملتی ہے۔ انگریزی کی ایک دلچسپ مثال یوں ہے کہ ایک صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور ان کی تقریر اس فقرے سے شروع ہوتی تھی On this Auspicious occasion. بجائے اس کے جب آپ نے تقریر شروع کی تو فرمایا On this Suspicious occasion!! گو کہ اس قسم کی مثالیں ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں ملتی ہی رہتی ہیں۔ اس اصطلاح کو اور ناموں سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً Maladjustment یا Mal-Apropism بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان تمام غلط حرکات کی وجوہات تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے عمل سے معلوم کر لی جا سکتیں اور اسی طرح ان کا علاج بھی ممکن ہے۔

میں اپنے موضوع سے دور نکلا جا رہا ہوں لیکن ان امثال کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا تاکہ اس امر پر زور دیا جائے کہ کس طرح ذہن پر تجربات اثر کرتے ہیں اور کن کن شکلوں میں وہ نمودار ہوتے ہیں۔ یہ تجربات اور اثرات انسان کے غیر شعوری ذہن میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک الجھاؤ (Complex) پیدا کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ایڈلر کا جب ڈاکٹر فرائڈ کے ساتھ اختلاف واقع ہوا تو انھوں نے اپنا ایک نیا مذہب اختیار کیا جس کا نام انھوں نے Individual psychology رکھا۔ اس کی رو سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی حرکات اور عادات بچپن کے تجربات اور ذہنی تاثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے تو جس جس ماحول سے انسان ہو کر گذرتا ہے وہ اپنا اپنا اثر پیدا کرتے رہتے ہیں اور ان اثرات کے مطابق اس کی زندگی نشوونما پاتی رہتی ہے۔ اس کی تفصیل بہت لمبی ہے تاہم جستہ جستہ اگر ان نظریات کی تشریح کر دی جائے تو یہ موضوع سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

ڈاکٹر ایڈلر کا بیان ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے گرد و نواح سے متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اول اول جو اثرات اس پر اثر کرتے ہیں وہ والدین اور بہن بھائیوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان اولین اثرات کو وہ خاندانی اثرات (Family Influences.) کا نام دیتے ہیں۔ اس نظریے میں بہت سے امور داخل ہیں۔ اول یہ کہ بچہ اکلوتا ہے یا اس کے اور بھی بہن بھائی ہیں اگر اکلوتا ہے تو یقیناً لاڈلا ہوگا اور اس کی زندگی ویسی ہی ہوگی جو لاڈلے بچوں کی ہوتی ہے۔ یعنی ضدی طبیعت، سست، خود کام نہ کرنے والا، بلکہ ہر کام کے لئے دوسرے کا منتظر کہ وہ اس کا کام کر دیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس کا کوئی بڑا بھائی ہے تو وہ بہت جد و جہد والا ہوگا اور ہمیشہ اس تاک میں رہے گا کہ بڑے بھائی سے آگے نکل جائے یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کو اس بات کا شعور ہوتا ہے کہ وہ چھوٹا ہے یہ کمی وہ دوسرے طریقوں سے پوری کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین کا آپس میں اور اس کے ساتھ تعلق بھی بہت حد تک اثر کرتا ہے۔ والدین کے باہمی تنازع اس کے ذہن پر بہت جلد اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچہ اگر لڑکا ہے تو وہ ماں سے زیادہ محبت کرے گا اور باپ سے کم اور اگر لڑکی ہے تو باپ سے زیادہ پیار کرے گی۔ یہ ایک قدرتی اور نفسیاتی فعل ہے جس کی تصدیق تجربہ بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ جب اور بڑا ہوگا تو اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لیگا اور گھر کے بیرونی ماحول سے متاثر ہوگا۔ اگر وہ خوش شکل اور قد آور ہے تو وہ اپنے میں کوئی کمی محسوس نہیں کرے گا لہذا اس میں کسی طرح کا Complex پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر قد و قامت میں چھوٹا اور صحت میں کمزور ہوگا تو اس کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ اس میں ایک کمی موجود ہے اور وہ احساسِ کمتری - Inferiority Complex. کا شکار ہو جائے گا۔ وہ اس کمی کو دوسرے طریقوں سے پوری کرنا چاہے گا اور اس کوشش اور جد و جہد میں اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جائے گا۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر بھی بڑے آدمی گذرے ہیں یا موجود ہیں ان میں اکثریت پست قد والوں کی تھی مثلاً لیونارڈو ڈاونچی... (Leonardo do Vinci.) اور نپولین (Neopolean.)!

ڈاکٹر ایڈلر زندگی کی کامیابی کا انحصار احساسِ کمتری یعنی Inferiority Complex

پر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نفسیاتی دنیا میں (Supiriority Complex.) کوئی چیز نہیں۔ درحقیقت جو کچھ ہے وہ ہیچ مقداری ہی ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی بڑا بنتا ہے اور اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے وہ عوام سے بالاتر ہے تو اس میں ظاہریت ہوتی ہے جو محض ان کی بناوٹ ہوتی ہے ہم اس کو (Supiriority Complex.) نہیں کہہ سکتے درحقیقت ایسا شخص اپنی خامیوں کا احساس کر دیتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ دوسرے بھی میرے متعلق یہ جانتے ہیں۔ ان کمزوریوں کو چھپانے کے لئے وہ بڑا بن کر دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر ایڈلر اس ہیچ مقداری کو زندگی میں ترقی کا دارومدار سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب تک اس کا احساس انسان کو نہ ہوگا وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ البتہ کچھ عقلمند لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اپنی کمزوریوں کا ایمانداری کے ساتھ اپنے دل میں اعتراف کرلیتے ہیں اور پھر خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں ایک نہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اس مرحلے سے گذرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو جلد اس بات کا شعور ہوجاتا ہے اور پھر ان کی زندگی میں مسلسل سکون اور اطمینان پیدا ہوجاتا ہے وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگ جاتے ہیں اور اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ اور اس قسم کے Complex کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ایڈلر انسان کی مختلف حرکات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہیں ان کا بیان بھی بہت تفصیل چاہتا ہے مگر ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم یہ بیان شروع کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف توجہ مبذول کرادی جائے جس میں اس پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ درحقیقت اس ایک آیت میں وہ تمام لوازمات آجاتے ہیں جو ہیچ مقداری کی وجہ سے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ — اور زمین پر اکڑ کر مت چلو یقیناً تم زمین میں
إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن — شگاف نہیں ڈال سکتے اور نہ ہی پہاڑوں
تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا — کی بلندی تک پہنچ سکتے ہو۔

اس آیتِ کریمہ میں تمام علم النفسیات کا نچوڑ موجود ہے۔ اور تمام نظریے اسی ایک آیت کے گرد گھومتے ہیں۔ قرآنِ کریم فروتنی اور انکساری کا سبق دیتا ہے اور غرور کو تہ وبالا کرنا چاہتا ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ جب ہیچ مقداری حد سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ غرور اور تکبر کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اور اس کے نتائج معلوم۔

ڈاکٹر ایڈلر انسان کی علیحدہ علیحدہ حرکات کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں مثلاً وضع قطع۔ چال ڈھال، بود و باش، نشست و برخاست وغیرہم۔ ان میں ہر ایک میں وہ علامات پاتے ہیں جو ہیچ مقداری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی باقاعدہ تحلیل کرتے ہیں۔ ان تمام حرکات میں وہ انسان کی طبیعت اور فطرت جس پر ماحول نے اس کو ڈھالا ہے اس کی جھلک دیکھتے ہیں۔ مثلاً اکثر مشاہدہ میں آیا ہے کہ پست قد انسان پنجوں پر چلنے کا بڑا عادی ہوتا ہے یعنی وہ غیر شعوری طور پر اپنی لمبائی بڑھا کر دکھاتا ہے یا اگر دوسروں کے ساتھ کسی کمرے میں ہوگا تو بجائے کرسی کے جہاں اور بیٹھے ہیں وہ بلندی تلاش کرے گا اگر کوئی میز پاس ہوگی تو اس پر بیٹھ جائے گا!۔ یہ حقیقتیں ہیں جو ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان حرکات کی وجوہات غیر شعوری ذہن میں موجود ہوتی ہیں جن کا احساس ہر وقت ایسے انسان کو رہتا ہے اور پھر وہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے ان تمام حرکات کا بغور مطالعہ کرکے ڈاکٹر ایڈلر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کی وجوہات معلوم کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرائڈ کی طرح انھوں نے جنس یعنی sex پر بہت کم زور دیا ہے اُن کا زیادہ زور ہیچ مقداری ہی پر ہے جس کو وہ زندگی کا لازمہ سمجھتے ہیں۔ اپنی کتاب What Life Should mean to you. میں وہ اس ہیچ مقداری کو ایک نہایت دلچسپ مثال سے واضح کرتے ہیں۔

موصوف فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک عورت اپنے تین لڑکوں کو لیکر چڑیا گھر گئی۔ سب سے بڑے لڑکے کی عمر دس سال تھی اس سے چھوٹے کی چھ سال اور سب سے چھوٹا جو تھا تو وہ چار سال کا تھا۔ جب وہ شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچے تو ان میں سے ایک نے شیر کے پنجرے کے اندر پتھر

پھینک دیا۔ پتھر کا اندر جانا تھا کہ شیر نے سلاخوں پر چھلانگ لگائی اور دہاڑنے لگا۔ اب بچوں کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ سب سے بڑا لڑکا ماں سے کہنے لگا کہ تم ذرا یہاں ٹھہرو میں جا کر اس کو سمجھاتا ہوں درمیانہ لڑکا جو تھا وہ ماں سے بولا کہ مجھے اور پتھر دو میں اس کو ابھی سیدھا کرتا ہوں۔ سب سے چھوٹا جو تھا تو ماں سے کہنے لگا کہ مجھے اس کی شکل پسند نہیں مجھے گھر لے چلو۔

ڈاکٹر ایڈلر ان بچوں کے بیانوں میں ہیچ مقداری کی جھلک پاتے ہیں جو عمر کے لحاظ سے ہر ایک میں مختلف احساس کا درجہ رکھتی ہے۔ ان سب کو اس بات کا احساس ہے کہ شیر طاقتور اور خوفناک حیوان ہے مگر یہ بچے اس کمزوری کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ غیر شعوری طور پر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ بچے ہیں اور شیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جب انھوں نے شیر کی حرکت پر اظہار خیال کیا تو کسی ایک نے بھی اس کی طاقت کا اعتراف کرنا نہ چاہا۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس یہی ظاہر کیا کہ یہ کیا معمولی سی چیز ہے ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سب سے چھوٹے بچے نے جس کی عمر ابھی چار سال ہی کی تھی یہ کہکر کہ ماں اس کو گھر لے چلے کیونکہ شیر کی شکل اس کو پسند نہیں، اظہار نفرت کیا تو شیر کو ایک معمولی چیز بتا دیا۔ اس نے بھی شیر کو طاقتور اور خوفناک کہنا پسند نہیں کیا۔ اسی مثال میں ڈاکٹر ایڈلر نے تین قسم کی ہیچ مقداری بیان کر دی ہے جو اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ نظریہ ہیچ مقداری بہت دل لگتا ہے اور اس میں بہت سی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اکثر لوگ اس نظریے سے اتفاق نہیں کریں گے اور اسے قبول کرنے میں بہت پس و پیش کریں گے مگر یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ حقیقت سے انکار کرتا ہے اور اپنی کمزوریاں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا ارشاد ہے۔

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہم اس حقیقت سے ناآشنا ہیں جو ہمارے اندر پوشیدہ ہے اور اس کی محض وجہ یہی ہے کہ ہیچ مقداری کا شکار ہو کر ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اپنی مخفی قوتوں کو نشوونما نہیں دے سکتے

اگر انسان نہ سمجھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہیچ مقداری ہیں مستقل طور پر پھنس جاتا ہے اُسے انگریزی میں Obcession اور Fixation کہتے ہیں اور اس کے نتائج Dissociation of Consciousness یا Sphitting of the self میں نمودار ہوتے ہیں، یہ تمام بذاتِ خود ایک مستقل موضوع ہیں مگر ہم ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

دنیا میں جس قدر اختلافات موجود ہیں ان میں اکثریت ایسی ہے جو افراد کی ہیچ مقداری پر قائم ہے۔ اکثر علمار کا اختلاف بھی اسی وجہ سے ہے۔ ہر انسان کو خواہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے یا نہ، اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایک شخص اس سے برتر ہے اور زیادہ شہرت حاصل کر گیا۔ اکثریت ہم میں ایسوں کی ہے جو اپنی فطری کمزوری اور ہیچ مقداری کی وجہ سے اس کو پسند نہیں کرتے اور اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اس کو نیچا دکھایا جائے۔ اس سے اصل میں یہ مقصد نہیں ہوتا کہ واقعی دوسرا شخص لوگوں کی نگاہوں میں گر جائے گا بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ اسے چھوٹا ظاہر کر کے اپنے آپ کو بڑا بنایا جائے۔ یہی ہیچ مقداری ہے جو غیر شعوری طور پر کام کرتی رہتی ہے لیکن جو شخص (اور ایسے اشخاص بھی دنیا میں موجود ہیں) زندگی کے ان اصولوں کو جانتا ہے وہ یکسوئی اختیار کر کے اطمینان سے زندگی بسر کرتا ہے اور دنیا کے بُرا بھلا کہنے پر کان نہیں دھرتا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سُن لیتا ہے مگر کسی کے خلاف زبان نہیں کھولنا پسند کرتا۔ بس یہی ایک علامت ہے عقلمندوں کی اور اس سے ان کی شناخت ہم کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ مطمئن ہوتے ہیں کہ ان میں جو کمزوریاں ہیں وہ انھیں خوب جانتے ہیں اور خاموشی سے انھیں سدھارنے میں لگے رہتے ہیں۔ افراد کو چھوڑ کر اقوام کا بھی یہی حال ہے۔ یہ جنگ و جدال جو ہم دیکھتے ہیں تو یہ بھی ہیچ مقداری ہی پر منحصر ہے۔

اسی طرح ایک قوم جو ترقی کرنے کے بعد سب کچھ کھو بیٹھتی ہے تو وہ اس کمزوری اور کمی کو محسوس کرتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ اُس کو اِس کا شعور نہیں ہوتا مگر جب بھی اُس سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے آپ کو سُدھارنے کی کوشش کرو تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں اتنی اخلاقی

قوت ہی باقی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرے۔ یہ غصہ بھی ہیچ مقداری کی سب سے بڑی علامت ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک دلیر آدمی بہت کم غصے میں آتا ہے ہمیشہ ناتوان اور کمزور آدمی ہی غصہ کرتا ہے۔ ایسی اقوام اپنے ماضی پر نازاں ہوتی ہیں اور فخر کرتی ہیں کہ

"پدرم سلطان بود!"

اب ہم اس ہیچ مقداری ہی کے پہلو کو لیکر دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگیوں میں یہ کس طرح مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

سب سے پہلی بات جس پر انسان کو غور و فکر کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور فعل سے پہلے اس بات کا اندازہ لگالے کہ وہ کیوں یہ کام کرنا چاہتا ہے۔ کیا اس میں ہیچ مقداری کا تو ہاتھ نہیں؟ اگر صرف اسی ایک پہلو پر عمل کیا جائے تو انسان کی زندگی میں ایک اخلاقی ضبط پیدا ہو جائے گا ورنہ اگر وہ بغض و عناد اور حسد کی بنا پر کوئی حرکت کرے گا تو اس کے ذہن میں یقینی طور پر ایک اختلاط اور تذبذب پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر وہ مطمئن ہو کر اپنے مقصد کی طرف بڑھے گا تو اس کے دل میں کسی قسم کا شک شبہ نہیں رہے گا۔ اسی طرح جب اس کے پاس کوئی شخص آئے تو بیشتر اس کے کہ وہ اس کی بات پر دھیان دے اُسے چاہیئے کہ فوری طور پر وہ اس بات کا اندازہ لگائے کہ اس شخص کے آنے کا مقصد کیا ہے اگر وہ اس کی فطرت سے واقف ہے تو اس کو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی اور وہ فوراً اس کے مدعا کی تہہ تک پہنچ جائے گا۔ آخر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ایک خاص وجہ نہ ہو۔ یہاں تک کہ ایک درخت کا پتہ بھی بغیر ہوا کے جھونکے کے یا اس کی ٹہنی ہلانے کے نہیں ہلتا تو جب اس شخص کے آنے کا حقیقی مقصد ہم کو معلوم ہو گیا تو پھر اس کی آمد کی اہمیت معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

معلوم ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں جس قدر بناوٹ ہے تمام ظاہریت ہے اور ظاہریت ہیچ مقداری کا پیش خیمہ ہے۔ بناؤ سنگار حسینوں کی ایجاد نہیں بلکہ بدصورتوں کی اختراع ہے کیونکہ وہ حسینوں سی بھی حسین بننا چاہتے ہیں۔ اصلیت ہر حالت میں اصلیت ہی رہتی ہے چھپ نہیں سکتی۔

ہم نے مقالے کے شروع میں ذکر کیا تھا کہ جدید سائکالوجی میں مزید اضافہ کوئی اتنا نمایاں نہیں ہوا۔ بلکہ وہی پورانے نظریے نئی زبانوں کا جامہ پہن کر سامنے آرہے ہیں ہمیں علم النفسیات کے موجودہ نظریوں کے متعلق علمائے اسلام کی کتابوں میں جابجا یہی باتیں مختلف رنگوں میں ملتی ہیں۔ اگر انھوں نے ڈاکٹر فرائڈ کے بعض نظریوں کو جو اخلاقی سطح سے گرے ہوئے ہیں رد کردیا ہے تو وہ اس زمانے اور تہذیب کی بنا پر تھا ورنہ

کوئی نئی بات نہیں جو ڈاکٹر فرائڈ بیان کرتا۔ ہمارے فقیہوں سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق فیصلہ فرمایا ہے جو اپنے باپ کی بیوی کے ساتھ نکاح کرے۔ ابن السکن کی کتاب الصحابہ میں یہ درج کیا گیا ہے کہ خالد ابن ابی کریمہ نے معاویہ بن قرہ سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد یعنی معاویہ کے دادا کو ایک شخص کی طرف روانہ کیا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا کہ اس کی گردن اڑا کرلے آئے۔

اس حدیث سے اگرچہ باپ کی بیوی حقیقی ماں ثابت نہیں تاہم اُسے والدہ کا رتبہ ضرور حاصل ہے اور ڈاکٹر فرائڈ کے Oedepux Complex. میں حقیقی والدہ کا ذکر ہے مگر وہاں اُس کی اہمیت اس لئے کم ہوجاتی ہے کہ ماں کو بچے سے جدا ہوئے عرصۂ دراز ہوگیا جبکہ بچہ غالباً ایک دو سال کا تھا۔ پھر جب وہ جوانی کے وقت اپنی ماں سے ملتا ہے تو اس پر عاشق ہوجاتا ہے اور اُس کو بیاہ لیتا ہے۔ اس قسم کے امور پر علماء اسلام نے زور نہیں دیا کیونکہ یہ تمام امر اخلاق سے گرے ہوئے تصور کئے جاسکتے ہیں اور دوسرے کہ ایسے نظریوں کا زندگی میں کوئی مفید مقصد نہیں۔

تمام کی تمام احادیث علم النفسیات سے بھری پڑی ہیں اگر ڈاکٹر ایڈلر ان میں سے بعضوں کا مطالعہ کرتے تو شک کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنی Individual psychology. کو وہاں پاکر انگشت بدنداں ہوجاتے۔ میں چند ایک کی مثالیں یہاں دیتا ہوں۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے ان میں سے بعضوں پر نفسیاتی رنگ میں بحث کی ہے۔ احیاء العلوم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ چل کر میرا نکاح پڑھا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے لڑکی کو دیکھ لیا ہے؟ اس شخص نے عرض کیا کہ نہیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ پہلے دیکھ لو تاکہ تمہارے دل میں اُنس پیدا ہو جائے۔ امام غزالی رح اس کی تشریح نہایت تحقیق اور نفسیاتی پہلو سے کرتے ہیں کہ جدید سٹکالوجی بھی شرمندہ رہ جاتی ہے۔

ایک اور جگہ انھوں نے ایک اور حدیث بیان کی ہے کہ اپنے عزیز و اقارب میں شادی مت کرو کیونکہ اس سے ضعیف اولاد پیدا ہوتی ہے[ا]۔ اللہ اکبر۔ ڈاکٹر فرائڈ کی تمام Sexual Psychology اس پر فدا کی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی میں ماہرین سائنس عزیز و اقارب میں شادی Inter marriage کے خلاف لکھ رہے ہیں اور مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک خاندان میں ایک بیماری ہو تو وہ بدستور نسلاً بعد نسل چلی جاتی ہے۔ مگر ذرا وجہ ملاحظہ کیجئے۔ جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی دوررس نگاہ بتاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ رشتہ داری میں ایک حجاب باقی رہ جاتا ہے اگرچہ شادی بھی ہو جاتی ہے اور اس حجاب کی وجہ سے شہوت مکمل طور پر نہیں آتی جس سے آدمی کی ذہنی کیفیت اور بہت حد تک عورت کی بھی ذہنی کیفیت اس طرح ہو جاتی ہے کہ اگر ایسی حالت میں جماع کیا جائے تو جو نطفہ قرار پائے گا وہ کمزور ہو گا۔

آج کل امریکہ میں ایک مذہب جو حرکات و سکنات کا نظریہ رکھتا ہے یعنی .... Behaviourism. کا۔ وہ اس تجربہ میں بہت حد تک کامیاب ہو چکا ہے کہ جماع کے وقت سے لے کر بچے کی پیدائش تک کے عرصہ میں وہ باپ اور ماں پر چند ایک باتوں کا اثر کر کے (Suggestions) جس طبیعت کا بچہ چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ ناممکن معلوم نہیں ہوتا کیونکہ انسانی ذہن پر ایک خاص طریقے سے اگر باقاعدہ اثر ڈالا جائے تو خاطر خواہ انجام حاصل ہو جاتا ہے۔ اچھے بھلے

[ا] امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ہر نقل کردہ روایت کو صحیح حدیث نہ سمجھنا چاہئے۔ اس باب میں ان کا مذہب صوفیائے کرام کا سا ہے۔ (برہان)

انسان کو آپ پاگل کہئے اور کچھ عرصہ تک اس کو کہتے رہئے تو وہ ضرور ایک وقت پاگل ہوجائیگا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے ذہن میں ہی نہ صرف خیال پیدا کردیا جائے بلکہ اس کو یقین بھی کرادیا جائے۔ عورت کے ذہن پر اثر جو ہوگا وہ ہمیشہ رحم پر اثر کریگا اور رحم کی حرکت نطفہ پر اثر کرے گی۔

بہرحال اگر یہ سب کچھ درست ہے تو یہی حقیقت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے واضح ہوچکی تھی۔ ابو علی سینا اپنی تصنیف کتاب النفس میں اس قسم کے نظریے پیش کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہی نظریے آج پھر از سر نو تازہ ہو رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ علوم جو فارسی اور عربی میں موجود تھے اب انگریزی، جرمن اور فرنچ میں منتقل ہو رہے ہیں اور عوام چونکہ ان زبانوں سے آشنا نہیں، ہماری حالت محض ایک جاہل کی سی ہے جو ایک نئی بات سن کر چونک اٹھتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس میں نئی بات کوئی نہیں آپ کو کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس میں زندگی کے نفسیاتی پہلو ایک افادیت نہ رکھتے ہوں۔ ایک چھوٹی سی حدیث اور اس وقت یاد آگئی ہے جو اسی موضوع سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میزبان کے گھر جاؤ تو جس طرف سے کھانا آتا ہے اس طرف پیٹھ کرکے بیٹھو، مبادا کہ گھر میں ملازم نہ ہو اور گھر کی عورتیں ہی کھانا بر تا رہی ہوں اور شاید تمہاری نظر پڑ جائے۔ ان احادیث میں کس بلا کا مطالعہ ہے انسانی نفسیات کے متعلق قدم قدم پر Complexes کو روک دیا گیا ہے اور ایک ایسی صاف راہ بنادی گئی ہے جو زندگی کے لئے بہت آسان ہے۔

کمالِ حسن تری راہ گذر کو کیا کہئے!

اس قسم کی بے انتہا مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح ڈاکٹر ایڈلر نے اپنی Individual psychology) کو مختلف جزئیات میں تقسیم کردیا ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان بھی مختلف ابواب میں منقسم ہوچکے ہیں اور ہر باب ایک مستقل نفسیاتی پہلو رکھتا ہے۔ القصہ یطولہا علم النفسیات کا افادی پہلو بس یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایماندارانہ زندگی بسر کرے اور ہر قسم کی ظاہریت اور بناوٹ سے بچے۔ احادیث کا یہ نفسیاتی پہلو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے ہم کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی پہلو پر بھی اس قدر روشنی نہیں ڈالی گئی جتنی روشنی ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔ سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے رنگ اصلی میں پہچانے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ تو پھر جس نے اپنی پہچان کے بعد اپنے رب کو پہچان لیا تو کیا ہی بڑی پہچان ہے وہ۔

مولانا نانوتویؒ سرسید کی نظر میں

از جناب سید محبوب صاحب رضوی، دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات پر سرسید نے "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتویؒ کے متعلق سرسید نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی کے علم و عمل اور صلاح و تقوٰی کا جو مقام متعین کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اُس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو اُن حضرات کے مابین ہوئی ہے، اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لا دیں تو میری سعادت ہے میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا" [۱]

مذکورہ مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتویؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ:۔

---

[۱] تصفیۃ العقائد ص ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف۔

"ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی الوالعزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فسادِ عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں" [1]

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرۂ صدر مضمون درج ذیل ہے :-

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری سے بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو رہا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئیگا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے، لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی اُن کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

---

[1] تصفیۃ العقائد ص ۶ مکتوب حضرت نانوتویؒ بنام منشی محمد عارف صاحب۔

زمانہ تحصیلِ علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہلِ فضل و کمال تھے، ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابندِ شریعت اور سنت تھے اور اور لوگوں کو بھی پابندِ شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی اُن کو خیال تھا انھیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے، وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں رکھتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی اُن کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائلِ خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ وہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ بُرے کام کرتا ہے یا بُری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے بُرا جانتے تھے۔ مسئلہ حُب للّٰہ اور بغض للّٰہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں

اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا اُن لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے، ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔"

(نقل باصلہ از علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص ۴۶۷ و ۴۶۸)

ادبیات

منظرِ بہار

از جناب ماہر القادری

صُلصُل و دراج و بلبل فوج فوج — رنگ و بو و رقص و نغمہ موج موج
در ہوائے شاخساراں نغمگی — ہر گُل و سرو و صنوبر تازگی
کُنجِ صحنِ باغ چوں محرابِ کاخ — غنچہ ہائے نوشگفتہ شاخ شاخ
نرگسِ شہلا، نگارِ مست چشم — لالۂ احمر، بُتِ آلودہ خشم
می کند شوخی صبا زود و شتاب — شبنم از احساسِ غیرت آب آب
سبزہ از جوشِ نمو در اہتزاز — می دمد گُل از رہِ شوخی و ناز
ایں فروغِ نسترین و نارون — آں بہارِ ضیمران و یاسمن
خار و خس بدمست از کیفِ بہار — قلقلِ میناست در صوتِ ہزار
ہر خیاباں روکشِ خلدِ بریں — ہر روش، فردوس بر روئے زمیں
برگہا چوں پردہ ہائے بزمِ نُور — از فروغِ حُسن بر ہر شاخ، طُور
ہر نہالِ نرم و نازک گلفروش — صحنِ گلشن لاجورد و سبزہ پوش

برگ و گل بر صنعتِ خالق گواہ
می سراید اَشہدُ اَن لا اِلٰہ

غزل

جناب آلم مظفرنگری

گرفتارِ قفس کی فکر ہے اربابِ گلشن کو
مگر بھولے ہوئے ہیں سب گرفتارِ نشیمن کو

علاقہ اہلِ دل سے کیا ہوس کارانِ پرُفن کو
کوئی نسبت نہیں چاکِ جگر سے چاکِ دامن کو

نہیں ساحل کیا کرتی ہیں پیدا بحرِ ہستی میں
وہ موجیں چیر کر بڑھتی ہیں جو دریا کے دامن کو

یہ موجِ بادۂ گلرنگ ہے یا طور کا جلوہ
چھپا رکھا ہے کیا مینا میں ساقی برقِ ایمن کو

تری آنکھوں کو اے صیاد اشکِ خوں کا دھوکا ہے
سرِ مژگاں لئے بیٹھا ہوں میں تصویرِ گلشن کو

چمن میں کوئی بھی مجھکو نہیں دیتا جواب اس کا
جلایا کس خطا پر برق نے میرے نشیمن کو

اسیری میں بھی ہو جاتا ہے حاصل لطف سیرِ گل
قفس میں بیٹھکر جب یاد کر لیتا ہوں گلشن کو

کچھ اس ترکیب سے دو چار تنکے میں نے رکھے ہیں
کہ سجدے کر رہی ہیں بجلیاں شاخِ نشیمن کو

مصیبت میں سہارا ڈھونڈتے ہیں ڈوبنے والے
پکڑ لیتی ہے موجِ بے اماں ساحل کے دامن کو

آلم آزاد ہو جاؤں گا میں بھی قیدِ ہستی سے
کسی دن توڑ کر رکھدوں گا اس زنجیرِ آہن کو

تبصرے

رسالہ اخلاقیات برائے جماعت دہم | مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۶۳ صفحات قیمت پڑھی نہیں گئی۔ پتہ :۔ کتاب محل، چارکمان حیدرآباد دکن۔

یہ ظاہر ہے کسی انسان کی زندگی کی کامیابی یا ناکامیابی اور اس کا نیک و بد ہونا اُس کی سیرت کی تعمیر و تکمیل پر موقوف ہے۔ اور سیرت کی تعمیر و تشکیل نتیجہ ہوتی ہے اچھی بری عادتوں کے رسوخ اور ان کی پختگی کا۔ پھر علمارِ نفسیات کے نزدیک یہ بھی مسلم ہے کہ عادات کی پختگی اور اُن کے توسط سے تعمیرِ سیرت کا بہترین زمانہ وہی ہوتا ہے جبکہ عمر کا مسافر بچپن کے ساتھی سے گلے مل کر رخصت ہوتا اور آغازِ شباب کے ایک نئے ساتھی کو اپنی رفاقت کے لئے اختیار کرلیتا ہے۔ سیرت کی تعمیر جس طرح دینی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ دنیوی زندگی کی کامیابی کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ اس بنا پر یہ نہایت ضروری ہے کہ تعلیم کی درمیانی منزل میں ہی طلبا اور طالبات کو علمِ اخلاق کے اہم اصول و مبادی سے واقف کردیا جائے تاکہ شروع میں ہی یہ چیزیں ذہن نشین ہوجائیں اور مستقبل کی زندگی اسی سانچہ میں ڈھل سکے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ مقصدِ تالیف اور حقِ موضوع کی ادائیگی کے اعتبار سے یہ بہمہ جہت کامیاب تصنیف ہے۔

کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں سے دس ابواب میں ملکۂ شجاعت و عفت اور عدالت سے متعلق مختلف فضائل کا بیان۔ ان کی تشریح و توضیح۔ افادیت۔ انھیں حاصل کرنے کے طریقے اور ان کے بالمقابل جو رذائل ہیں انھیں دور کرنے کی تدبیروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ زبان عام فہم و

سلیس اور اندازِ بیان دلنشین و موثر ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ دسویں جماعت کے نصاب درس میں لازمی طور پر اسے شریک کیا جائے۔ ہر مذہب کے طلبا و طالبات اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آخر کے باب میں پیشے کے انتخاب سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے بعد ایک باب میں اشعار کا جو حل بتایا گیا ہے وہ خود ایک مستقل افادیت کے حامل ہیں۔

تاجدار دو عالم | مصنفہ عبدالرحمٰن عزام بے تقطیع خورد ضخامت ۲۳۹ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ:۔ نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

عبدالرحمٰن عزام بے کا نام عرب لیگ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آج کل اخباروں میں اکثر آتا رہتا ہے۔ موصوف نے کچھ عرصہ ہوا قاہرہ کے ریڈیو اسٹیشن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر پندرہ تقریریں نشر کی تھیں جو جامع اور مدلل ہونے کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی تھیں، بعد میں یہی تقریریں بطل الابطال کے نام سے کتابی شکل میں شائع کردی گئی تھیں۔ فاضل مقرر نے ان خطبات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صفات و اخلاقی فضائل و کمالات پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے جس سے غیر مسلم سامعین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے عبارت قَلَّ وَدَلَّ کا مصداق ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اصل عربی سے اردو میں ترجمہ ہے جو ظہوری وجدانی صاحب نے کیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ اور رواں ہے۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اُسے پڑھ کر لطف اندوز اور نصیحت پذیر ہوں گے۔

علامہ راشد الخیری | مرتبہ پروفیسر وقار عظیم صاحب ایم اے تقطیع خورد ضخامت ۲۲۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ خاتون کتاب گھر۔ دہلی

مولانا راشد الخیری مرحوم دورِ آخر کے صاحبِ طرز ادیب اور نامور انشاپرداز تھے انھوں نے اگرچہ مختلف مضامین پر قلم اٹھایا اور ایک بڑی حد تک ان سب میں کامیاب ہی رہے لیکن جیسا کہ ان کو "مصورِ غم" کہا جاتا تھا۔ درحقیقت غم والم کی نقاشی اور مصوری میں وہ اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم کی انشا اور طرزِ نگارش نے اردو زبان کے اسالیبِ بیان میں ایک بالکل نئے

طرز کا اضافہ کیا تھا جو بذاتِ خود نہایت موثر، دلکش اور جذبہ آفریں تھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مولانا کے اس مخصوص طرز، اس کی خصوصیت اور اسی سلسلہ کے دوسرے مباحث پر گیارہ مقالات ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ملک کے معروف اربابِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں ہمارے خیال میں جہاں تک موضوع کی وسعت اور گہرائی کا تعلق ہے یہ سب مقالات مل کر بھی تشنہ ہی ہیں۔ ضرورت ایک مفصل اور ضخیم کتاب کی ہے جس میں مرحوم کی انشا، اس کے مختلف پہلو اور ان کی ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔ تاہم سنجیدہ اور پر از معلومات مضامین کا مجموعہ ہونے کے اعتبار سے یہ کتاب بھی باغنیمت ہے امید ہے اربابِ ذوق و ادب اس کی قدر کریں گے۔

تصویر، علم و عقل کی روشنی میں | از مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی تقطیع خورد ضخامت ۴۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶ر پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن۔

اس رسالہ میں لائق مصنف نے جمالیاتی نقطۂ نظر سے فلسفیانہ انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ جاندار اشیاء کی تصویریں شخصیت پرستی کا سبب بننے کے علاوہ ہمارے ذوقِ مشاہدۂ جمال اور جذبۂ اظہارِ لذتِ جمال دونوں کے اس درجہ مشتعل ہونے کا سبب ہوتی ہیں کہ ان سے طرح طرح کی اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور آخرکار ہمارا پورا نظامِ معاشرت سرتاسر گندہ اور متعفن ہو کر رہ جاتا ہے، ان کے برخلاف غیر ذی روح اشیاء کی تصویریں ہمارے ذوقِ جمال کو مناسب طریقہ پر تسکین دیتی ہیں۔ اس بنا پر پہلی قسم کی تصویریں سخت مضر اور شرعاً حرام ہیں اور دوسری نوع کی تصویریں مفید اور شرعاً جائز اور مباح ہیں۔ زبان و بیان کے شگفتہ ہونے میں کلام نہیں لیکن دلائل میں اقناعیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

بُرہَانؔ

جلد ہفدہم شمارہ (۳)

ستمبر ۱۹۴۶ء مطابق شوال المکرم ۱۳۶۵ھ

فہرست مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۱۳۰
۲۔ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۱۳۳
۳۔ اقبال اور نظریۂ سعی و عمل	جناب مولوی شیخ وحید احمد صاحب رئیس شیخوپورہ	۱۵۸
۴۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعۂ ایذارسانی اور برارت کی تحقیق	جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی	۱۷۱
۵۔ امانتِ الہیہ	جناب مولوی محمود بن عبدالرشید شہید دہلوی	۱۷۸
۶۔ ادبیات :-		
فتنۂ یہود	جناب مولانا سیماب صاحب اکبر آبادی	۱۸۸
۷۔ تبصرے	م - ح	۱۸۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

نظرات

آج کل عام فرقہ وارانہ کشیدگی اور آئے دن کے فسادات کی وجہ سے ملک میں جو افسوسناک صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے اس نے ہر جگہ شہری زندگی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے لیکن ہر چیز کی طرح موجودہ صورتِ حال کے بھی کچھ اسباب و وجوہ ہیں جن پر دونوں فرقوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک آزادی کیلئے جدوجہد کا تعلق ہے مسلمانوں نے بڑی فراخدلی اور دلیری کے ساتھ ہندوؤں کا ساتھ دیا ہے اور اس منزل کے کسی ایک مرحلہ پر بھی ان کا قدم اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہیں رہا۔ انھوں نے اقلیت میں ہونے اور قومی لحاظ سے کمزور ہونے کے باوجود قربانیاں دیتے وقت یہ سوال بھی نہیں اٹھایا کہ خود ان کے اپنے حقوق کیا ہیں اور حصولِ آزادی کے بعد اس میں خود ان کا اپنا حصہ کیا ہوگا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر عمل درآمد ہونے کے بعد اُن کو اپنے جنگِ آزادی کے ساتھیوں کے طرزِ عمل و حکومت سے پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ ان کو اپنے حقوق اور ان کی حفاظت کے مسئلہ کو یونہی لیت و لعل میں نہیں رکھنا چاہئے اور عاقبت اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ عرصہ دراز کی جدوجہد کے بعد جو چیز مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی ہے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ طے کر لینا چاہئے کہ اس میں کس کا کتنا حصہ ہوگا! اب دونوں فرقوں میں کشیدگی اور اختلاف کی خلیج حائل ہوگئی اور بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ اس کو دور کرنے کی کوئی موثر کوشش عمل میں لائی جاتی۔ کچھ اندرونی اور بیرونی عوامل ایسے پیدا ہوتے رہے کہ یہ خلیج روز بروز وسیع تر ہی ہوتی رہی۔

ایک طرف ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں یہ کشمکش بڑھتی چلی جا رہی تھی اور دوسری جانب دنیا بین الاقوامی سیاسیات کا رخ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ جنگ جب ختم ہوئی ہے تو فیشزم اور نیشنل سوشلزم تو اس کی آگ میں جل بھن کر خاک سیاہ ہو ہی چکے تھے لیکن شہنشاہیت بھی نیم مردہ ہو چکی تھی اور اب ضروری تھا

کہ اس کا اثر ہندوستان ایسے عظیم الشان ملک پر بھی پڑے۔ وقت کی طبعی رفتار کا یہ فطری تقاضا تھا جسے کوئی قوت ہزار جتن کے بعد بھی روک نہیں سکتی تھی۔ آج ہندوستان میں آئینی انقلاب جس صورت میں رونما ہوا ہے وہ وقت کے اسی تقاضہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ وقت اپنے تقاضوں کے پورا کرنے میں ہمیشہ سے انتہا درجہ کا مستبد واقع ہوا ہے اُسے کبھی اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے فیصلہ سے کوئی قوم بگڑتی ہے یا سنورتی ہے یا کوئی قوم اس سے خوش ہوگی یا ناراض! ولیس علی ریب الزمان معول۔

بہر حال آج جبکہ ہندوستان آئینی انقلاب کے دروازہ میں داخل ہوچکا ہے اور اس کی وجہ سے اس ملک پر اقتدارِ اعلیٰ کی لگام انگریز کے ہاتھوں سے منتقل ہوکر ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں میں آگئی ہے جس میں اکثریت اور قوی عنصر بہرحال ہندوؤں کا ہی ہے۔ اگر مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ

محفل اُن کی "ساقی" اُن کا آنکھیں میری باقی ان کا

تو کوئی شبہ نہیں کہ اُن کا یہ احساس بالکل فطری اور طبعی ہے جس پر انھیں کوئی ملامت نہیں کرسکتا۔ اس مرحلہ پر ہندوؤں کو ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ اس ملک کی سرزمین سے جو تعلق ان کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے وہ تقریباً ایک ہزار سال سے یہاں رہتے بستے چلے آئے ہیں انھوں نے آٹھ سو سال تک یہاں حکومت کی ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ انھوں نے یہاں آباد ہوکر اس ملک کی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا، کلچر کو ترقی دی، علوم و فنون کو رائج کیا۔ ادب اور فنِ تعمیر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ انھوں نے اس ملک کے پرانے باشندوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی یادگاریں یہاں کی مشترکہ زبان اور مخصوص فنِ تعمیر کے نمونوں اور غیر مسلموں کے لئے فرامین اور جاگیروں کی شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس سرزمین کے چپہ چپہ پر ان کی عظمت، بزرگی کے نشان بکھرے ہوئے ہیں جن کی زبان سے یہ کاروانِ رفتہ آج بھی یہ کہتا ہوا سنائی دے رہا ہے۔

تلك آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

اس بنا پر مسلمانوں کو بھی اس سرزمین پر حکومت کرنے اور عزت و خودداری کی زندگی بسر کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی قوم کو ہے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد

ہندوؤں کا یہ فرض ہے کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اور اس وقت حکومت پر بھی انھیں کا قبضہ ہے اس بنا پر وہ مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے اور اس طرح ان کا اعتماد حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ مسلمان اپنی فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے بہت کشادہ دل اور فراخ حوصلہ ہوتا ہے اگر فریقِ ثانی کی طرف سے ایمانداری دیانت خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اس قسم کی کوشش عمل میں آئی تو موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا بہت جلد خاتمہ ہو سکتا ہے ورنہ یہ واقعہ ہے کہ اگر آج شیواجی کی ذہنیت کے "شرارِ بولہبی" کو احساسِ برتری کے دامن سے ہوا دینے کی کوشش کی گئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت کے قانونِ ازلی کے مطابق وہ عالمگیر کی فطرت "اسد اللہی" کے پھر بیدار ہونے کا سبب نہ بنے گی۔

دوسری جانب مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ محض جذبات سے مشتعل ہو کر حقائق کو نظر انداز کر دینا شیوۂ فرزانگی نہیں ہے انھیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ گذشتہ دو سو برس میں یعنی ہندوستان میں انگریزوں کے عمل دخل سے لیکر آج تک کتنی مرتبہ انھوں نے اپنی عظمتِ گذشتہ کو سنبھالنے اور اسے پھر سے بحال کرنے کی اجتماعی کوششیں کیں لیکن ان کا انجام کیا ہوا! جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ نے شکست کھائی، سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو نے جامِ شہادت نوش کیا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظیم الشان تحریک ناکام رہی، جنگِ پلاسی سے پورے سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں اُن کا جوشِ خود شی پھر ابل پڑا لیکن اس مرتبہ وہ شکست فاش ہوئی کہ اس کا زخم اب تک مندمل نہیں ہو سکا۔ اگر ماضی کے واقعات سے مستقبل کیلئے کوئی عبرت حاصل کی جا سکتی ہے تو انھیں سوچنا چاہئے کہ یہ وقت اُن کے لئے انتہائی روشن خیالی، بیدار مغزی اور سمجھ بوجھ سے کام لینے کا ہے۔ اشتعال کی حالت میں کوئی ایک غیر مآل اندیشانہ حرکت ایک عظیم خسارہ اور تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ڈسپلن، یکجہتی اور اتفاق، ہمت و عزم اور ساتھ ہی روشن دماغی اور وقت شناسی ان چیزوں کی جو ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ پھر مسلمانوں کو یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ وہ کسی حالت میں بھی اسلام کے احکام سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

لا یجرمنکم شنأن قوم علیٰ ان لا تعدلوا — کسی قوم کا بغض تم کو اس پر مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو

اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ — (نہیں) تم انصاف کرو۔ یہی چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر ہماری سیاسی جد و جہد اس نہج پر چلنی چاہئے کہ ہمیں اس مقصد میں کامیابی بھی ہو جائے اور ساتھ ہی اخلاق فاضلہ کا جو ورثہ ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا ہے اور جو ہمارا قومی طغرائے امتیاز ہے اس پر بھی کوئی حرف نہ آنے پائے۔ "جام و سندان باختن" ہر چند دشوار سہی لیکن مسلمانوں نے بارہا یہ کھیل کھیلا ہے آج انھیں پھر اپنی اسی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

اگر ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان چند بنیادی معروضات کو پیش نظر رکھیں تو امید ہے سیاسی اقتدار کی ۴۶ء

[حاشیہ:] ۴۶ء عادلانہ تقسیم کے متعلق ان میں جو کشمکش جاری ہے وہ بغیر اس کے بھی جاری رہ سکتی تھی کہ آئے دن یہاں خونریز جھڑپیں ہوں اور آئے دن حملوں اور فرقہ وارانہ فسادات کے باعث روزانہ شہری زندگی خطرہ میں پڑے۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

قرآن حکیم، خدا کا آخری پیغام ہے، بین الاقوامی اخوت کا علمبردار، کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کا مناد، اور دینی و دنیوی سعادت و فلاح کا کفیل ہے وہ ہر ایک شعبہ زندگی کا مصلح ہے اور ہر ایک گوشہ حیات کے لئے مشعلِ راہ۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے، ہمارا ایمان ہے اور ہمارے ایقان واذعان کا سنگِ بنیاد ہے اور یہی نہیں بلکہ کائناتِ مذہب و ملت اور عالمِ روحانیات کے دلائل و نظائر اور شواہد و براہین اس پر ناطق و شاہد ہیں۔

تاہم یہ سوال اپنی جگہ پر اہم ہے کہ خود قرآنِ کریم اپنے متعلق کیا کہتا ہے اور اُن تمام اوصاف و کمالات کے بارہ میں ـــــ جن کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا ہے ـــــ خود اس کا اپنا فیصلہ اور اس کی اپنی اندرونی شہادت کیا ہے؟

اس سوال کی اہمیت خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کسی بزرگ سے بزرگ تر انسان کا بھی کلام نہیں ہے بلکہ خدائی قانون اور "کلام اللہ" ہے۔

کون نہیں جانتا کہ صفت، ذاتِ موصوف کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتی ہے کہ موصوف کے تمام شئون وکیفیات صفت کے شئون وکیفیات بن جاتے ہیں۔ صوفیائے کرام میں ہمہ اوست اور ہمہ از وست کی بحثیں اسی ربط اور وابستگی نے پیدا کیں اور وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود اور تنزیہہ کے نازک اور فلسفیانہ مسائل اور "لاعین ولا غیر" کے کلامی دقائق اسی ربط و اتصاف کے رہین منت ہیں۔

پس جبکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص و عیب سے پاک اور منزّہ ہے تو لازمی ضروری ہے کہ اس کا کلام بھی ہمہ قسم کے نقص و عیب سے بالاتر اور کامل و مکمل ہو، نیز وہ باہر کی شہادتوں اور خارجی دلیلوں سے بے نیاز اپنی حیثیتِ کمال کو خود ہی بدرجۂ اتم و اکمل ظاہر کرتا ہو تاکہ کائناتِ انسانی اس کے دعویٰ کو اسی کی پیش کردہ دلائل و براہین کی کسوٹی پر کس کر اس کی صداقت کا امتحان کرنے میں حق بجانب ٹھیرے۔ اس بنا پر آج کی صحبت میں ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن نے اپنی اس حیثیت کے بارہ میں کیا کچھ کہا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟

قرآنِ حکیم کی اس امتیازی خصوصیت پر قلم اٹھانے کے لئے سب سے پہلے اس حقیقت کو پیشِ نظر لانا ضروری ہے کہ جبکہ کائناتِ مذہب و ملت کا یہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ خالقِ کائنات صرف ایک ہستی ہے اور اس وحدت میں کثرت کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور وہ ہستی مختلف زبانوں اور تعبیروں میں " اللہ " " الوہیم " ایل " اہورمزدہ " اور " ایشور " کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر ایک موحد اور حنیفی یہ عقیدہ رکھتا ہے تو مشرک اور بت پرست بھی اس کا انکار نہیں کرتا اور اگرچہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں بتوں، دیوتاؤں، اوتاروں کی شکل میں خدا کی ہستی کو تقسیم کرتا رہتا ہے تاہم یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کائناتِ ہست و بود کا خالق و مالک ایک اور صرف ایک ہے۔ چنانچہ جب مشرکین عرب سے یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ بتاؤ " زمین و آسمان کس نے بنائے ؟ " یہ کہو کہ " تم کو کس نے پیدا کیا ؟ " یہ جواب دو کہ " زمین و آسمان کا مالک کون ہے ؟ اور کائنات کی حکومت کس کے قبضہ میں ہے ؟ " تو ان سب سوالات کا جواب وہ یہی دیتے تھے " اللہ نے سب کچھ بنایا ہے وہی تمام زمین و آسمان کا مالک ہے، وہی کائنات کا حاکم و بادشاہ ہے " گویا ان کے پاس ایک موحد کی طرح " اللہ " کہنے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موحدین و مشرکین ہی نہیں بلکہ منکرینِ خدا بھی عالم کون و فساد کی اس کثرت میں وحدت کے معترف اور اس نیرنگی و بوقلمونی کائنات میں قدرت کی ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اس گروہ نے مادہ اور اس کی حرکت پر

بھروسہ کرتے ہوئے نیچر اور قانونِ قدرت کی تمام کارفرمائیوں کو اس کے سپرد کرکے یقین کر لیا تھا کہ اس تمام مادی کثرت میں بھی وحدت کارفرما ہے۔ مگر جب ان کے خدائے قدرت (سائنس) نے جوہر فرد (ایٹم) کو توڑ کے یہ ثابت کر دیا کہ جس کو آج تک سائنس عنصر اور جوہر فرد سمجھتی اور اسی پر کائنات کی ہست و بود کو منحصر جانتی آئی تھی غلط محض تھا اور یہ (جوہر فرد) بھی مرکب ہے تو اب ان کو بھی اس اعتراف کے سوائے کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ اس عالم ہست و بود میں مادہ سے بالاتر کوئی وجود ہے اور اس کی یکتا اور ہم آہنگ قدرت اس کائنات پر کارفرما ہے۔

اب یہ جدا بات ہے کہ خدا کے اقرار سے بچنے کے لئے اس کا نام انرجی (طاقت) رکھ لیجئے یا پردۂ فرد اٹھنے سے قبل اصل حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے براہ راست خدا اور اس کی وحدتِ قدرت کی کارفرمائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیجئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ براہ راست خدا کا اعتراف کیجئے یا بالواسطہ اس کو دوسرے ناموں سے یاد کیجئے۔ عالم مادیات کے ساتھ عالم روحانیات کے اعتراف کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کسی کثرت یا دوئی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ "وحدت" اور سرتاسر "وحدت" ہے خواہ اس کی قدرت کو قانونِ قدرت کہہ لیجئے یا ناموسِ فطرت یا اس کا نام نیچر رکھ لیجئے یا قرآن کی اصطلاح میں "فطرۃ اللہ" سے تعبیر کر لیجئے۔ ہر حالت میں یکرنگی، یکسانیت بلکہ "اکائی" کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔

اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جب اس جہان اور کائنات کا خدا ایک اور وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے تو بلاشبہ اس کا قانونِ قدرت بھی ایک ہے اور وہی قانون عالم مادیات میں کارفرما اور وہی کائناتِ روحانیات و مذہبیات پر جاری و ساری ہے اور جس طرح اور جس حیثیت سے اس کا قانونِ فطرت مادیات کے لئے دلیل راہ بن سکتا ہے اسی طرح روحانیات کے لئے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یہی قادرِ مطلق کی وحدتِ قدرت پر روشن دلیل اور قوی برہان ہے۔

اس مختصر مگر حقیقت افروز تمہید کے بعد ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے اپنے

متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو نوامیسِ الہیّہ کے قانونِ وحدت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے حق و صداقت کا امتحان کریں اور "وحی الہی" کے دعویٰ کی حقانیت کو آزمائیں۔

الکتاب اور ھدیٰ | قرآنِ عزیز نے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں خود کو دو اسماءِ صفات کے ذریعہ روشناس کرایا ہے یعنی وہ "الکتاب" ہے اور "ھدیٰ" ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے "الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الم۔ یہ "الکتاب" ہے اس کے کتاب الہٰی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ متقیوں کے لئے "ھدیٰ" ہادی و راہنما ہے"۔

قرآنِ عزیز، کتاب ہے اس لئے کہ وہ تحریر میں لائی جا سکتی ہے اور تحریر میں لائی جاتی ہے اور "مابین الدفتین" لکھی ہوئی نظر آتی ہے، وہ کتاب کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب اس عالمِ ہست و بود پر فکرِ بلند سے نظر ڈالئے تو یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرتِ انسان تمام موجودات کے مقابلہ میں جن خصوصیات کا حامل ہے اور جو خصائص اس کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں ان میں سب سے زیادہ وقیع یہ خصوصیت ہے کہ انسان کی فطرت مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک اجتماعی نظام کو چاہتی ہے کہ اس کے بغیر جوہرِ انسانیت رونما نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اگر کسی نظام کے بغیر زندگی بسر کرے تو اس کے اور حیوانات کی زندگی کے درمیان کوئی ایسا امتیاز باقی نہیں رہ سکتا جو اس کے جوہرِ انسانیت کو نمایاں کر سکے اور وہ بھی وحشی حیوانوں یا پالتو جانوروں کی طرح ایک بولتا (ناطق) ہوا حیوان ہو کر رہ جائے گا۔

اور یہ نظام جب عقل کی راہنمائی میں انسانی دماغوں اور دماغی کاوشوں سے عالمِ وجود میں آتا ہے تو "دستور"، "آئین" اور "قانون" کہلاتا ہے اور مادی ترقیات کے ارتقائی منازل میں ہڈیوں، ٹھیکریوں، کھالوں، پتھروں، بھوج پتروں اور کاغذوں پر لکھا جا کر کتاب دستور و آئین کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

یہی وہ دستور و آئین ہے جس کے پیشِ نظر اقوامِ انسانی کے زمانہ ہائے تاریخ کو تنزل سے ترقی اور پستی سے بلندی کی جانب گامزن بتلایا جاتا اور ہر دورِ تاریخی کو ایک دوسرے سے موازنہ کر کے

قوموں کی پستیٔ فکر و تنگیٔ نظر یا بلندیٔ فکر و وسعت نظر کا فتویٰ صادر کیا جاتا اور اقوام کی ذہنی پستی و بلندی کے لئے معیار قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن عقل سلیم اور فطرتِ مستقیم یہ بھی راہنمائی کرتی ہے کہ جبکہ انسانی وساتیر و قوانین خود انسانوں کے اپنے دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں تو اس لئے انسانوں کے جذباتِ رقابت اس کو گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنے ہم جنس کے بنائے ہوئے قوانین کو اپنے لئے اٹل اور ناگزیر سمجھیں چنانچہ حکومتوں کے انقلابات اس جذبہ کی غمازی کرتے رہتے ہیں اور ایک ہی حکومت کے نت نئے احکامات اور قوانین تغیرات اس حقیقت کو بے نقاب بناتے رہتے ہیں حتیٰ کہ خود ایک قوم کے اندر بھی پارٹیوں کا تصادم ایسی رقابت کا رہینِ منت نظر آتا ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ کوئی ایسا نظام منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جو انسانی عقل و فکر کی رقابتوں سے بالاتر خدائے کائنات کی جانب سے نازل ہو کر عقل و فکر کی رہنمائی کرے اور جو فطرت کی مطابقت و ہم آہنگی سے بھی سرِ مو متجاوز نہ ہو۔

نیز فطرتِ عالم اور قانونِ قدرت کا تقاضا ہے کہ اس کائنات کا اگر ایک ہی خالق و مالک ہے تو بین الاقوامی اتحام اور عام اخوتِ انسانی کے پیشِ نظر از بس ضروری ہے کہ ملکوں، قوموں، قبیلوں اور جرگوں کے جدا جدا قوانین اور رقیبانہ کشمکش کے حریفانہ وساتیر و آئین کی جگہ خالق کائنات کی جانب سے ایک ایسا دستور اور ایسی کتابِ آئین موجود ہو جس کے اساسی اور بنیادی قوانین اخوتِ عام اور انسانیتِ کاملہ کا سبق دیتے ہوں اور تمام عالمِ انسانی اس کی روشنی میں اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر کے جوہرِ انسانیت کے طغرائے امتیاز کا ثبوت بہم پہنچا سکے۔

وہ کسی انسان کی جانب منسوب نہ ہو کہ نوعِ انسانی کی باہمی رقابت کا شکار بن کر برہمیٔ نظام کا باعث ہو جائے اور اس کی تعلیم کسی جغرافی، ملکی اور نسلی امتیازات کے اندر محدود نہ ہو کہ عالمگیر اخوت کی بجائے وطنی رقابت کی داعی بن جائے اور اقوام کے مابین آویزش و کشمکش کی بنیاد ثابت ہو۔

قرآن عزیز اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے "کتاب" دستور و آئین ہوں اور انسانی دماغوں اور دماغی کاوشوں سے بالاتر خدائے انسانیت کا عالمگیر قانون ہوں۔ پس اگر تم دنیوی اور مادی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے خود ساختہ قوانین اور کتاب دستور و آئین کے محتاج ہو تو بلاشبہ مادی اور روحانی نظام میں فطری مطابقت پیدا کرنے اور جوہرِ انسانیت کو بلند سے بلند تر بنانے کے لئے ایسے دستور و آئین اور کتاب قوانین کے محتاج ہو جو انسانی رقابتوں، قومی عصبیتوں اور ملکی و نسلی عداوتوں سے بالاتر "خدائی کتاب" اور "الٰہی قانون" ہو کر کائناتِ انسانی کے سامنے آئے۔

پس قرآن کہتا ہے کہ میں وہی کامل و مکمل "کتاب" ہوں۔ "کتاب" عربی لفظ ہے جس کے متعدد معانی ہیں، یہ "فرض" کے معنی میں آتا ہے

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ — بلاشبہ نماز ہے مومنوں پر فرض
كِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ — موقّت۔

اور "حجت و برہان" کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

فَأْتُوْا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ — اگر تم سچے ہو تو لاؤ اپنی دلیل اور حجت

اور اس کا اطلاق "مدت" پر بھی ہوتا ہے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا — اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر
كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ۔ — یہ کہ اس کے لئے مدت معین ہو چکی تھی۔

اور یہ اس تحریر پر بھی بولا جاتا ہے جو آقا اور غلام کے درمیان بدلِ کتابت کے سلسلہ میں لکھی جاتی ہے

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا — اور غلام باندیوں میں سے وہ جو (بدلِ کتابت
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ — کے لئے) چاہتے ہیں تحریر۔

مگر یہ تمام اطلاقات دراصل ایک ہی بنیادی معنی سے وابستہ ہیں اور وہ یہ کہ کتاب کے معنی "لکھنا یا لکھی ہوئی چیز" کے ہیں۔ پس "کتابا موقوتا" اس لئے کہا گیا کہ قلمِ الٰہی نے یہ لکھ دیا ہے کہ فلاں

نماز فلاں وقت پر ادا ہو جانا ضروری ہے اور "حجۃ وبرہان" اس لئے کہ اکثر مذاکروں میں سند اور دلیل کے لئے دستاویزات اور سجلات اور کتابیں ہی پیش ہوتی ہیں۔ اور "کتابِ معلوم" اس لئے کہ ان کی ہلاکت کے لئے کاتبِ تقدیر نے معین وقت لکھ دیا ہے جو اٹل ہے۔

غرض اس مقام پر "کتاب" کے یہی بنیادی معنی مراد ہیں اور قرآنِ عزیز اسی مفہوم کے لحاظ سے "کتاب" ہے لیکن قرآن تو یہ کہتا ہے کہ میں "الکتاب" ہوں۔ عربی زبان میں "الف" "لام" تعریف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ قرآن کو جو "الکتاب" یعنی بلام تعریف بتایا گیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

ادیان و ملل کی تاریخ شاہد ہے کہ حضرت آدمؑ سے اب تک ہمیشہ سنۃ اللہ یہ جاری رہی ہے کہ ہر ایک امت کے لئے اس کے پیغمبر و رسول کے ذریعہ خدا کی کتاب، دستورِ حیات بن کر نازل ہوتی رہی ہے مگر جبکہ دنیا کے براعظموں اور ملکوں کے درمیان اجنبیت اور رسل و رسائل کی ہم آہنگی کے فقدان، نیز امتوں اور قوموں کی علمی اور عقلی نشو و نما کی ابتدائی حالت کے پیشِ نظر مقتضیات احوال کا فطری تقاضا یہ تھا کہ پیغمبروں اور رسولوں کی دعوت و ارشاد محدود علاقوں کے لئے مخصوص رہے اور ہر ایک قوم اور ہر ایک امت کے لئے ان ہی میں ہادی برحق مبعوث ہو کر "خدا کا دستور" پیش کرے تو خدائے کائنات کی ہمہ گیر قدرت کا یہ تقاضا بھی فطری اور نیچرل تھا کہ روحانی ارتقاء کی یہ منازل ایک ایسے بامِ عروج پر پہنچیں کہ وہ وقت بھی آجائے جبکہ خدائی کتاب اور الہامی قانون تمام عالم زیر و بالا کے لئے ایک اور صرف ایک ہو اور جبکہ اس سے قریبی مابعد زمانہ میں مادی ارتقاء اس حد تک پہنچ جائے کہ اس ساری کائنات کا ڈانڈے سے ڈانڈا مل جائے اور یہ تمام عالم بوقلمون خدا کا ایک کنبہ نظر آنے لگے یعنی مشرقِ بعید سے مغربِ بعید تک اور شمالِ منتہیٰ سے جنوب منتہیٰ تک دنیا کا ہر ایک گوشہ دوسرے سے متعارف ہو کر اس طرح ایک سلک میں منسلک ہو جائے کہ ہر گوشہ کی راحت و تکلیف دوسرے گوشہ پر اثر انداز ہو اور تمام کائنات کی بھلائی اور برائی کو ایک بنا دے تو ایسے مادی دور سے قریبی عرصہ میں ایسے روحانی پیغام

اور خدائی دستور و آئین کی کتاب کا نزول از بس ضروری ہے جو اسود و احمر، کالے اور گورے سب کے لئے یکساں ہو اور اس کے بنیادی اور اساسی قوانین یورپ و ایشیا اور امریکہ و افریقہ غرض کل کائنات پست و بالا کے لئے ہمہ گیر اور عالمگیر ہوں اور یہ دعوت پیغام بعثت عام بن کر اخوت کا پیغامبر ثابت ہو۔

فطرت اور قانون قدرت کے ارتقائی پہلو کا یہی وہ راز تھا جس کو آشکارا کرنے کے لئے ہر قوم اور ہر ملت میں مبعوث ہو پیغمبروں اور نبیوں نے اپنا فرض انجام دیا اور پیغام ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ بشارت بھی سنائی کہ وقت آئے گا جب ملکوں اور قوموں کے یہ مختلف پیغامات جو ایک ہی سرچشمۂ ہدایت کا پرتو اور عکس ہیں ایک اور صرف ایک عالمگیر پیغام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے اور تمام الہامی کتابوں پر وہ جہاں گیر دستور آسمانی خط نسخ پھیر دے گا۔

چنانچہ توراۃ، زبور، انجیل، اوستا اور اپنشدوں کی الہامی و غیر الہامی بشارتیں مسلسل ایک ایسے نبی اور پیغمبر کی بعثت کا ذکر کرتی چلی آتی ہیں جو خدا کے آخری پیغام اور جامع کتاب کے ذریعہ کائنات ہست و بود کو ہدایت مآب اور فیضیاب کرے گا۔

توراۃ کتاب استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵-۲۱ و باب ۳۱ آیت ۲۱-۱۸ و باب ۲۳ آیت ۲۔ اور انجیل متی باب ۲۱ آیت ۱-۱۶ و یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۲-۱۹ اور باب ۱۶ آیت ۱-۸ اور زبور ۱۹ و ۹۶ اس کے لئے شاہد ہیں۔ اور انجیل برنابا کی بشارات تو کثیر اور بہت صاف اور واضح ہیں۔

پس جب قرآن عزیز یہ کہتا ہے کہ وہ "الکتاب" ہے تو گویا وہ ملل و ادیان سماوی کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ مجھ کو کسوٹی پر پرکھو اور میری تعلیم کا جائزہ لو تاکہ تم کو یقین کی روشنی ہاتھ آئے اور تم بآسانی اقرار کر سکو کہ بیشک یہ کتاب وہی جانی پہچانی کتاب ہے جس کے خدا کے آخری پیغام ہونے سے متعلق ہم اپنی سچی تعلیمات الٰہی میں تذکرے اور بشارتیں پاتے ہیں اور یہی وہ دستور کامل ہے جس کے چرچے ہم اپنی الہامی کتابوں کی معرفت خدا کے سچے پیغمبروں اور نبیوں سے سنتے آئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی

الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل یأمرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم (الاعراف)

جو نبی امی ہے کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا اور منع کرتا ہے بُرے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو اُن پر تھیں۔

چنانچہ توراۃ باب استثنار میں ہے۔

میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔

اسی کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وما ینطق عن الھوی ہ ان ھو الا وحیٌ یوحی۔ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا یہ (قرآن) نہیں ہے مگر خدا کی وحی جو اس پر کی گئی ہے۔

اور انجیل یوحنا میں ہے۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔

غرض قرآنِ حکیم نے کائناتِ ملل وادیان کے سامنے "الکتاب" کہکر یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ وہ خدا کی اس وحی کو اجنبی اور ان ہوئی بات نہ سمجھیں اور اس لئے اس معیار کے مطابق جو کتبِ سماوی کی معرفت کے لئے وجدان اور فطرت کی راہنمائی میں ہر ایک ذی عقل کو حاصل ہے اس کا امتحان کریں اور جانچیں کہ کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے یہ "کتاب الہی" ہے یا کسی انسانی فکرو کاوش کی خود ساختہ "کتاب" اور جو صفات کہ ان کی الہامی اور آسمانی کتابوں میں خاتم الانبیاء اور

ان پر نازل ہونے والی کتاب سے متعلق بیان کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں اس کا یہ دعویٰ کہ وہ "الکتاب" ہے کہاں تک درست اور حق ہے۔

قرآن عزیز نے اپنے اس وصف "کتاب والکتاب" کا بہت سے مقامات پر بار بار ذکر کیا ہے اور استدلال و بیان کے مختلف طریقوں سے اس وصفِ خاص کو اس حد تک دہرایا ہے کہ وعظ و تذکیر کی جانب ادنیٰ توجہ کرنے والا انسان ہرگز متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ حکیم کی ان آیات کو پیشِ نظر لانے کے لئے جن میں اس کو "الکتاب" یا "کتاب" کہا ہے حسب ذیل فہرست لائق توجہ ہے

بقرہ ۹/۷۹[۱]، ۱۵/۱۳۰، ۱۸/۱۵۳، ۲۱/۱۰۷ ال عمران ۱/۴، ۱/۸، ۳/۲۴، ۵/۴۹، ۶/۵۰، ۹/۸۲، ۱۹/۱۸۵، نساء
۱۶/۱۰۶، ۱۷/۱۱۱، ۲۰/۱۲۷ انعام ۱۱/۹۳، ۱۴/۱۱۵، ۲۰/۱۲۴ اعراف ۱/۳، ۶/۵۲، ۲۱/۱۷۱، ۲۳/۱۹۷ مائدہ ۱۵/۱۱۱، ۱۷/۴۹،
ہود ۱/۲، انفال ۱۰/۷۶ ابراہیم ۱/۲ یونس ۷/۶۲ نحل ۹/۶۵، ۶/۷۶، ۱۳/۹۰، ص ۳/۳۰ حم ۱/۱ احقاف
۱/۱، ۲/۱۳، ۴/۳۱ انبیاء ۲/۱۱، احزاب ۱/۷ سبا ۱/۴ کہف ۱/۲، ۴/۶۸۔ عنکبوت ۵/۴۸، ۵/۴۹، ۵/۵۲ شوریٰ
۲/۱۶، ۵/۵۲ قصص ۹/۸۷، زمر ۱/۲، ۴/۴۲ فاطر ۳/۳۰، ۴/۳۲ سجدہ ۱/۲ مومن ۱/۱، ۵/۴۲ رعد۔ ۱/۱
دخان ۱/۱ الحجر ۱/۱

پھر قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دستوری اور جانی پہچانی "الکتاب" ہی نہیں ہوں بلکہ نظام کائنات کے آئین و دستور کی وہ مکمل کتاب ہوں جس کے اوصاف عالیہ "مبین" (روشن و واضح) "عزیز" (قادر و غالب) اور "حکیم" (حکمت والی) ہیں۔

وہ "کتابٌ مبینٌ" روشن کتاب ہے۔ مائدہ ۳/۱۶ یوسف ۱/۱ نمل ۱/۱ شعراء، قصص ۱/۱ زخرف ۱/۱ اس لئے کہ اس کے معجزانہ نظم و معانی ایک "امی" کی معرفت عبرت و موعظت سے متعلق ماضی اور مستقبل کے صحیح واقعاتِ تاریخی اور ان سے حاصل شدہ بے نظیر نتائج کے لحاظ سے نیز ایک کامل و مکمل دستور و آئین کی حیثیت سے وہ روشن اور واضح کتاب ہے نیز وہ اپنے مطالب و مفاہیم کے پیش نظر صاف اور ظاہر ہے جس میں کسی قسم کے شبہ و اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے یا اس لئے کہ وہ ہدایت و رشد کی

---

[۱] اوپر رکوع اور نیچے آیت کی علامت ہے۔

ظاہر کرنے والی اور یہود، نصاریٰ اور مشرکین کے سوالات وشبہات کا واضح طور پر مدلل اور تسکین بخش جواب دینے والی ہے۔

غرض معارف، حِکَم ومصالح، حقائق ودقائق اور عبر وموعظت سے متعلق تاریخی قصص و واقعات کے لئے ایک روشن اور واضح کتاب ہے۔

اسی طرح وہ "کتابٌ عزیز" نادر وبے نظیر" وغالب ہے حٰم سجدہ اس لئے کہ وہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک عدیم النظیر کتاب ہے جس کا جواب نہ ماضی دے سکا اور نہ مستقبل دے سکتا ہے اور جس کے معارضہ سے تمام کائنات انس وجن عاجز ہیں۔ "قُل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔" فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔" نیز وہ ناسخ ہے تمام سابقہ کتب سماوی کیلئے اور اس لئے سب پر حاوی اور غالب ہے" لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکین" اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم ومعظم ہے کہ اللہ کی عظمت وکرامت اس کے کلام کی کرامت وعظمت کا کفیل ہے۔

اور بلا شبہ وہ "کتابٌ حکیم"[1] ہے۔ یونس، لقمان اس لئے کہ اس کی آیات بینات اوامر ونواہی یعنی احکام الٰہی کی خالی ہیں اور اس طرح وہ ایسی کتاب ہے جو احکام کا معدن ہے نیز جس طرح ایک حکیم ودانا جب بولتا ہے حکمت ودانائی سے لبریز کلام کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب حکمتوں کا سرچشمہ اور دانائیوں کا مخزن ہے اور وہ جو کچھ دیتی ہے وہ حکمت ودانائی کے جوہر وگوہر ہی ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ کائناتِ بحروبر اور بلند وپست کے خالق ومالکٗ حکیم ودانا کی جانب سے ہے اس لئے جو کچھ اس میں ہے وہ حکمت ہی حکمت ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآن ان صفاتِ علیا سے کیوں متصف ہے اس لئے کہ جبکہ مادی دنیا میں قانونِ قدرت کی رفتار کچھ اس طرح سے نظر آتی ہے کہ اولادِ آدم کا نشوونما

---

[1] حکیم۔ مُحکم اور حکمت دونوں سے ماخوذ ہے۔

تدریجی ارتقاء کا رہینِ منت ہے یعنی اس کے فہم و عقل کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی ہے اور ذہنی اور عقلی کمالات اگرچہ مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے درمیان جدا جدا نظر آتے ہیں لیکن تاہم اہلِ عقل و نقل اس پر متفق ہیں کہ مجموعی حیثیت سے حضرت انسان کے عقلی و ذہنی افکار نے تدریجی ترقی کی ہے اور بلاشبہ موجودہ دور جو چند صدی کا دور ہے ارتقائی کمالات کا حامل ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہی قانونِ قدرت روحانی کائنات پر بھی حاوی ہے اور اسی کے پیش نظر قدیم کتب سماوی میں توحید، صفاتِ الٰہی اور الٰہیات کے نازک مسائل کو قریب الفہم بنانے کے لئے ایسی تشبیہات کو جائز رکھا گیا جو بن دیکھے خدا اور بن دیکھی دنیا (آخرت) پر ایمان لانے میں آسانی اور سہولت پیدا کر دیں اور جب آہستہ آہستہ الٰہیات کے نازک مسائل کو عقل فہم انسان نے اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا اور اس کی عمیق پہنائیوں تک رسائی کے لئے کاوش و جستجو سر اٹھانے لگی تو دعوت و ارشادِ خداوندی نے بھی اس کو سہارا دیا اور اپنے پیغامات کے اندر اسلوبِ بیان میں ارتقائی منازل کا خاص خیال رکھا چنانچہ عہدِ قدیم کی کتبِ سماویہ باوجود تحریف و تنسیخ کے اپنے مختلف ادوارِ تاریخی کے پیش نظر مختلف اسلوب و طرزِ بیان کو پیش کرتی اور مسطورہ بالا دعوی کے لئے شہادتِ صادق کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ دنیا مذہب کی ابتدائی تعلیم میں تشبیہی تعبیرات اور مسائل الٰہیات کی تفہیم میں استعارات و کنایات اور دورِ متوسط میں حنیفیت اور شرک کے متماثر تقابل کے باوجود صفاتِ الٰہیہ کی تلقین و تعلیم میں تشبیہی رنگ و روغن اور تبلیغی نظام میں ملکوں اور قوموں کے مختلف احوال و مقتضیات کے پیش نظر جدا جدا پیغامات اور مختلف اسلوب خطابیات یہ سب امور اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ اور اگرچہ یہ مسلم ہے کہ انسانی قوائے فکریہ و عقلیہ خدائے تعالیٰ کے فیضان کی بدولت مسلسل ترقی پذیر ہیں، اور اس کی حدِ نظر ہماری ان نگاہوں سے مستور "لا تقف عند حد" کا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ تاہم اہلِ دانش کے نزدیک یہ ہے کہ قریبی دور میں جس کا خط اس دور تک طویل ہے بنیادی طور پر انسانی عقل و فکر اتنی پختگی کی حد پر پہنچ چکی ہے اور بلوغت و رشد کی حدود کے لحاظ سے معراجِ کمال حاصل کر چکی ہے اس لئے از بس

ضروری ہے کہ اس مادی عروج ذہنی وفکری کے دور میں خدا کا روحانی پیغام بھی اسی صفت کمال کا حامل ہو اور اس کی تعلیم بھی تاریخ ملل وادیان کے مختلف ادوار کے مقابلہ میں بلوغت ورشد کی آخری حد تک رسا ہو۔

پس قرآن کہتا ہے کہ اس ناموس فطرت اور قانونِ قدرت یعنی "سنۃ اللہ" کے پیشِ نظر "میں" خدا کا ایسا قانونِ کامل ہوں جو اپنی تعلیمات "الٰہیات، اخلاقیات، مدنیات، معاشیات و معادیات" کے ہر پہلو میں روشن اور واضح اور تشبیہ وتجسیم کی تعبیرات سے پاک ہے۔ نیز جغرافی، لسانی ملکی اور قومی حدود سے بالاتر، حکمتِ بالغہ پر حاوی اور نظم ومعانی کے انسجام اور آئین وقوانین کے بنیادی انصرام میں حد اعجاز کا حامل ہے اور اس لئے بلاشبہ میں اس کائناتِ ہست وبود میں میں خدا کی عدیم النظیر، درخشاں اور پُراز حکمت "کتابِ مبین" "کتابِ عزیز" "کتابِ حکیم" ہوں۔

پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ اس مادی دنیا میں کسی تک پیغام پہنچانے کے دو ہی طریقے ہیں ایک یہ کہ جس بات کو کہنا ہے اس کو حرف بہ حرف خود ادا کرنا اور یا بذریعہ تحریر وتقریر قاصد کی معرفت بحالہ پہنچا دینا اور دوسرا یہ کہ اپنا مفہوم اور نفسِ مضمون بیان کر دینا اور پیغامبر کو یہ حق دینا کہ وہ اس مفہوم کو بذریعہ تحریر یا زبانی اپنی عبارت میں مخاطب کو پہنچا دے۔ جب مخاطب تک یہ پیغام پہنچے گا اور اس کو پیغام کی نوعیت کا بھی علم ہو جائے گا تو ضروری ہے کہ دونوں قسم کے پیغامات کا اثر مخاطب پر مختلف ہو کیونکہ پہلا پیغام نہ صرف پیغام کا ہی حق ادا کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ پیغام دینے والی ہستی کے کلام کی تمام خصوصیات اور اس کے امتیازات بھی پیشِ نظر لاتا ہے اور اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخاطب کے قلب ودماغ پر عظمت ومحبت کا جذبہ بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق میں وہ صرف پیغام ہی حاصل کرتا ہے متکلم کے کلام کے خصائص وامتیازات سے بہرہ ور نہیں ہوتا اور پیغام اگرچہ مقصد کو پورا کر دیتا ہے لیکن اُس قسم کے جذبات نہیں پیدا کر سکتا۔

پس قرآن ان صفات کے پردہ میں اس حقیقت کو بھی نمایاں کرنا چاہتا ہے کہ ابن آدم نے جس وقت سے صفحۂ دنیا کو اپنی ہستی کے نقش ونگار سے مزین کیا ہے اس وقت سے قرآن کے

نزول تک تمام روحانی پیغامات جو الہامی کتابوں کی شکل میں خدا کی جانب سے نازل ہوئے وہ خدا کے احکام کا ایسا مجموعہ تھے جن کو خدا کی کتاب خدا کا قانون، خدائی فرمان اور پیغام الٰہی تو کہا جائیگا لیکن "کلام الٰہی" نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پیغامبر (ناموس اکبر یا جبرئیل) نے ہر ایک نبی و رسول کو یا الواح کی شکل میں مسطور یا مفہوم ربانی کو اپنی تعبیر وحی کی شکل میں منقول پیش کیا ہے اور بلفحوائے ارشادِ قرآنی "وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر" "ولکل قوم ھاد" توراۃ، زبور، انجیل، صحف ابراہیم (علیہ السلام) اور کائنات کے دوسرے انبیاء و رسل کے صحیفے سب کے سب "کتاب اللہ" تو ہیں لیکن "کلام اللہ" نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جن قوموں پر ان کتابوں کا نزول ہوا ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ان پر مضبوطی سے قائم رہیں اور ان کی حفاظت کریں اور اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور ان میں تحریف و تبدیل کا مجرمانہ اقدام شروع کر دیا تو یاد رکھیں کہ پھر ان کی تباہی اور بربادی قریب ہے۔ چنانچہ توراۃ، زبور اور انجیل میں اس قسم کے تہدیدی احکام امثال کی شکل میں بھی بکثرت موجود ہیں اور صاف صاف الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان کتابوں سے وابستہ اہل مذاہب خود اس کے معترف ہیں کہ ان کے زوال کا باعث وہ تحریف ہے جو انھوں نے (ان کے پیشرووں نے) خدا کی جانب سے نازل شدہ کتابوں میں کی اور آج وہی محرف کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ میں خدا کی وہ کتاب ہوں جو نہ صرف کتاب ہے بلکہ "کلام اللہ" بھی ہوں اور اسی لئے دوسری آسمانی کتابوں سے جدا میری یہ خصوصیت ہے کہ جس طرح خدا ہر قسم کے تغیر و تبدل سے پاک اور منزہ ہے اسی طرح متکلم کی خصوصیت و امتیازی شان اس کے کلام میں بھی موجود ہے کہ وہ بھی تحریف و تبدیل سے محفوظ و مامون ہے "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید" اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بار دوسری کتابوں کی طرح امت اور رسول پر نہیں رکھا بلکہ اپنی جانب سے اس کی حفاظت و صیانت کا اعلان فرمایا اور اس کی ذمہ داری اپنی ذات بحت پر ہی رکھی "نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" "لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ

ثم ان علینا بیانہ"

غرض قانونِ قدرت کی ہمہ گیر وحدت یہ فیصلہ دینے میں حق بجانب ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ "عینِ فطرت" ہے کہ وہ کائنات ادیان وملل میں خدا کی سچی "کتاب" ہے اور اپنے نزول سے قبل سماوی کتابوں اور خدا کے سچے رسولوں اور نبیوں کی معرفت وہ اس طرح متعارف اور معروف ومشہور ہو چکی تھی کہ نزول کے وقت اس کا یہ دعویٰ بلا شبہ درست اور صحیح ہے کہ وہ جانی پہچانی "الکتاب" ہے۔ اور اس کی سادہ اور صاف، روشن اور درخشاں تعلیم اس کا حق رکھتی ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ وہ "کتاب مبین" ہے اور چونکہ وہ خدا کی صفتِ کلام سے متصف ہو کر "کلام اللہ" ہونے کا بھی شرف رکھتی ہے اس لئے یقیناً وہ الہامی کتابوں میں ایک بے نظیر اور نادر کتاب ہے اور جبکہ قدیم ازلی وابدی ذاتِ احدیت کے صفتِ کلام ہونے کی وجہ سے موصوف کی طرح غیر متبدل وغیر متحرف بھی ہے اور تا قیام قیامت اسی طرح رہے گی تو بلا ریب اس کا یہ قول حق ہے کہ وہ "کتابٌ عزیز" ہے اور جبکہ وہ بفحوائے آیت "تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" ایسے حکیم ودانا کا کلام ہے جو تمام حکمتوں اور دانائیوں کا منبع ومرجع ہے تو پھر اس کا یہ اعلان بے داغ آئینہ صداقت ہے کہ وہ "کتاب حکیم" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زبان وحی ترجمان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کتاب کی تعلیم کے متعلق یہ پُر از حکمت جملہ ارشاد فرمایا "الدین السمحۃ البیضاء لیلھا ونھارھا سواء"[1] قرآن کا بتلایا ہوا دین آسان و روشن دین ہے جس کے رات ودن دونوں یکساں ہیں۔

یعنی اس کتاب کے آئین وقوانین اس قدر صاف اور سادہ ہیں کہ جن پر گامزن ہونے کے لئے دوسرے مروجہ ادیان کی طرح نہ سخت قیود ہیں اور نہ کڑی پابندیاں اور اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ اس کی بنیادی تعلیمات میں سابقہ ادیان کی طرح نہ تشبیہ وتجسیم کے خلل کا اندیشہ ہے اور نہ اس کے معتقدات میں استعارات وکنایات کی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اور اس کے اوامر ونواہی اس کی

---

[1] وعید، نہی، ترہیب مثل شب کی ہیں اور وعدہ، امر، ترغیب دن کی طرح ہیں مگر حدیث کہتی ہے کہ اس تعلیم حق کی رات بھی ظلمت وتاریکی سے محفوظ روز روشن کی ہی طرح روشن ہے۔

ترغیبات وترہیبات لعداس کے وعدو وعید جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ اور لیل ونہار کی طرح توام ہیں تاریکی اور ظلمت سے یکسر پاک اور بے لوث ہیں اور دونوں اصنافِ تعلیم آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور درخشاں ہیں۔

آیئے اب ایک مرتبہ پھر اس آیت کی جانب رجوع کریں جو قرآن کی سورۂ بقرہ میں پہلی آیت ہے اور جس نے کائنات کو یہ روشناس کرایا ہے کہ ہم یہ جو کچھ دیکھ رہے یا پڑھ رہے ہیں کائناتِ انسانی کی معاش و معاد کی تکمیل کے لئے خدا کی جانب سے کامل و مکمل کتاب ہے۔

"الم" یہ تین حروف کا مجموعہ ہے جو جدا جدا حرف ہی کی طرح پڑھنے میں آتے ہیں اور اسی لئے قرآن کی سورتوں میں ایسے تمام حروف "حروفِ مقطعات" کہلاتے ہیں، ان حروف کے متعلق اکثر سلف صالحین صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں "اللہ اعلم بمرادہ بذلک" اس کی کیا مراد ہے خدا ہی خوب جانتا ہے؟ اور اپنے اس قول کی دلیل میں یہ فرماتے ہیں کہ جبکہ یہ حروف باہم مل کر بھی چھوٹے سے چھوٹے لفظ دو حرفی کی شکل اختیار کئے ہوئے نہیں ہیں اور جدا جدا پڑھے جاتے ہیں تو ان کی مراد نہ جاننے سے قرآن کی تعلیم پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان کی حقیقت جانے بغیر کسی ایک آیت کے مفہوم و معنی یا چھوٹے سے چھوٹے جملے کی مراد سمجھنے میں کسی قسم کی بھی دقت پیش نہیں آتی تو پھر کیا ضرور ہے کہ ہم ان حروفِ مفردہ کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہوں اور کیوں نہ اس کو خدا کے حوالہ کر دیں۔

یہ طریقہ اگرچہ نفس صورت حال کے پیشِ نظر سلامت روی پر مبنی ہے۔ تاہم تبلیغی نقطۂ نظر سے ان مسلم و غیر مسلم افراد کی افہام و تفہیم کے لئے جو قدم قدم پر شکوک و شبہات کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں ان مفرد حروف کی حقیقت کی نقاب کشائی بھی از بس ضروری ہے تاکہ نفسِ امارہ کا پرخطر اقدام اس الحاد کی جانب متوجہ نہ کر سکے کہ قرآن جبکہ موعظت و بصیرت کے لئے ہادی اور راہنما ہے تو اس کا ایک حرف بھی ایسا کیوں ہے جس کی مفہوم و مراد سے ذی عقل و ذی فہم انسان ناواقف رہے اور وہ ایسا راز کیوں ہے جس کی مفتاح اور کلید کو خدائے برتر نے اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے خصوصاً جبکہ قرآن کے

متعلق اُس نے یہ فرمادیا ہے" ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر"

اس لئے صحابہ (رضی اللہ عنہم) تابعین (رحمہم اللہ) اور علماء سلف کی ایک جماعت سے ان کے متعلق متعدد توجیہات بھی روایت کی جاتی رہی ہیں ان توجیہات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بعض وہ توجیہات ہیں جو جدا جدا سورتوں کے حروفِ مقطعات کی توجیہ کرتی ہیں اور سب کے لئے یکساں حکم نہیں لگاتیں اور بعض توجیہات وہ ہیں جو تمام سور کے حروف مقطعات پر یکساں حاوی ہوتی ہیں اس لئے مقام کی مناسبت کے پیشِ نظر ہم ان ہر دو قسم کی توجیہات میں سے ایک ایک توجیہ نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حروف مقطعات دراصل قرآن کی متعلقہ سورتوں کے نام ہیں یعنی جس طرح دوسری سورت کا نام بقرہ ہے اسی طرح اس کا نام سورۃ الٓمٓ بھی ہے اور اُن ہی سورتوں کو حروفِ مقطعات کے نام سے نامزد کیا گیا ہے جن میں اعتقادی، اخلاقی قانونی یا دوسرے معاشی و معادی اہم مسائل کا ذخیرہ بکثرت یکجا جمع ہے اور جن کے بنیادی اصول پکار پکار کر یہ بتلا رہے ہیں کہ کائناتِ مادی اور ذہنی وفکری ترقی کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی بامِ عروج پر پہنچ جائے لیکن یہ اصولِ اعتقاد اور اساسِ اخلاق اور قوانینِ معاش و معاد ایسے اٹل ہیں کہ تعصب سے دور کوئی شخص بھی ان کو جانچے یا پرکھے گا تو اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ اساسی قوانین جس طرح نزولِ قرآن کے وقت کی دنیا کے لئے موزوں اور مناسب تھے اسی طرح آج بھی بے میل اور بغیر ترمیم رشد و ہدایت انسانی کے لئے کافی ووافی ہیں تو خدائے برتر کی حکمتِ بالغہ نے ان سورتوں کے شروع میں اس لئے حروفِ مقطعات کو پیش کیا اور اس لئے ان سورتوں کا عنوان بنایا کہ اہل عقل و خرد کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کیا جائے کہ تم یہ جو کچھ دیکھ رہے یا پڑھ رہے ہو یا سن رہے اور سنا رہے ہو۔ اس کو غور و فکر سے دیکھو اور نظر و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھو کہ یہ بنیادی اور اساسی قوانین کس طرح مبنی بر اعجاز حقیقت سے وابستہ ہیں کہ دانا اور حکیم و فرزانہ ہستی جس قدر عمیق نظر سے ان کو جانچتی ہے اسی قدر ان کی ٹھوس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتی ہے کہ قرآن کے اوامر و نواہی اور اس کے

مواعظ و بصائر جس طرح ایک عامی اور ان پڑھ کے لئے باعث رشد و ہدایت ہیں اسی طرح ایک بڑے سے بڑے حکیم اور فیلسوف کے لئے بھی ہادی و مرشد ہیں اور جس طرح وہ اپنے وقت نزول میں بے نظیر و بے مثال تھے اسی طرح آج کے دور ترقی میں بھی عدیم المثال اور عدیم النظیر ہیں۔

اور یہ حیرت و استعجاب اس وقت عجیب صورت اختیار کر لیتا ہے جبکہ ایک حقیقت نگاہ اور دقیقہ سنج فلسفی و حکیم کو قرآنی حروف مقطعات کے ذریعہ اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ یہ پُر از حکمت اور اٹل قوانین و دساتیر کہ جن کی مثال پیش کرنے سے انسانی دماغ و عقل عاجز ہیں اور یہ کتاب جس کے کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے کسی انسان کو اس کے معارضہ کی جرأت نہیں ہو سکی اور نہیں ہو سکتی وہ ان ہی حروف تہجی کا مجموعہ ہے جس کو ایک بہتر سے بہتر مقرر اور انشا پرداز روز و شب اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کرتا رہتا ہے تو پھر کائنات انسانی میں سے کسی کا قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی طرح کا کوئی مضمون پیش کرنے سے اُس وقت عاجز رہنا اور قرآن کی تحدی کے باوجود عاجز رہنا جبکہ عرب کی سرزمین عربی فصاحت و بلاغت کے اساتذہ فن کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی اور پھر رہتی دنیا تک مسلسل اس کے چیلنج "فأتوا بسورة من مثله" کا جواب نہ پیش کر سکنا کیا اس حقیقت کے لئے روشن دلیل نہیں ہے کہ یہ کتاب بلاشبہ خدا کی جانب سے ہے اور یہ کلام درحقیقت کلام الٰہی ہے نہ کہ کلام انسانی۔ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

اس حقیقت کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ انسانی بول چال میں چونکہ الفاظ عموماً مفرد حرف سے لے کر پنج حرفی تک ہوتے ہیں اس لئے قرآن نے بھی جب اپنے اعجاز کو حروف مقطعات کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہا تو بول چال میں الفاظ کی ان تراکیب کا لحاظ کرتے ہوئے مقطعات کو بھی ایک حرف سے پانچ حروف تک کی ترکیب میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ن، ق، حم، الم۔ المر، کھیعص حمعسق قرآن نے ان کو ایک جگہ اس لئے پیش نہیں کیا کہ جس طرح وہ عبرت و موعظت کے لئے واقعات کو بار بار مختلف اسلوب سے دوہراتا ہے اسی طرح وہ اس حقیقت کو بھی بار بار دہرانا مفید سمجھتا ہے

پس جب تم اس حقیقت کے اعتراف کے لئے سرِ تسلیم خم کرکے اس کتاب کا مطالعہ کروگے تو بلاشبہ تمہارے سامنے اس کے حقائق و معارف کا باب کھل جائے گا اور پھر تم کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ "لا تقضی عجائبہ" یہ وہ کتاب ہے جس کے عجائب و لطائف ختم ہی ہونے میں نہیں آتے۔"

کہا جا سکتا ہے کہ یہ تسلیم کرلینے کے باوجود کہ عہد قدیم و عہد جدید برابر قرآن کے اس چیلنج کے حقیقی اور صحیح جواب سے عاجز رہے اور اس کے قبول میں کسی کو بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور اسی لئے اہلِ نظر نے ہمیشہ ہی اس تحدی (چیلنج) کے قبول کرنے سے گریز پائی کا ثبوت فراہم کیا ہے تاہم اس سے کسی کتاب کا "کتاب اللہ" ہونا کیسے لازم آتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی کتاب جس کا جواب نہ اگلوں سے ہوسکا اور نہ پچھلوں سے اپنی تدوین و ترتیب میں کسی انسان ہی کے قلم کی رہینِ منت ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اعجاز اور کلام الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا مدار صرف اتنی سی بات پر ہی نہیں ہے کہ وہ ایک کتاب ہے جس کے ایک پیراگراف یا چھوٹی سی سورت کا جواب دنیا میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے دعویٰ کا مدار تو اس اعلان پر ہے کہ میں خدا کی جانب سے ہوں اور اس کا کلام ہوں اور میری ترتیب و انسجام میں خود محمد رسول اللہ کو بھی دخل نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا جو شخص یہ تسلیم نہ کرے اور وہ اس کو انسان کا درجہ دیتا ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ خود اور پوری کائنات کے انس و جن کو جمع کرکے ایسی کتاب نہیں بلکہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورۃ یا چھوٹا سا پیراگراف پیش کردے تاکہ قرآن کا یہ چیلنج غلط ثابت ہو اور وہ کلامِ الٰہی کے دائرہ سے نکل جائے اور انسانی کلام کے حدود میں آجائے پس اگر کوئی کتاب اپنے حدِ اعجاز کے پیشِ نظر کائناتِ انسانی کو تحدی سے دوچار کرے اور پھر عقلاءِ زمانہ کو اس کتاب کی عظمت و فخامت اور اس کی تعلیم کی بلندی و رفعت کا بھی اعتراف ہو تو ایسی صورت میں دو ہی راہیں ہوسکتی ہیں کہ یا فصحاء و بلغاءِ زمانہ اس چیلنج کی عملاً تکذیب کر دکھائیں اور یا پھر اس کے چیلنج کو صحیح تسلیم کرکے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا اعتراف کریں۔

غرض معاملہ صرف خوبیٔ کلام کا نہیں ہے بلکہ اس خوبی کو عدیم النظیر بتا کر اور انسانی و بشری

طاقت سے خارج کہہ کر دعویٰ کی تصدیق یا تکذیب کے لئے چیلنج وتحدی کرنے کا ہے اور ایسا دعویٰ جب ہی جھٹلایا جا سکتا ہے کہ عملی طور پر اس کے خلاف ثبوت فراہم کر دیا جائے مگر یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جبکہ یہ دستور تھا کہ عرب کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ مسلم اساتذہ، زبان کے کمالات کو نظم کی شکل میں پیش کرنے کے لئے کعبہ کی دیوار پر اپنے قصائد اس لئے لٹکا دیا کرتے تھے کہ اساتذۂ وقت ان پر اصلاح دیتے ہوئے ان کی فصاحت و بلاغت کے مراتب کا بھی اظہار کرے اور ان پر برتری و تفوق کے نمبر لگائے تو اس دور میں جب سورۂ کوثر کا نزول ہوا اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کو لکھ کر کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیں چنانچہ اس تعمیل حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب استاذ الاساتذہ اور وقت کے ماہر زبان نے معلق قصائد کا مطالعہ اور ان کی حیثیت کو ظاہر کرنا شروع کیا اور آخر اس جگہ پہنچا اور سورۂ کوثر پر اس کی نظر پڑی تو تاریخ شاہد ہے کہ حیران و سرگرداں انسانوں کی طرح اس کو صرف یہی کہنا پڑا "واللہ ماھذا کلام البشر" قسم بخدا یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے"۔

پس اس تحدی اور چیلنج کی موجودگی میں کائنات جن و انس کی اس کے معارضہ سے عاجزی کا اعتراف یقیناً اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر حجت و برہان ہے۔

"الم" کی دوسری توجیہ جو درحقیقت پہلی توجیہ کا ہی ایک حصہ مگر خصوصیتِ مقام کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک تمہید کی محتاج ہے وہ یہ کہ "فطرت" راہنمائی کرتی ہے کہ جب ہمارے پاس کسی جانب سے کوئی مکتوب موصول ہوتا ہے تو طبیعت جستجو کرتی ہے کہ اس سلسلہ میں تین امور کا جاننا ضروری ہے ایک یہ کہ یہ مکتوب کس ہستی کی جانب سے موصول ہوا ہے تاکہ اگر باپ، استاذ یا دوسرے کسی مخدوم کی جانب سے ہے تو ان کے مرتبہ کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اور اگر اولاد یا کسی خورد کی جانب سے ہے تو اس کے پیشِ نظر سلوک ہو اور اگر دوست یا محبوب کی جانب سے ہے تو پھر اسی نظر سے اس کو دیکھا جائے اور یہی نہیں بلکہ یہ جان لینے کے بعد کہ یہ مکتوب کس کی جانب سے ہے طبیعت اسی کے مطابق خود بخود متاثر ہونے لگتی ہے اور عظمت،

شفقت یا محبت کے جذبات نفسیاتی طور پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم کرنے کے لائق ہوتی ہے کہ اس مکتوب کا لانے والا کون ہے یعنی قاصد کی اہمیت بھی قابلِ نظر اندازی نہ ہوتی اس لئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ مکتوب حقیقتاً اس ہستی کی جانب سے نہیں ہوتا جس کی جانب وہ منسوب ہے بلکہ جعلی طور پر اس کو منسوب کر کے دھوکا دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی محض تفریح اور حصولِ زر کی خاطر بہروپیہ بن کر فریب کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس مکتوب کا تعلق مکتوب الیہ کے علاوہ دوسرے اشخاص و افراد سے بھی ہوتا ہے تو پھر تیسری بات یہ بھی قابلِ توجہ ہوتی ہے کہ مکتوب الیہ کی شخصیت کس درجہ اہمیت رکھتی ہے اور صاحب مکتوب کے یہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ تاکہ اس پیغام کی عظمت و جلال کا اندازہ ہو سکے جو صاحبِ کتاب نے مکتوب الیہ کے ذریعہ دیا ہے۔

یہ بات ایسی فطری اور نیچرل (Natural) ہے کہ معمولی فہم و عقل بھی ان امور سے متعلق تفتیش و جستجو ضروری سمجھتی ہے تاکہ مکتوب کے متعلق صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پس قرآن بھی اس فطری نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے قاری اور مطالعہ کرنے والے کو یہ بتلا دینا ضروری سمجھتا ہے کہ یہ کتاب ایسی بالاتر ہستی کی جانب سے آئی ہے جس کو "اللہ" کہتے ہیں اور جو جمیع صفات کمال کا محور و معدن ہے لہٰذا مخاطب بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس ذات پاک کی جانب سے جو مکتوب (کتاب) رشد و ہدایت کے پیغام کے لئے آیا ہے اس کی عظمت و رفعت کا کیا حال ہوگا خصوصاً جبکہ وہ صرف کتاب ہی نہ ہو بلکہ "ربانی کلام" بھی ہو، اور یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے ذی عزت قاصد کے ذریعہ بھیجی گئی ہے جو "جبرئیل" یا ناموس اکبر کہلاتا ہے۔ اور جو اس پاک جماعت کا مرد کامل ہے جس کو دینی اصطلاح میں فرشتہ کہا جاتا۔ اور عقل اور فلسفہ کی نگاہ میں "جوہر مجرد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور صاحبِ مکتوب کی درگاہِ رفعت پناہ میں جن کی وفاداری اور فداکاری نیز جن کی عصمت و پاکی کا یہ عالم ہے کہ

لا یعصون اللہ ما امرھم و (فرشتے) اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے

یفعلون ما یومرون۔ اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

اور عالمِ قدس سے عالمِ ارضی کی جانب پیغام پہنچانے کے لئے جس کی صلاحیتوں کا یہ حال ہے کہ "علمہ شدید القوی ذومرۃ" اس کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) جتلایا ہے سخت قوتوں والے زورآور نے (جبرئیل نے) بس یہ ہے وہ ناموس اکبر "جبرئیل امین" جو اس پیغام کا پہنچانے والا ہے۔

پھر اس کتاب کا مکتوب الیہ وہ مقدس ہستی ہے جس کا نام "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جن کی عظمت شان اور رفعت مکان کا یہ حال ہے کہ اس نے "امی" ہونے کے باوجود دنیا کے وحشی انسانوں کو "انسان کامل" بنا کر دنیا کا معلم وہادی بنا کر پیش کر دیا، کیا تاریخ عالم نے اس دور کی جو مذہبی تاریخ پیش کی ہے وہ اس کی شاہد نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیم نے کس طرح تاریک دنیا کو روشن راہ دکھائی؟

یہی وہ ہستی ہے جس کی تقدیس وتکریم کی شہادتیں دنیا بھر کے مذہب کے ہر کتاب اور ہر پیغمبر اور رشی و منی دیتے چلے آئے ہیں اور انبیاء بنی اسرائیل ہیں خصوصاً جس کے نزول کا اس درجہ اعتراف وانتظار رہا ہے کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" یہ (یہود ونصاریٰ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (یعنی ان کو نبوت ورسالت کو) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔" "النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل"۔

پس اس کتاب (مکتوب) کے مطالعہ اور "ذالک الکتاب لاریب فیہ الآیۃ" پر ایمان و ایقان سے قبل اس کی جلالت قدر اور عظمت شان کی معرفت کے لئے یہ معلوم ہو جانا ازبس ضروری ہے کہ یہ "اللہ" کی جانب سے آئی ہے "جبرئیل" اس کا قاصد وسفیر ہے اور "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب بھیجی گئی ہے گویا مختصر تعبیر کے ذریعہ تین حروف سے تین ہستیوں کی جانب اس حسن وخوبی سے اشارہ کر دیا گیا کہ ایک ہی پیرایہ بیان ہیں اس عام حکمت کی جانب بھی رہنمائی ہو جائے جو تفصیل کے ساتھ پہلی توجیہ کی شکل ہیں بیان کی جا چکی ہے اور اس دوسری توجیہ کی جانب بھی توجہ مبذول ہو سکے جو ابھی زیر بحث آئی ہے یعنی آ سے "اللہ" ل سے "جبرئیل" اور م سے "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) مراد ہیں۔

حکمت مسطورہ بالا کے علاوہ ناموں کا حروف کے ذریعہ اظہار ایسی خبر نہیں ہے جو اہلِ علم و عقل کے نزدیک مستبعد اور تعجب خیز سمجھا جائے اس لئے کہ قدیم و جدید ہر ایک دور میں ناموں کے اختصار کے لئے حروف سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ عرب ہند اور مصر کے مخطوطات و کتبات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی شہادتیں ملتی ہیں اور آج کے علمی دور میں تو یہ اختصار نہ صرف ضرورت کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ مسمیٰ شخصیت کی اہمیت کو دوبالا کیا جاتا اور عظمت و وقار کا ایک وسیلہ شمار ہوتا ہے چنانچہ آپ ل احمد میں جو ادبی شان مستور پاتے ہیں وہ لطیف الدین احمد سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔

بہر حال اسماء و اعلام کو حروف کے ذریعہ اظہار کا طریقہ علمی و ادبی ہے اور صراحت سے زیادہ وقیع اور اہم سمجھا جاتا ہے۔

البتہ اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اعلام کے اظہار کے لئے پہلے حرف ا اور م کو اختیار کیا گیا اسی طرح جبرئیل کے اظہار کے لئے ج کو کیوں نہ لیا گیا اور آخر حرف کے لانے کی وجہ کیا ہے؟

تو اس سوال کو حل کرنے کے لئے پہلے اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی معاملہ میں چند شخصیتیں متعلق اور وابستہ نظر آتی ہوں تو یا تو اس معاملہ سے ان تمام شخصیتوں کا یکساں تعلق ہوتا ہے اور یا بعض ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو صرف وسیلہ اور واسطہ کا کام تو دیتی ہیں لیکن اس معاملہ کا براہ راست ان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہذا عقل یہ فیصلہ دینے پر مجبور ہے کہ پہلی صورت میں ان شخصیتوں کا تذکرہ ایسے اسلوب سے ہونا چاہئے کہ ان کے تعلق کی یکسانیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور دوسری صورت میں براہِ راست متعلق اشخاص و افراد کا ذکر تو یکساں اسلوب پر ہونا چاہئے مگر وسیلہ اور واسطہ بننے والی ہستیوں کا تذکرہ دوسرے اسلوب سے ہونا ضروری ہے تاکہ دونوں قسم کے تعلق کا امتیاز باقی رہے۔

پس اگر عقل و خرد کا یہ فیصلہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے تو مقام زیر بحث میں پیدا شدہ

سوال کا جواب یہ ہے کہ "الکتاب" کا براہ راست دو ہی مقدس ہستیوں سے وابستہ ہے ایک "صاحب کتاب" جو آمر و ناہی اور موسس آئین و قوانین اور مبینِ مواعظ و عبر ہے اور وہ اللہ ہے اور دوسری "مکتوب الیہ" کہ جو خود بھی ان احکام و قوانین کی مکلف ہے اور دوسروں کے لئے بھی بحیثیت پیغمبر خدا اور رسول اللہ کے مکلف بنانے والی ہے اور وہ محمد ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ باقی رہے جبرئیل تو وہ محض ذریعہ اور وسیلہ ہیں پیغام رسانی کا اور اس سے زیادہ ان کو علمی اور تکلیفی جگہ یہاں حاصل نہیں ہے۔ لہذا ضروری ہوا کہ اس سلسلہ میں اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور جبرئیل کی شخصیتوں کے اس دوگونہ تعلق میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی جائے۔

نیز اس لئے بھی کہ اس اسلوبِ بیان سے واضح ہو سکے کہ نبی اکرم اگر "نبی امی" ہیں تو یہ وصف صرف اس لئے ان کے لئے باعثِ صد نازش ہے کہ انھوں نے کائناتِ ہست و بود میں کسی بڑی سے بڑی ہستی کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور ان کو کسی سے بھی شرفِ تلمذ حاصل نہیں لیکن اس کے باوجود اس مقدس ہستی کا یہ محیر العقول کارنامہ ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

محض اس لئے عالمِ وجود میں آیا کہ آپ نے براہِ راست آغوشِ الٰہی میں تربیت پاکر علمِ الٰہی سے فیض حاصل کیا ہے اور یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے براہ راست فضل و نوال کا صدقہ ہے حتیٰ کہ "الکتاب" کو اگرچہ جبرئیل کے ذریعہ آپ تک پہنچایا گیا ہے تاہم معلم حقیقی خود خدا ہے اور آپ براہِ راست متعلم ہیں اور جبرئیل فقط قاصد ہیں لہٰذا ظاہر ہے کہ قاصد کو کیا مطلب کہ "صاحبِ کتاب" اور "مکتوب الیہ" کے درمیان اس کتاب (مکتوب) کے متعلق کیا راز و نیاز ہیں۔

حروف مقطعات میں سے سورۂ بقرہ کے شروع میں الٓمٓ مسطورہ بالا حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے ہے اس کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ جب ایک قاری "الکتاب" کی تلاوت کرتا اور اس کے معانی پر غور و خوض سے توجہ دیتا ہے تو سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کا نظم و انسجام سامنے آتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس سورہ میں تین باتوں کی جانب خصوصیت سے زور دیا گیا ہے ایک خدائے برتر

کی حمد وثنا اور اس کے سامنے عبودیت کا اظہار دوسرے راہِ مستقیم کی تلاش و جستجو اور اس کی طلب اور تیسرے گذشتہ دور کے "منعم علیہم" اور "مغضوب علیہم" کی تقسیم کا ذکر کرکے طلب صحیح کا تعین۔ اب اگر بنظرِ غائر ان ہرسہ گانہ امور کا جائزہ لیا جائے تو اس کا نتیجہ اور ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کو پڑھ کر ایک انسان تین حقیقتوں کا طالب نظر آتا ہے کہ ایک اس ہستی کا جو جمیع صفاتِ کمالیہ کی مستجمع ہے اور دوسری ایسی راہ کا جو اس جامع کمالات ہستی کی جانب صحیح راہنمائی کرسکے اور اس راہ کی شرط سے اس ہادی کا جو منعم علیہم کے گروہ میں سے ہو مغضوب علیہم کے گروہ میں سے نہ ہو۔

تو اب ان ہرسہ حقائق کے پیش نظر جب ہم تاریخ ادیانِ ملل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو خدا کے پیغاماتِ رشد وہدایت میں مسلسل تین شخصیتوں کا تعلق اور ان کی وابستگی نمایاں محسوس ہوتی ہے ایک صاحبِ وحی "اللہ" دوسری قاصدِ وحی "فرشتہ جبرئیل" تیسری مخاطبِ وحی "پیغمبر و رسول"

تو جب ایک شخص سورۂ فاتحہ کے اس تصور کو پیشِ نظر لاکر آگے نظر اٹھاتا ہے تو سورۂ بقرہ اس کی نگاہِ منتظر کو تسکین بہم پہنچانے کے لئے الٓمٓ کہہ کر اس پوری حقیقت کا انکشاف کردیتی ہے جس کے بعد اگر طبع صالح اور فکرِ صحیح کی توفیق حاصل ہے تو قاری خود بخود کلام کی عظمت و فخامت کا معترف ہوکر اس کے امتثال کے لئے سرِ نیاز جھکا دیتا اور خلوص وصداقت کے ساتھ "ذلک الکتاب لاریب فیہ" پر ایمان وایقان کے موتی نچھاور کرتا ہے اور حق پژوہی اور حق آگاہی کی راہ سے پکار اٹھتا ہے کہ "صدق اللہ وصدق رسولہ" (باقی آئندہ)

لہ یہ عجیب تاریخی اور لسانی اتفاق ہے کہ ان تمام کتب میں جن کو ان کے ماننے والے آسمانی کتاب کہتے ہیں۔ اسم جلالت یعنی حق تعالیٰ کے علمِ ذات کے لئے جو لفظ بولا جاتا ہے وہ الف سے ہی شروع ہوتا ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ کی اولیت واحدیت کا مشترک عقیدہ پیش کرتا ہے چنانچہ عربی میں "الٰہ یا اللہ" عبرانی میں "ایل" سریانی میں "الوہیم" اوستا کی پارسی زبان میں "اہورمزدہ" اور ویدوں کی سنسکرت زبان میں "ایشور" سب ا سے ہی شروع ہوتے ہیں۔

اقبال اور نظریۂ سعی و عمل

از جناب مولوی شیخ وحید احمد صاحب رئیس شیخوپورہ بدایوں

ہر الہامی کتاب کی تفسیر زمانہ کے رجحانات معیار و اقدار (Values.) پر مبنی ہوتی ہے۔ رجحانات زمانہ کی رفتار کے مطابق بدلتے رہتے ہیں لہذا تفسیر کو بھی بدل جانا چاہیے۔ جو الہامی کتابیں محض اپنے عہد و ماحول کی اصلاح کرتی ہیں اور وقتی ہوتی ہیں وہ آگے چل کر بدلے ہوئے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتیں اور وہ اس خاص عہد کی تاریخِ ہدایت بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایسی کتابوں کے ماننے والے ترمیم و تحریف سے کام لیکر بدلے ہوئے زمانے کی عقول کو مطمئن کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن پاک کی نوعیت و خصوصیت سب سے زیادہ اہم، نمایاں اور جدا ہے۔ وہ تحریف سے قطعی مبرا ہے اس کے شتر بطن بتائے گئے ہیں وہ زمان و مکان پر غالب ہے۔ اس کی ہدایت و کارفرمائی مستقل و مسلسل ہے اور اس کے متعلق بجا اعلان ہے:-

ذالك الكتٰبُ لاريب فيه

قرآن پاک کی تفسیر اس کے عہد تنزیل میں ماحول کے رجحانات کے مطابق کی گئی ہے بت پرستی، آتش پرستی۔ یہودیت اور عیسائیت قرآن پاک کا ماحول تھا۔ جب اس طرح تفسیر قرآنی کی گئی تو اس نے معتقدات کی اصلاح کر کے توہمات کو عمل صالح اور ظنیات کو یقینیات سے بدل کر زمین کو آسمان بنا دیا۔ بعد میں یونانی فلسفہ و منطق نے۔ جو خود منجملۂ قیاسات ہیں۔ اصلاح شدہ معتقدات پر حملہ کیا، قرآن پاک نے انھیں کے طرز میں اپنی تفسیر بیان کر کے اپنی حقانیت کا دوسری طرح سے ثبوت پیش کر دیا۔ اس نئی تفسیر کی تفصیل کا سمجھنا آسان نہیں۔ اہل منطق نے محض ظاہر

پر مادی صورت سے استدلال کیا تو معتزلہ نے باطنی پہلو کو نظر انداز کر کے ظاہر کو نباہ دیا۔ اب بحث یہ آپڑی کہ محض ظاہری پہلو سے مفہوم ادا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لہذا ان کے مقابلہ میں باطنی پہلو کو چمکانے والے بھی میدان میں اتر آئے۔ اس طرح تین مُکھی جنگ شروع ہو گئی۔

اشراقین اور معتزلہ کی بحثیں بذاتِ خود عبرت انگیز ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ پھر ان دونوں کے مباحث اہلِ فلسفہ سے اپنی نوعیت کے لحاظ سے سبق آموز ہیں۔ متقدمین سر درگریباں تھے کہ نئے علوم سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ متاخرین نے مہمل اجتہاد سے کام لیا کیونکہ علوم نقلیہ اور علومِ عقلیہ کو منطبق کرنا آسان کام نہ تھا۔ اسلامی سلطنت کے انحطاط، ایرانی تعیش اور یونانی وہندوستانی فلسفوں کی موشگافیوں نے اس عہد کے رجحان کو ایک معمہ بنا رکھا تھا لہذا قرآنی تفسیر میں کبھی مادیت وروحانیت میں توازن پیدا کرنے کی کوشش ناتمام کی گئی۔ بایں ہمہ انتشار قرآن پاک اپنے الفاظ ومفہوم کے ذریعہ برملا ہدایت کا ذریعہ بنا رہا۔

اب ہمارے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال نے علومِ جدیدہ کی تکمیل کی۔ جملہ مذاہب کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف عہد کی تفاسیر پر عبور حاصل کیا۔ ہر گروہ کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیا اور پھر قرآن پاک کی حقانیت کو عہد حاضر کی عقول کے مطابق اپنی شاعری کے ذریعہ واضح کیا۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اقبال کو اگر مجدد کہدیا جائے تو بیجا نہیں۔

قرآن پاک کا اصل موضوع انسان ہے۔ کل کائنات تمام فطرت اور جملہ اشیاء۔ سارے علوم وفنون۔ زمین وآسمان، دین ودنیا اس انسان ہی سے متعلق ہیں۔ اگر انسان کی حقیقت کا اور اس کی ابتدا وانتہا کا مفہوم واضح ہو جائے تو انسانی معمہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

قرآن پاک یوں ابتدا کرتا ہے:۔ اللہ جل شانہ کو جب اپنی قدرت کا اظہار منظور ہوا تو "کُن" فرمادیا۔ ازل سے لیکر ابد تک کی تمام فطرت اور اشیاء نے بلا توقف تعمیل کی چنانچہ "فیکون" یہ کُل محض علمِ الٰہی میں ظاہر ہوا اور اسی کو اعیانِ ثابتہ یا صورتِ علمیہ کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے علمِ الٰہی سے نکل کر ازل میں جو شے وجود میں آئی وہ نورِ محمدی تھا جس کو قلم سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور اسی نے

لوحِ محفوظ پر کل مخلوق کا پروگرام لکھدیا کہ عالمِ امر سے عالمِ خلق میں ہر ہر شے کا کس کس طرح وجود ہوگا اور پھر کیا کیا حشر ہوگا۔

ارتقاء قابلِ غور ہے کہ اس نورِ محمدی سے سب سے پہلے مجرد نورانی ملائکہ بنائے گئے۔ پھر اس نورانیت میں آتش کا اضافہ کرکے اجنار پیدا کئے گئے۔ ابلیس جو معلم الملکوت بنا وہ اسی جنس سے ہے قدرتِ کاملہ نے اور آگے بڑھ کر جدت میں ترقی دکھائی۔ نور و آتش میں خاک کی بھی آمیزش کردی اور صرف جمادات و نباتات و حیوانات پر ہی بس نہ کی بلکہ یہ اعلان کرکے کہ ہم اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اپنی صناعی کی داد خود دے لی۔ اس آخری صنعتِ الٰہی کا نام انسان ہے۔ ازل میں جو تماشا ہوا وہ مذہب پرست سے پوشیدہ نہیں۔ جنت سے نکل کر انسان نے دنیا بسا دی۔

زنا گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد (غالب)

دنیوی زندگی بخیر و خوبی گذارنے کے بعد انسان حیاتِ ابدی کا مستحق ہوتا ہے جس میں لقائے الٰہی، فردوس گوش اور جنتِ نگاہ ہے۔ شریعت انسان کی یہی انتہا بتاتی ہے۔ یعنی یہ وہی زندگی ہے جو یہاں آنے سے پہلے جنت میں انسان کو حاصل تھی۔ مگر یہ انتہا انسان کی ابتدار کا درجۂ ثانی ہے اور لقائے الٰہی میں مدارج کا امکان ہے اس لئے اس کو حیاتِ ابدی کہنے میں تکلف ہو سکتا ہے۔ صوفیار نے اس تکلف و حجاب کو بزعم خود طے کرکے قرآن پاک سے وصل کا مضمون ثابت کیا۔ یعنی انتہا وہی ہونا چاہیے جو ابتدا تھی اور اسی کو حیاتِ ابدی کہا جا سکتا ہے۔ انتہا و ابتدا کو ایک ثابت کرکے حیاتِ انسانی کو گویا ایک دائرہ اور حلقہ کی شکل دیدی۔

اصل سے جدا ہو کر عالمِ خلق میں آنے تک جو منازل انسان کو طے کرنا پڑے وہ صوفیا کے نزدیک قوسِ نزولی کہلائے اور عالمِ خلق سے اپنی اصلیت تک پہنچنے کے لئے جو مقامات طے کرنا پڑے وہ قوسِ عروجی سے نامزد کئے گئے۔ دونوں قوسین سے مل کر دائرہ بن جاتا ہے۔ قوسِ نزولی میں اختیار کا پتہ نہیں چلتا۔ قوسِ عروجی میں بغیر حرکت، عمل اور جدوجہد کے کام نہیں چلتا۔ عروج کرنے کے لئے

محنت و حرکت ضروری ہے لہٰذا اس حیاتِ مستعار میں جدو جہد لوازمۂ حیات ہے اور سکون بدتراز موت۔ جب یہ حقیقت ہے تو دنیا میں کوئی حرکت و عمل کو مانے یا نہ مانے مگر صوفی خواہ وہ کسی زمانے اور کسی مسلک کا ہو منکرِ عمل نہیں ہو سکتا۔ بغیر جدو جہد کے وہ صوفی کہلانے کا مستحق ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ "می تراش و می خراش" والا اصول صوفیانہ عمل کا بیّن ثبوت ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے جب آنکھ کھولی تو نئی سائنس اپنی خلاقی کی بہار دکھا رہی تھی اور اپنے اختیار و عمل سے مجبوریوں کو فنا کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ فلسفہ سائنس کا اتباع کر رہا تھا۔ مشاہدہ نے اقبال کو موازنہ پر آمادہ کیا تو معلوم ہوا کہ موجودہ صوفی باطنی مجاہدہ کے ذریعہ روحانیت کی فضا میں اس قدر بلند پروازی کر رہا ہے کہ چشم سر سے دیکھنے والے اور سمجھنے والے انگشت بدنداں ہیں اور عقل کی رسائی نہیں لیکن جوان صوفیوں کی ظاہری نقل کر رہے ہیں وہ وبالِ حیات ہیں۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ اور شاید انھیں کی کثرت ہے بہرحال موجودہ صوفیوں کی جدو جہد میں "انتم الاعلون" کا برملا ثبوت کہیں نہیں ملا۔ لہٰذا اس نے یوں مرثیہ پڑھا:-

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں۔ راکھ کا ڈھیر ہے

سائنس کی مادی ترقیاں تباہ کاریاں ہیں اور صوفی کی باطنی بلند پروازیاں ویرانیاں۔ زینتِ دنیا

نہ اِن سے نہ اُن سے۔ اور آفرینش کا مدعا زینت ہے۔ وجہ یہ کہ ہر جگہ یک طرفہ کوشش ہے۔ مادہ اور روح کا توازن دنیا کی رونق بن سکتا ہے اور یہی دونوں جگہ مفقود ہے۔ یہ توازن اگر کہیں پایا جاسکتا ہے تو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں اور اس کی تعلیم کہیں مل سکتی ہے تو اُس رَبِّ اضداد کے کلام پاک میں جس کی قدرت مطلقہ اندھیرے سے اجالا پیدا کرتی ہے اور اجالے سے اندھیرا۔ مردے سے زندہ بناتی ہے اور زندہ سے مردہ۔ لہذا قرآنی جدوجہد کا حکم ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے ندانند جام و سندان باختن

چنانچہ محض بر بنائے عقیدتمندی نہیں بلکہ تاریخ سے شہادت حاصل کرکے کہ مدّتِ قلیل میں ہر تہذیب و تمدن سے اپنا کلمہ پڑھوا چکی ہے اور فلسفہ جدید اس کا مؤید ہے۔ اقبال نے قرآنی تعلیم کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور اعلان کر دیا۔

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

اس سے یہ سمجھنا کہ تعلیم جدوجہد اقبال کی ایجاد ہے صحیح نہیں۔ البتہ قرآنی جدوجہد کو ترقی یافتہ سائنس اور جدید فلسفہ کی روشنی میں ظاہر کرنا اقبال کا بے مثال کمال ہے۔ پرانے فلسفہ کے مطابق صوفیار نے اپنی جدوجہد ایک دائرہ کی شکل میں دکھائی ہے فلسفہ جدید ایک دائرہ کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ صاف طور پر خطِ مستقیم نہیں رہ سکتا۔ خطِ مستقیم کی ابتدار و انتہا ملنا نہیں چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال صوفیار کے تخیّل کے خلاف وصل کے منکر ہیں۔ اور تسلسل لا متناہی کے قائل۔ خطِ مستقیم اور صراطِ مستقیم میں تجنیس و تشبیہ بالمعنی و بالصورت پائی جاتی ہو لہذا خطِ مستقیم کے ذریعہ قرآنی جدوجہد کی توضیح بہ نسبت دائرہ کے اولیٰ ہے۔ انسانی خودی مختلف

مدارج کو طے کرتی ہوئی قدرت لامحدود کا اظہار کرنے کے لئے خدائے یزال کے حضور میں اپنی لایزالی کا ثبوت پیش کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ فنائے محض نئی تحقیقات کے مطابق نا قابلِ تسلیم ہے۔ اقبال کے نظریہ کے مطابق حیاتِ ابدی کا یہی مفہوم ہے۔ وصل کو اگر حیات ابدی قرار دیا جائے تو آخر آخر کل تماشے کا ایک نہ ایک روز خاتمہ ضروری ہے۔ اس کے بعد وجودِ خداوندی کو نئی تخلیق کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح مقصد آفرینش کے حدود مقرر ہوئے جاتے ہیں اور فنا لازمی قرار پا جاتی ہے اور یہ قابلِ تسلیم نہیں۔ حصولِ مقصد مقصد کی موت ہے۔ نفی و اثبات کی تکرار کا لطف غائب ہوا جاتا ہے بہر حال یہ نظریہ اقبال علمار ظاہر کی کم از کم اتنی تائید کرتا ہے کہ حیاتِ ابدی لقائے الٰہی میں ہے مشاہدہ کے مدارج کبھی ختم ہونے والے نہیں اس لئے مشہود لایزال کے ساتھ شاہد کی بقار خود بخود ثابت ہے۔

جدوجہد کا اصول ہر سہ طبقۂ خیال میں مسلم ہے۔ صوفیار جد وجہد کا خاتمہ بصورتِ وصل کرتے ہیں اور سفر کے لئے مقصد و مقام کے قائل ہیں۔ علمار ظاہر جدوجہد کا مآل لقارِ الٰہی کو قرار دیتے ہیں اور اسی کو منتہائے سفر مانتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال لقارِ الٰہی کے لئے جدوجہد کو مستقل اور لامتناہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

سفر اس کا آغاز و انجام ہے

علمار ظاہر اور معتزلہ ازل میں واقعہ سجدہ کے بعد قیامِ جنت سے انسانی زندگی کی ابتدا سمجھتے ہیں اس لئے جنت پر ہی اس کا خاتمہ کر کے انسانی داستان کو ختم کرتے ہیں۔ علمار ظاہر جنت میں لقارِ الٰہی کے قائل ہیں۔ گویا کامیاب انسان خالق کی لقار کی مسرتِ لازوال سے محظوظ ہوتا رہیگا اور بس۔ معتزلہ لقارِ الٰہی کے نہ اِس زندگی میں قائل ہیں اور نہ اس زندگی میں۔ صوفیار ان دونوں سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ زندگی انسانی کو واقعہ سجدہ سے پہلے کی شے سمجھتے ہیں اس لئے آخر میں جز کو کل سے ملانا ضروری سمجھتے ہیں اور پھر امتیاز خالق و مخلوق کو دور کر دیتے ہیں۔ اقبال ان دونوں سے ایک نئی بات پیدا کرتے ہیں یعنی ان کے یہاں حیاتِ ابدی ایک حرکتِ مسلسل کا نام ہے۔ خاتمۂ

قیام عنقا ہے۔

نہ حد اس کی پیچھے نہ حد سامنے

اس اختلاف نے علمائے ظاہر کو شہودی بنا دیا اور صوفیاء کو وجودی۔ شہودی بغیر کسی قسم کے اتحاد کے توحید کو خالص اور منفرد مانتے ہیں اور وجودی اتحاد کے قائل ہیں۔ ان دونوں کی بحثیں اس قدر دقیق ہیں کہ نہ سمجھ میں آتی ہیں اور نہ ان کا کچھ حاصل وصول ہے۔ وجودی گروہ ملزم قرار دیا جاتا ہے کہ عقیدۂ وحدت الوجود یونانی اور ویدانتی فلسفہ سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن نفسِ حقیقت پر غور کیا جائے تو وحدت الوجود سے انکار مشکل ہوگا۔

اہلِ شہود کی توحید کا بہترین استدلال خالق و مخلوق کے حدود ہیں اور یہی امتیاز وحدت الوجود کی تردید کا باعث ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی اس کے کچھ معنی ہوں مگر اب تو یہ امتیاز کچھ بے معنی سا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ امر کو ذات سے جدا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ روح امرِ ربی ہے جو مجسمۂ خاکی میں پھونکی گئی لہٰذا جہاں تک روح کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ ذات مخلوق میں جاری و ساری ہے اور یہی حقیقت وحدت الوجود ہے مگر اس کے بعد جسم کی شمولیت مانع آتی ہے اس لئے کہ مادہ فانی ہے اور ذات باقی۔ اور یہ اجتماع وحدت وجود کے منافی ہے۔ جدید سائنس نے اول اول یہ ثابت کر دکھایا کہ مادہ فانی نہیں ہے اس میں محض تغیر واقع ہوتا ہے جس کو عدم و فنا نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ مسلمہ مغالطہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ عالمِ امر زمان و مکان سے آزاد ہونے کی وجہ سے جزوِ ذات ہے اور عالمِ خلق زمان و مکان کی قید میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جزوِ ذات نہیں۔ اگر تغیر ہی وجہ امتیاز ہے تو مدارجِ تنزلات عالمِ امر میں بھی تغیر کا پتہ دے رہے ہیں لہٰذا جب عالمِ امر و خلق دونوں میں تغیر شامل ہے اور کسی شے کی فنائیت ثابت نہیں تو مادہ کو روح کی طرح جزوِ ذات سمجھنا ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ گویا وحدتِ وجود اس طرح ظاہر ہو گئی۔ لیکن یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ جدید سائنس کی آخری تحقیق نے مادہ کا تجزیہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ انتہائی خفیف ترین جز ایٹم (ATOM) الکٹرون اور پلیٹون سے مرکب ہے اور یہ دونوں بجلیاں ہیں منفی اور مثبت۔ پلیٹون کی برق مثبت کے گرد الکٹرون کی برق

منفی اُچھل اچھل کر قربان ہورہی ہے اور وجۂ حیات بنی ہوئی ہے۔ جب یہ طے ہوگیا کہ مادہ برقِ منفی پر مبنی ہے تو مادیت کا سوال خارج از بحث اور فضول ہے۔ مادہ روحانیت پر بنا رکھنے کی وجہ سے یقیناً وحدتِ وجود کے مانع نہیں آسکتا۔ اس طرح ان حدود کا حجاب ہٹ جانے کے بعد اہلِ شہود کو اپنے نظریہ کی اصلاح ضروری ہے۔ برقِ منفی جب مادہ کی ابتدائی حقیقت ہے تو لا الٰہ الا اللہ کا پہلا لفظ لا اعلان کر رہا ہے:۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

اقبال کے معتقدین عرصہ تک گومگو میں مبتلا رہے۔ بعض نے اس کو اہلِ شہود میں شمار کیا بعض نے اسے اہلِ وجود سے سمجھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال بذاتِ خود جس توحید کا قائل و مبلغ ہے وہ اہلِ شہود کی توحید سے مختلف ہے اور جس وحدت الوجود کو وہ تسلیم کرتا ہے وہ اہلِ وجود کے وحدت الوجود سے علیحدہ ہے۔ رجحانات و اقدار کی تبدیلیوں کی وجہ سے اقبال نے نتیجۂ وصل کو چھوڑ کر وحدت الوجود کے تمام رنگ ٹھوس توحید میں بھر دیئے۔ اور اختلاف کو دور کرکے اتحاد کی ایک عجیب و غریب اور بامعنی راہ نکالدی۔ خالص چشمۂ توحید سے بے شمار توحیدیں ابل پڑیں لیکن توحید میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ اِن قطراتِ توحید کی عشرت دریا میں فنا ہونا نہیں ہے بلکہ خود دریا بننا ہے۔ یہ بیشمار دریا قدرتِ توحید کے لا متناہی ہونے کی دلیل ہیں اور بوئے شرک سے پاک۔ جب تک چشمۂ توحید موجود ہے یہ بے شمار اور روز افزوں توحید کے دریا بھی بہتے رہیں گے یعنی خودی خدا کے ساتھ خودیٔ انسانی بھی لازوال رہے گی اور جذب و وصل کے سکون کے بجائے سلسلۂ سعی و عمل برابر جاری رہے گا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔۔۔ مرے عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

کلّ یومٍ ھو فی شأن

اس سعی و عمل کے سلسلہ میں جبر و اختیار کا مسئلہ ضروری ہے۔ قدریوں اور جبریوں کے مباحث نے خون کے دریا بہادیئے ہیں۔ جبری کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ قدریوں کا خیال ہے کہ انسان خود خالقِ افعال ہے۔ یہی قدری بعد کو معتزلہ کہلائے گئے۔

عمل وحرکت کی حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت اسی وقت وجود میں آتی ہے جب پیچھے سے کوئی دھکا دے اور آگے سے کوئی کھینچے۔ جب تک یہ دونوں امور نہ ہوں گے حرکت صحیح وجود میں نہیں آئے گی۔ انسان اپنی خلقی طبیعت۔ موروثی عادت اور اپنی تربیت وماحول سے متاثر ہو کر آرزوئے عمل کرتا ہے۔ مقصد و منزل اس کو اپنی طرف آگے سے کھینچتی ہے لہٰذا وہ عمل کرتا ہے یعنی ایک قضار سے دوسری قضار کی طرف سعی عمل ہوا کرتی ہے۔ یہی قاعدہ کلیہ ہے قضائے ماضی اور قضائے مستقبل دونوں مجبوریاں ہیں لہٰذا درمیانی راستہ بھی جبر ہے اب کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر شے اپنی فطرت پہ جاری ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کس نے کہا کہ فطرت اسمار اور سنت اللہ دونوں ایک ہیں۔ بس ان دونوں کے فرق واختلاف میں مجبوری غائب ہو جاتی ہے اور شکل اختیار نمودار ہو جاتی ہے۔ یہی اختیار فطرت اشیار اور سنت اللہ کے فرق کو واضح کیا کرتا ہے۔ مولانا روم نے اس مغالطہ کو صاف کیا ہے:۔

بال بازاں راسوئے آسماں برد　　بال زاغاں رابہ گورستاں برد

پر وبال تو وہی ایک ہیں مگر نتیجہ مختلف ہے۔ تفکر وتدبر بتاتا ہے کہ پر وبال کی فطرت محض پرواز ہے مگر سنت اللہ نے ایک کو فلک الافلاک پر پہنچا دیا۔ فطرت وجبلت کو مہذب بنا دینا سنت اللہ کا کام ہے۔ فطرتِ اشیار کو مہذب بنا دینا استعدادِ اشیار پر منحصر ہے جس کی وجہ سے بارِ امانت کو ایک نے قبول کر لیا اور بقیہ نے پناہ مانگی۔ لہٰذا فطرت اشیار اور سنت اللہ کا فرق یوں سمجھ میں آسکتا ہے کہ انسانی فطرت تو وہ تھی جس کی وجہ سے اس کو ظالم وجاہل کہا گیا۔ اگر وہ اپنی فطرت پر کام کرتا تو حیات ابدی کی کبھی تمنا اس کے دل میں پیدا نہ ہوتی۔ حیات ابدی محض اس کا حق ہے جو بارِ امانت کے فرائض کو پورا کر دکھائے۔ امانت ہر شے کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ ظالم وجاہل انسان نے اس کو قبول کر لیا۔ اس استعداد میں اختیار کی جھلک نظر آرہی ہے۔ اس بار امانت کے پیش ہو جانے کے بعد جب آدم و شیطان نے فعل کیا تو دونوں اپنی اپنی فطرت پر قائم تھے۔ آدم کی گندم خوری ظلم وجہالت کی وجہ سے تھی۔ اور شیطان کی نافرمانی اس کی سرکشی کے سبب سے تھی۔ امانت کے اصول کے لحاظ سے دونوں پر

اعتراض کیا گیا۔ایک نے اپنی فطرت کے مطابق سرکشی کا اعلان کیا اور راندۂ درگاہ ہوا۔دوسرے نے بارِ امانت کو محسوس کرتے ہی اپنی فطرت ظلم و جہالت پر شرمندگی کا اظہار کیا لہذا معاف کیا گیا۔شیطان اپنی فطرت سرکشی پر قائم رہ کر اصولِ امانت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے انسان کو فریب دینے کی مسرت میں آخری درخواست پیش کرتا ہے کہ بہکانے کے لئے وہ تا حشر زندہ رکھا جائے۔درگاہ رب العزت سے جواب ملتا ہے کہ "جا منظور ہے مگر تو میرے مخلص بندوں کو نہ بہکا پائے گا" یہ مخلص ہونے کی صفت قبولیت بارِ امانت نے پیدا کردی۔جو انسان اس عطیۂ اختیار سے کام لے گا وہ مخلص شمار کیا جائیگا اور شیطان کی زد سے باہر رہے گا۔

آدم کا قصور یہ تھا کہ اس نے تہذیب و اختیار ترک کرکے اپنی فطرت پر عمل کیا۔بعد کو جب وہ شرمندہ ہوا تو تہذیب و اختیار کی مشق کرنے کے لئے دنیا میں بھیجدیا گیا اور شیطان کو موقع دیا گیا کہ اس کی مہذب شدہ فطرت پر اسے آزماتا رہے تکمیل و کامیابی انسان کو حیاتِ ابدی کا مستحق قرار دیگی۔ دیگر حشرات الارض کی طرح حیاتِ دنیوی کا خاتمہ یہیں ہونا چاہیے تھا مگر شیطان کو معلم الملکوت ہونے کا امتیاز حاصل تھا اس لئے حشر تک زندہ رہنے کی اجازت دیدی گئی۔اس کے بعد اس کا وجود اور اس کی شیطنت سب ختم۔انسان بعد کامیابی حیاتِ ابدی کا مستحق ہوا۔اس حیاتِ ابدی میں شیطان اور آزمائش سے کچھ واسطہ نہیں۔

فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ اس کی جدوجہد کو ظلمت و جہالت کی طرف لے جائے۔ مگر تہذیب کا منشا ہے کہ ظلمت و جہالت سے بچا کر ابدیت کی منزل پر پہنچائے۔گویا انسان کے سامنے قضائے آئندہ دو ہوتی ہیں۔ایک وہ جو اس کی فطرت مقرر کرتی ہے اور دوسری وہ جو مہذب شدہ فطرت یعنی سنت اللہ قائم کرتی ہے۔ان دونوں میں انتخاب کرنا اختیاری بات اور اسی پر جزا و سزا کا انحصار ہے۔مجبوریوں میں اختیار کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اسلامی جدوجہد کے معنی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن پاک کی عہدِ تنزیل کی جدوجہد کو پہلے سمجھ لیا جائے جس کی اصلاح اسلام نے کی ہے۔فطرتِ انسانی میں خوف کا عنصر موجود ہے

اور خوف سے مایوسی پیدا ہوا کرتی ہے۔ بت پرستی۔ آتش پرستی، یہودیت اور عیسائیت میں مختلف طرح خوف و یاس کی نمایش بے پردہ کی جاتی ہے۔ اگر اسلام خوف و یاس کی نمایش کی تائید کرتا تو اسے غلبہ و امتیاز کبھی حاصل نہ ہوتا اور اگر تردید کرتا تو اس کی طرف توجہ مشکل سے ہوتی۔ قرآن پاک نے اس فطری خوف کی باگ نہ صرف خدا کی طرف موڑ دی بلکہ اس خوف کا نام بھی بدل کر اتقاء رکھ دیا۔ اور پھر اتقاء کے منازل میں خوف کو پرہیزگاری کا جامہ پہناتے ہوئے خوف کے بجائے محبت کی انتہا تک پہنچا دیا اور یہی وہ خصوصیت ہے جو سوائے اسلام کے ہر جگہ مفقود ہے چنانچہ سینہ ٹھونک کر بتایا گیا ہے:۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اور کان کھول کھول کر سنایا گیا ہے۔ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ جس جدوجہد میں خوف نہ ہو اور جس میں محبت و عشق کی چاشنی ہو وہی اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی منزل تک پہنچا سکتی ہے ایسی سعی و عمل سے حزن و یاس پناہ مانگتے ہیں: ناکامیاں مانع مقصد نہیں ہوا کرتیں، تزلزل سے سابقہ نہیں پڑا کرتا، امید و آرزو برابر راہبری کیا کرتی ہے۔ اسلام نے مایوسی کو حرام قرار دیا ہے اور نہایت شفقت آمیز طریقہ سے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ کی تلقین کی ہے۔ اس تعلیم کو اقبال کے یہاں رجائیت سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ لازمۂ جدوجہد ہے۔ وہ جدوجہد وہ سعی و عمل جو خوف سے بے نیاز ہو اور جو محبت و یقین سے ساز باز رکھتی ہو عجوبۂ روزگار ہے اور اس کا واحد مدعی قرآن پاک ہے۔

علما ظاہر، صوفیائے صافی۔ فلسفہ و سائنس۔ اقبال ہیں اور آپ سب کے سب جدوجہد، جنبش و حرکت اور سعی و عمل کے قائل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عمل صالح بذاتِ خود ہے کیا؟ قرآن نے عمل کرنا سکھایا۔ عرب کی قیاسی عقیدتمندی کو صحیح تعمیل عمل میں تبدیل کر دیا اور اس کو آفتاب بنا کر چمکا دیا اور اس کی ضیاء سے سارے عالم کو منور کر دیا۔ کمالِ عمل حاصل کرنے کے بعد عرب کی شکست خوردہ ذہنیت نے پھر پلٹا کھایا اور اپنے پرانے توہمات و ظنیات کو زندہ کرنے کی طرف

متوجہ ہوگیا۔ یونانی فلسفہ۔ ہندوستانی عقائد اور ایرانی توہمات نے عرب کو اور شہ دی اور وہ دور از کار عقلی و نقلی مباحث کو قرآن کی تعلیم کا اصل منشا سمجھنے لگا اور فروعات میں مبتلا ہو کر اصل حقیقت کو چھوڑ بیٹھا۔ عرب و عجم کی عقل پر جب پردے پڑ گئے تو قرآن پاک کی ہدایات کے مطابق عمل کرنے کے بجائے قرآن پاک کی آیات کا عمل پڑھنا شروع کر دیا گیا۔ اور اسی کو عمل صالح سمجھا جانے لگا۔

قرآنی عملِ صالح کے نتائج بھی اظہر من الشمس ہیں اور اس کو ترک کر دینے کا حشر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ان دونوں قسم کے نتائج دیکھ لینے کے بعد سمجھا جا سکتا ہے کہ اخلاقِ الٰہی سے آراستہ ہونے کے بعد فطرت کو مسخر کر لینے کا نام عمل صالح ہے یا بندگی بے خدائی کرنے کا نام عملِ صالح ہے۔

ہر عمل سے پہلے علم ضروری ہے۔ علم صحیح وہ ہے جو آنکھ کان اور فواد سے حاصل ہو۔ اگر فواد اپنے فرائض صحیح ادا کر رہا ہے تو آنکھ کان کی شہادت میں شبہ نہیں۔ فواد سے اصلی کام لینے کے لئے ضروری ہے کہ اسے قرآنی اوامر و نواہی کا پابند بنایا جائے جن کی تشریح اقبال نے "ضبط نفس" کے تحت میں کی ہے۔ اسی مقصد کی طرف صوفیار نے اپنی تمام تر توجہ منعطف کر دی ہے لیکن اس کا مصرف ان کے یہاں مختلف و محدود ہے۔ وہ اعمالِ ظاہری کو ترک کر کے اعمالِ باطنی کی تعمیل کرتے ہیں اور بس۔

ضبطِ نفس یا اوامر و نواہی کی تعمیل کے بعد آنکھ کان میں جب علم صحیح اخذ کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے گی تو اس علم کا مقسوم عمل صالح کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ضبط نفس سے انسان کو وہ اختیار حاصل ہوتا ہے جو اس کی جبلت ظلم و جہالت سے اس کو باز رکھتا ہے اور جو اس کو اس کی فطرت مہذب شدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ میں لا اعلان نفی ہے مگر یہ اس قسم کی نفی نہیں ہے جس قسم کی یونانیوں اور ویدانتیوں کے یہاں ہے۔ نفیِ نفس اس لا کا مدعا نہیں۔ بلکہ نفس کو مہذب بنا کر اس سے صحیح کام لینا اسلام کا برملا منشا ہے۔ غیر ذات کی نفی حقیقت

ہیں اس لا کا مقصد ہے تاکہ چون وچرا کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یہ لا نفس کو تخلقو باخلاق اللہ سے مزین کرکے شرک سے محفوظ و مامون بناتا ہے۔ اگر ان جملہ نفیوں میں بظاہر اشتراک و اشتباہ کی کوئی شکل پیدا ہو جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ سب کا منشا ایک ہے۔ اسی طرح سے بظاہر متفق ہونا بھی اتفاق کی علامت نہیں کیونکہ ان جملہ نفیوں میں سے ہر ایک کا مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق بھی مختلف طریقہ و معیار ہے۔

انسانی انجام و وسط کی، سطور بالا میں تشریح کرچکنے کے بعد آغاز انسانی کی وضاحت ضروری ہے تاکہ اس لا کی حقیقت منکشف ہو اور تشریح شدہ وسط و انجام سے سلسلہ مربوط ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

مسلمان عورت

مصنف
علامہ فرید وجدی مصری

مترجم
علامہ ابوالکلام آزاد

اہلِ مغرب نے اس صنفِ لطیف کے متعلق جو نظریئے قائم کر رکھے ہیں "مسلمان عورت" میں ان نظریوں کے بالمقابل اسلامی تعلیمات کو جدید اسلوبِ فکر اور روشن اندازِ بیان کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، مختصر فہرست ملاحظہ کیجئے:۔ (۱) عورت کیا ہے؟ (۲) عورت کے فطری اور قدرتی فرائض کیا ہیں (۳) کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں برابر ہیں (۴) کیا عورتیں عملی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ کامیابی سے دے سکتی ہیں (۵) کیا پردہ عورت کی فطری صلاحیتوں کا ایک قدرتی ذریعہ ہے؟ (۶) کیا پردہ عورتوں کے لئے غلامی کی علامت ہے اور کیا یہ حقیقی ترقی کے منافی ہے۔ مصنف نے ان تمام عنوانات پر علم الحیات، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات اور تاریخ کی روشنی میں بحث کی ہے۔ مولانا آزاد نے اس اہم اور نہایت مفید کتاب کا ترجمہ اخبار وکیل امرتسر کی ادارت کے زمانہ میں کیا تھا۔ ترجمہ کا طرز کچھ ایسا انوکھا ہے کہ اس کی حیثیت قدرتی طور پر کتاب کے اردو ایڈیشن کی ہو گئی ہے۔

صفحات ۲۶۴ قیمت مجلد دو روپیہ چار آنے۔ پتہ مکتبہ برہان دہلی قرول باغ۔

حضرت موسیٰؑ کے واقعۂ ایذا رسانی
اور
برارت کی تحقیق

(جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

سورہ احزاب کی آیت "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوْا وَکَانَ عِنْدَ اللّٰہِ وَجِیْھًا" کی تلاوت کے وقت قرآن کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس آیت میں مسلمانوں کو کس امر میں قوم موسیٰؑ سے مشابہت اور مماثلت اختیار کرنے سے روکا گیا ہے اور ایذا کی وہ کون سی قسم تھی جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کو پہنچائی تھی جس کے ارتکاب سے آخری شریعت کے پیرووں کو منع کیا گیا ہے۔ اس سوال کے جو جوابات کتبِ تفسیر میں دیئے گئے ہیں، مناسب ہوگا کہ پہلے انھیں پیش کر دیا جائے تاکہ سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں جو جواب اوفق ہو اُسے اختیار کیا جاسکے یا ان کی روشنی میں کوئی رائے قائم کی جاسکے۔ ذیل میں ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن صاحب کو تفصیل کی ضرورت ہو انھیں کتبِ تفسیر کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حضرت موسیٰؑ بڑے شرمیلے تھے۔ غایتِ حیا سے اپنا جسم چھپائے رکھتے تھے۔ اس پر بنی اسرائیل نے ان کو یوں ایذا پہنچائی کہ کہنے لگے کہ یہ بدن کو ہمیشہ (معلوم ہوتا ہے) اس لئے چھپائے رکھتے ہیں کہ ان کو برص وغیرہ کا کوئی عارضہ ہے۔ خداوند تعالیٰ نے یہ الزام ان سے اس طرح دور کیا کہ ایک روز وہ غسل کرنے گئے اور کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے لیکن جب غسل کر چکے اور چاہا کہ کپڑے پہنیں تو پتھر کپڑے لئے وہاں سے چل دیا

اور وہ اس کے پیچھے ثوبی حجر ثوبی حجر کہتے ہوئے دوڑے۔ آخر بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس جاکر پتھر رک گیا۔ لوگوں نے جب انھیں اس طور سے دیکھا تو ان کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ انھیں برص وغیرہ کی کوئی بیماری ہے۔

(۲) حضرت علیؓ زیر بحث آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ پہاڑ پر چڑھ گئے اور اسی پر حضرت ہارونؑ کا انتقال ہو گیا۔ اس پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ پر یہ الزام رکھا کہ تم نے انھیں قتل کر دیا، وہ تم سے زیادہ حیادار اور نرم مزاج تھے۔ اس طرح انھوں نے حضرت موسیٰؑ کو دکھ دیا۔ اس الزام کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت ہارونؑ کو لے کر بنی اسرائیل کی مجالس پر گذریں تاکہ انھیں اس بات کا یقین آئے کہ وہ قتل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ طبعی موت مرے ہیں کیونکہ اگر قتل کئے گئے ہوتے تو آثار زخم جسم پر ہوتے۔[له]

(۳) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے قال بعضہم کہہ کر حضرت موسیٰؑ کو ایذا دینے اور پھر اس کو انھیں بری قرار دینے کے باب میں ایک اور قول بھی نقل کیا ہے جو کو فحش ہے لیکن دل پر جبر کر کے ہم اُسے یہاں نقل کر دیتے ہیں کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" وہ یہ ہے کہ قارون نے ایک بازاری عورت کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو مجلس میں علی روس الاشہاد حضرت موسیٰؑ کے متعلق کہے کہ "انھوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے" چنانچہ اس کے لئے قارون نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور وقت آیا کہ وہ بہتان طرازی میں زبان کھولے لیکن عین وقت پر قدرت نے سچ کہنے کا اسے الہام کیا۔ پس اس نے وہ بات نہ کہی جو اسے سکھائی گئی تھی بلکہ ان کی عصمت اور پاک دامنی کا علی الاعلان[ك] اظہار کیا۔

یہ ہیں مذکورہ بالا روایات واقوال جن کی روشنی میں حضرت موسیٰؑ کو ایذا دینے اور پھر اس سے انھیں بری ٹھیرانے کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔

اوپر کے اقوال میں سے شروع کے دو قول ابن کثیر سے اور آخر کا تفسیر کبیر سے نقل کیا گیا ہے امام ابن کثیرؒ شروع کے دو اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک قول کے صحیح ہونے کا احتمال ہے

له ابن کثیر ج ۳۔ ك تفسیر کبیر ج ۶۔

نیز اس کا بھی احتمال ہے کہ ایذا اور پھر اس سے برأت کی کوئی اور شکل پیش آئی ہو۔

امام رازیؒ نے ایذا موسیٰؑ کی اور شکلیں بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں مثلاً ان کی قوم نے "اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون" کہا اور ایک موقع پر "لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" اور ایک دوسرے موقع پر "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ" کہا لیکن اس سورہ کا نظم مذکورہ بالا اقوال کی تائید میں نہیں ہے، ہاں امام رازیؒ نے جو ایک قول قال بعضھم کہکر نقل کیا ہے اور جسے ہم اوپر درج بھی کر چکے ہیں اس سے کچھ نوعیت ایذا کی طرف اشارہ ہوتا ہے، رہا یہ امر کہ اس طرح کی سازش قارون کے ہاتھوں عمل میں آئی، محتاج تحقیق ہے کیونکہ آیت کا رجحان اس طرف ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کے ہاتھوں دکھ دیا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ اس کا شکوہ خود انھوں نے یوں کیا ہے۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (الآیہ) اور اس واقعہ کو بطور تنبیہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ دیکھو تم کہیں ان کی روش پر نہ چلنا اور یہ مان لینے کے بعد کہ قارون کے ہاتھوں حضرت موسیٰؑ کو دکھ پہنچا۔ حالات میں تطابق نہ ہوگا کیونکہ پھر اس کے معنی گویا یہ ہوں گے کہ اے مسلمانو! تم ان لوگوں (قارون اور اصحاب قارون) کی مانند نہ ہو جاؤ جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو دکھ دیا۔ حالانکہ بات یہ نہیں کہنی ہے بلکہ ایک امت کی حالت دوسری امت کے سامنے بطور تذکیر و تبصیر پیش کرنی ہے اور دوسرے یہ کہ اس سورہ کا بیشتر حصہ منافقین اور کچے دل لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ہمارے خیال میں آیت زیر بحث کے اس ٹکڑے "فبرأہ اللہ، مما قالوا" میں نوعیت ایذا کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے، رہ گئی اس کی قطعی تعیین کہ کس نوع کی ایذا دی گئی تو اس کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ عدم تعیین نفس واقعہ کے مدعا پر اثر انداز ہے، نوعیت ایذا کے بارے میں قرین قیاس یہ ہے کہ قوم موسیٰؑ میں سے بعضوں پر اس پیغمبر جلیل کی دعوت گراں گزری ہوگی اور انھوں نے آپ کو یا آپ کے متعلقین میں سے کسی کو متہم کرنے کی سازش کی ہوگی اور قدرت نے ان کی افترا پردازی

فاش کردی ہو گی۔ اور غالب قرینہ ہے کہ یہ حرکت منافقین بنی اسرائیل نے کی ہو گی۔ کیونکہ ہر پیغمبر کے عہد میں یہ مار آستین پائے گئے ہیں اور انھوں نے مذہب کی آڑ میں وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ الامان و الحفیظ۔ خود رسالتِ کبریٰ کے عہد میں بھی یہ طبقہ ناہنجار ایک بڑی تعداد میں موجود تھا، پیغمبرِ عالم کو حضرت عائشہؓ پر اتہام تراش کر کے اس نوع کی ایذا پہنچانے میں خاص ہاتھ انھیں کا تھا چنانچہ سورۂ نور میں نہایت صراحت سے اس کی قلعی کھولی گئی ہے اور اس اتہام کے رد میں جو آیات وارد ہیں اس کی آخری آیت میں بھی آیت زیرِ بحث کی طرح فبراہ اللہ، مما قالوا، کا ٹکڑا باسلوب دگر لایا گیا ہے جس سے اس واقعہ کی واقعہ افک سے مماثلت پورے طور سے مفہوم ہوتی ہے اور نیز نوعیت ایذا کی طرف بھی غمازی ہوتی ہے، وہ آیت یہ ہے۔

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ	خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث
الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَ	مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاک دامن عورتیں
الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ	پاک دامن مردوں کے لئے ہیں اور پاک دامن مرد
لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ	پاکدامن عورتوں کے لئے ہیں، ان کا دامن ان کی
مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ	افترا پردازی سے پاک ہے۔ ان کے لئے بخشش
رِزْقٌ كَرِيْمٌ (نور - ۲۶)	اور بہترین رزق ہے۔

مندرجہ بالا آیت واقعہ افک کے سلسلہ کی آخری آیت ہے، دیکھئے یہاں بھی فبراہ اللہ مما قالوا" کا ایک ٹکڑا" اولئک مبرؤن مما یقولون" کے قالب میں موجود ہے، فرق صرف اسلوب کا ہے، نیز خود اس سورہ کی بعض اور آیات سے بھی اس طرح کی ایذا دہی کی تائید ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ	اے نبی اپنی بیویوں سے کہدے اگر تمہیں دنیاوی زندگی
كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا	اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں
فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ	اس سے متمتع کروں اور رخصتی جوڑے دیکر نہایت
سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ	خوبصورتی سے تمہیں رخصت کردوں اور اگر اللہ

اللہ وَرَسُوْلَہٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَۃَ	اور اس کا رسول اور اخروی زندگی چاہتی ہو تو بلاشبہ
فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ	خداوند تعالیٰ نے تم میں سے احسان والوں کے
اَجْرًا عَظِیْمًا۔	لئے بڑا اجر تیار کیا ہے۔
(۲) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ	اے مسلمانو! پیغمبر کے گھروں میں کھانے کے لئے
النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ	داخل نہ ہو مگر یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے نہ انتظار
غیر ناظرین اناہ ولکن اذا دعیتم	کرنے والے ہو اس کے پکنے کا، لیکن جب بلائے جاؤ
فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا	تو داخل ہو پس جب تم کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور نہ ہو
ولا مستانسین لحدیث ان ذالکم	بات میں جی لگانے والے، بیشک یہ چیز پیغمبر کے
کان یوذی النبی فیستحی منکم	لئے وجہ ایذا ہے پس وہ تم سے شرماتا ہے اور اللہ
واللہ لا یستحی من الحق واذا	حق بات سے نہیں شرماتا اور جب تمہیں ان سے
سالتموھن متاعا فاسئلوھن من	کچھ مانگنا ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو یہ تمہارے
وراء حجاب۔ ذالکم اطہر لقلوبکم	اور ان کے دلوں کی طہارت کے زیادہ قریب ہے
وقلوبھن وما کان لکم ان توذوا	اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو دکھ دو
رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ	اور نہ کبھی بھی یہ جائز ہے کہ اس کے بعد اس کی
من بعدہ ابدا ان ذالک کان	بیویوں سے نکاح کر لو بلاشبہ خدا کے نزدیک یہ
عند اللہ عظیما۔	بہت بڑا جرم ہے۔
(۳) ان الذین یوذون اللہ ورسولہ	یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو دکھ دیتے
لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ	ہیں ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی
واعد لھم عذابا مھینا والذین	پھٹکار ہے۔ اور ان کے لئے خدا نے دردناک سزا
یوذون المؤمنین والمؤمنات	تیار کی ہے اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور
بغیر ما اکتسبوا فقد	مسلمان عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ

احتملوا بھتانا وّ اثما مّبیناً۔ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہو وہ بہتان اٹھانے والے اور گنہگار رہیں۔

اوپر نمبر وار جو آیتیں ہم نے نقل کی ہیں ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایذا کی نوعیت پر مشتمل ہے، پہلے نمبر کی آیات میں پیغمبر عالم کو ایذا پہنچانے کی نوعیت کی تصریح تو نہیں ہے لیکن آیات کے معانی پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کی جانب سے کوئی نہ کوئی ضرور ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان آیات میں ان کو اتنی سخت ڈانٹ بتائی گئی۔ ہمیں جہاں تک اس کی وجہ معلوم ہو سکی ہے یہ ہے کہ منافقین کی عورتیں ازواجِ مطہرات کے یہاں جاتیں اور ان کی حالتِ زار کا ماتم کرتیں اور طرح طرح سے نان ونفقہ کے اضافہ کے مطالبہ پر انھیں اکساتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض ازواج ان کی باتوں سے متاثر ہو گئیں اور انھوں نے نان ونفقہ کے اضافہ کا مطالبہ شروع کر دیا اور اس پر یہ آیات عتاب نازل ہوئیں جن میں صاف صاف کہدیا گیا کہ جسے دنیا کے مزے مرغوب ہوں وہ پیغمبر کے پاس سے رخصتی جوڑے لیکر چلدیں اور جنھیں آخرت کی راحت مطلوب ہو وہ پیغمبر کے ساتھ کلفت اور عسرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور نیکی اور عملِ صالح میں مشغول رہیں۔

گو برملا نہ سہی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ در پردہ پیغمبر عالم کو منافقین کی طرف سے ایذا دینے کی ایک شکل یہ بھی تھی جسے انھوں نے اختیار کیا تھا اور اس طرح کی کارروائی کرنے میں ان کو سہولت بھی تھی اس لئے کہ مسلمانوں میں پوری طرح وہ گھلے ملے رہتے تھے، باہر مرد پیغمبر عالم اور آپ کے جاں نثاروں کو دکھ پہنچانے کی تدبیریں برروئے کار لاتے اور گھروں میں ان کی بیویاں فتنے پھیلاتی پھرتی تھیں۔

دوسرے نمبر کی آیت میں خطاب کا آغاز گو "یا ایھا الذین آمنوا" سے ہوا ہے لیکن حقیقت میں روئے سخن اسلامی جماعت کے کچے دلوں اور منافقین کی جانب ہے جو بظاہر جماعت میں داخل تھے لیکن ان کی زندگی پر اس کا کچھ اثر بھی نہ پڑا تھا۔ نیز اس آیت میں پیغمبر عالم کے ساتھ ان کی بعض زیادتیوں اور ایذا دہی کی طرف اشارہ نہیں بلکہ تصریح ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں کو

اپنے یہاں دعوت دیتے تو منافقین کھانا تیار ہونے سے پہلے ہی ازواجِ مطہرات کے یہاں پہنچ جاتے اور فساد انگیز باتیں شروع کر دیتے، ان کی عسرت اور تنگدستی کا خوب رونا روتے اور باتوں میں یہ بھی کہہ ڈالتے کہ اگر آپ لوگوں کو پیغمبر صاحب الگ کر دیں تو ہم متمول لوگوں سے آپ لوگوں کا رشتہ قائم کر دیں اور پھر اطمینان اور سکھ کی زندگی بسر ہو، یہ غضب کا افلاس آپ ہی لوگوں کا دل وجگر ہے کہ برداشت کر رہی ہیں، دیکھئے کیا یہ کھلی ہوئی ایذا رسانی نہیں ہے ؟

تیسرے نمبر کی آیات میں ایذا رسانی کی یہ نوعیت مذکور ہے کہ جب ازواجِ مطہرات اور دوسری مسلمان عورتیں رات میں ضرورت سے نکلتیں تو ان سے منافقین مذاق کرتے اور جب ان سے اس پر بازپرس ہوتی تو یہ تاویل کرتے کہ ہم نے پہچانا نہیں۔ ہم نے سمجھا لونڈیاں جا رہی ہیں۔ چنانچہ اسی لئے ارخاء جلباب کا حکم آیا تاکہ حرائر اور اماء میں تمیز ہو سکے اور شبہ میں ازواج مطہرات اور پیغمبر کی صاحبزادیاں اور مسلمانوں کی عورتیں ستائی نہ جائیں۔ یہ بھی ایذا کی ایک نہایت گھنونی شکل ہے جو منافقین نے اختیار کی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ایذا دینے والے ان کی قوم کے منافقین تھے اور ایذا کی نوعیت اسی طرح کی کوئی رہی ہوگی جو آخری پیغمبر کے عہد میں منافقین نے اختیار کی، رہا تعیین کا مسئلہ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایذا کی فلاں ہی نوعیت موسیٰ علیہ السلام کو دکھ دینے کی استعمال کی گئی کیونکہ جب اس بارے میں کچھ تصریح نہیں ہے تو جو کچھ بھی اس باب میں کہا جائے گا ظن وقیاس سے زیادہ اس کی حیثیت نہ ہوگی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس واقعہ کے اس سورہ میں ذکر کا کیا مقصود ہے ؟ تو اس کا مقصود بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جماعت کے کمزور اور کچے دلے ممبر اس سے سبق لیں اور نافرمانی رسول سے بچیں اور رسول کی اطاعت کا سچا جذبہ پیدا کریں اور کوئی قدم بھی ایسا نہ اٹھائیں جو غلط ہو اور میثاق طاعت کے منافی ہو اور جو لوگ عہد طاعت پر قائم ہیں ان کے اندر اور زیادہ جوش اور استقامت پیدا ہو۔

امانتِ الٰہیہ

از جناب مولوی محمود بن عبدالرشید شہیدؒ دہلوی

انسان عالمِ ایجاد میں تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابھی اس کا پتلا تیار کر کے اس میں روح پھونکی تھی۔ اس کو عالمِ تحقیق میں لایا بھی نہ گیا تھا۔ یہ انسان بطنِ مادر و صلبِ پدر سے آگاہ بھی نہ تھا کہ خالقِ حقیقی نے اپنی امانت اس کے سامنے پیش کی اور فرمایا کہ اگر اس امانت کو اٹھا لوگے اور اس کی حفاظت کروگے تو تم کو اچھا بدلہ دوں گا۔ اور اگر نافرمانی کروگے تو تم کو سزا بھی دی جائے گی۔ اور یہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ آسمانوں، زمین، پہاڑوں نے اس امانت کے برداشت کرنے، اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انسان نے اپنی فطری و قدرتی عطیہ جرأت و ہمت سے کام لیا اور آگے بڑھا اور یہ بارِ امانت، جس کو پتھر کی ہیئت و شکل میں قدرت نے روبرو کیا تھا۔ حرکت دی اور اپنی کوششوں کے بعد اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔

ابھی اس بار کو اٹھائے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اس کو تکان محسوس ہونے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس امانت کو واپس رکھدے کہ پردۂ غیب سے صدا آئی۔ ہشیار! یہ امانت کا اٹھانا اس کی حفاظت تیری شایانِ شان ہے اور یہ تیری اولاد کے کاندھوں پر تا قیامت رہے گی۔ انسان وہیں رک گیا۔ اور اس کو اٹھائے رکھا۔ اس کے بعد جنت سے نکلنے کا واقعہ پیش آیا۔ [1]

اس واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ   ہم نے روبرو کیا امانت کو آسمانوں، زمین اور

---

[1] تفسیر روح المعانی۔

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ پہاڑوں کے۔ پس انکار کیا سب نے کہ اس کو اٹھائیں
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا اور ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو (یعنی امانت)
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا انسان نے بے شک وہ ناترس و نادان تھا تاکہ عذاب
لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ دے اللہ پاک منافق مردوں، منافقہ عورتوں اور مشرک
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ مردوں، مشرک عورتوں کو، اور رحمت کرے اللہ
اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ایماندار مردوں اور ایمان رکھنے والی عورتوں پر
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (پ ۲۲) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

امانت کے معنی پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر۔ زمین و آسمان میں ذاتی خواہش کچھ نہیں یا ہی بھی تو وہی جس پر وہ قائم ہیں۔ آسمان کی خواہش حرکت کرنا۔ اور زمین کی خواہش ٹھہرنا۔ انسان میں بخلاف ان کے ذاتی خواہش موجود ہے اور حکم اس کے خلاف کا نام ہے تو اس پرائی چیز کا اپنے جی کے خلاف تھامنا بڑا زور چاہتا ہے، خصوصاً جبکہ منکر کو قصور پر پکڑا جائے اور ماننے کا قصور معاف کیا جائے۔ ایسی صورت میں بارِ امانت کا اٹھانا اپنی جان پر ترس نہ کھانا نہیں تو کیا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ بڑا ناترس و نادان ہے۔[1]

امام بغویؒ تفسیر معالم التنزیل میں فرماتے ہیں۔ امانۃ سے مراد اطاعت اور وہ فرائض جن کو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کر دیا۔

حافظ عماد الدین نے تفسیر ابن کثیر میں، حضرت مجاہدؒ، سعید ابن جبیرؓ، ضحاکؒ، حسن بصریؒ وغیرہ کے اقوال نقل فرمائے ہیں اور بتایا ہے کہ امانت سے مراد فرائض و حدود دین ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ تمام اقوال آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں بلکہ سب کا مقصد یہ ہے کہ امانت کا مطلب ذمہ داری و تکلیف ہے اور اوامر و نواہی کا ان کی شرطوں کے لحاظ سے قبول کرنا۔ شرط یہی کہ اگر ان کو قائم رکھا تو ثواب اور اگر انہی کو چھوڑ دیا تو عذاب۔ (تفسیر ابن کثیر)

---

[1] موضح القرآن از حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

انا عرضنا الامانۃ الخ نبہ الغزالی و	یعنی امام غزالیؒ اور صاحب تفسیر بیضاوی نے واضح
البیضاوی علی ان المراد بالامانۃ	کیا ہے کہ امانت سے مراد ذمہ داری کی تکلیف کا گلوبند
تقلد عھدۃ التکلیف بان	یا طوق گلے میں ڈال لینا اس لئے کہ آسمانوں زمین اور
تتعرض لخطر الثواب والعقاب	پہاڑوں نے نافرمانی کی۔ اور نافرمانی کا سبب
بالطاعۃ والمعصیۃ ۵۱	اطاعت میں ثواب اور نافرمانی میں سزا کا ہونا تھا۔

ان تمام اقوال و آرا کے پڑھنے کے بعد امانت کے صحیح معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ امانت احکام شرع یا شریعت کی پابندی کا نام ہے مگر کتاب احسن التقویم کے مصنف صاحب کا خیال ہے کہ

"بارِ امانت سے مراد معرفت ذات وصفاتِ حق ہے اور محبت و درد عشق وافراطِ محبت بذاتِ حق مراد ہے۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی نے جو اس بارِ امانت کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا ہے یہ ان کی تعبیر علماء راسخین متقدمین اور متاخرین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے خلاف ہے۔ اور عقلِ سلیم اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتی۔ ۵۲

کتاب مذکور کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی سے تعصب یا تنقیص کا جذبہ یا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ یا تحقیقی جدوجہد سے دوری یا اکابر سلف کی آرار سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ ذاتی شغف وانہماک طبیعت کے عکس کو اس طرح ظاہر کر دیا ورنہ مصنف صاحب احسن التقویم کی ذات گرامی سے یہ توقع ہرگز ہرگز نہ تھی۔

کتاب احسن التقویم میں آیتہ انا عرضنا الامانۃ الخ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کافی کوشش کی گئی ہے اور مختلف قسم کے سوالات پیدا کئے گئے ہیں اور جوابات بھی دیکر مسئلہ کو حل کیا ہے مگر ہر جگہ عرفان ووجدان وعرفا کے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ تشنہ حل وکشف رہا ہے۔ اس لئے پوری طرح وضاحت کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

---

۵۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب سر التکلیف۔ ۵۲ احسن التقویم ص ۸۳ از حضرت ہدایت علی صاحب نقشبندی مجددی جیپوری

کتاب مذکور میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ معرفت کے حامل تھے اس لئے ان کو مخلوق پر فضیلت ہے جس کے ثبوت میں یہ آیت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی فضیلت پر کسی دوسرے موقع و وقت پر بحث کی جائے گی۔ اس کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے بدور البازغہ اور الخیر الکثیر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ کتاب مذکور میں متعدد سوالات پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) انسان نے ضعیف ہونے کے باوجود اس بارِ امانت کو کیوں اٹھایا؟

(۲) بارِ امانت اٹھانے کے بعد پھر ظالم و جاہل کیوں کہا گیا؟

(۳) احکامِ شریعت یہاں کیونکر مراد لئے جا سکتے ہیں جبکہ شریعت کے قانون سے مستثنیٰ انسان بھی پائے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:-

(۱) ثم تعلم ان الله تعالیٰ قد اودع الانسان بحکمتہ الباھرۃ قوتین. قوۃ ملکیۃ تنشعب من فیض الروح المخصوصۃ وقوۃ بھیمیۃ تنشعب من النفس الحیوانیۃ المشترکۃ فیھا کل حیوان المتشبھۃ بالقوی القائمۃ بالروح الطبیعیۃ واستقلالھا بنفسھا واذعان الروح الانسانیۃ لھا و قبولھا الحکم منھا۔	پھر جان کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ ظاہرہ سے دو قوتیں انسان میں ودیعت کیں، قوتِ ملکیہ جو مخصوص روح کے فیضان سے پھیلتی ہے۔ قوتِ بہیمیہ جو نفسِ حیوانی سے پھیلتی ہے۔ اس نفسِ حیوانی میں ہر حیوان جس کے قویٰ کا قیام بذریعہ روحِ طبعی ہے مشترک ہے۔ یہ قوتِ بہیمیہ اپنے ذاتی اعتبار سے مستقل ہے اس کو روح انسانی (جس سے قوت ملکیہ کا تعلق ہے) کا یقین ہے اور ساتھ ساتھ اس کے حکم کو قبول کرتی ہے۔
(۲) ثم تعلم ان بین القوتین تزاحما وتجاذبا فھذہ تجذب الی العلو وتلک الی السفل	اس کے بعد جان کہ دونوں قوتوں کے آپس میں روک تھام ہے اور کشش بھی پس یہ (قوت ملکیہ) کھینچتی ہے بلندی (اعمالِ صالحہ و قربِ الٰہی) کی طرف بمقابلہ

فاذا برزت البهيمية وغلبت — دوسری (قوتِ بہیمیہ) کے یہ برائیوں اور قبائح کی طرف
آثارها كمنت الملكية وكذا — جب قوتِ بہیمیہ کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے آثار کا
العكس۔ — غلبہ تو قوتِ ملکیتہ ماند پڑ جاتی ہو۔ ایسے ہی برعکس۔

انسان کی اس فطری قابلیت واطاعتِ الٰہی کی استعداد اور معائب ونتائج کی جانب رغبت، اور ان سے بچنے کی قوت ولیاقت کے سمجھ لینے کے بعد یہ بھی سمجھنا مناسب ہوگا کہ ان فطری عقول کی ودیعت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ جن کی بدولت انسان ہر قسم کی جدوجہد کرتا ہے دینی ودنیاوی امور میں ان سے کام لیتا ہے۔

عقلِ معاد۔ اس کی رہبری میں انسان اعمالِ صالحہ، قرب ورضائے الٰہی، تزکیہ نفس، اخلاقِ شریفہ سے متصف ہونے کو اپنے لئے باعثِ عزت وفخر سمجھتا ہے جس کا تعلق قوتِ ملکیہ سے ماننا بدیہی ہے یہیں پر نفسانی خواہشات وجنسی مرغوبات کا مزاحم بننا اور مقابلہ میں آنا انسانی اعمال میں کھلم کھلا نظر آتا ہے

عقلِ معاش۔ انسانی جہد وکوشش کا وہ منظر جو حصولِ دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ اسی فطری ودیعت کا بین ثبوت ہے اور انسانی ضمیر کا انتباہ اور غلط راستہ، گمراہ طریقہ سے روک تھام قوتِ ملکیہ کی مزاحمت کا نتیجہ تقریباً ہر سمجھدار محسوس کر لیتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ انہی قویٰ کی موجودگی نے افعالِ انسانی کو خود انسان کے اختیاری کہنے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

للعباد افعال اختيارية يثابون — بندوں کے افعال اختیاری ہیں جن کا ثواب دیا جاتا
بها وليا قبون عليها۔ [۱] — ہے اور ان پر گرفت کی جاتی، سزا دی جاتی ہے۔

ہاں ایک یہ مرحلہ بھی پیشِ نظر رکھ لیجئے کہ ارواح نے قبل اس کے وہ جسدِ عنصری میں آئیں۔ اپنے رب کے سامنے اقرار کیا تھا کہ ہاں تو ہمارا رب ہے اور یہ الستُ بربکم کا جواب بلیٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ارواح کو ازلی طور پر اپنے رب کا علم ومعرفت حاصل تھی اور یہ چیز ان کی خلقت میں

---

[۱] تکمیل الایمان فارسی۔

شامل کردی گئی تھی کہ وہ اپنے خالق ورب تعالیٰ کو پہچانیں۔

اب نورِ عظیم کلام ربِ حکیم کی اس آیت کے ہر ہر لفظ پر غور کیجئے۔

اِنَّا عَرَضْنَا۔ ہم نے پیش کیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے۔ فطرت سے علیحدہ۔ ودیعت نہیں کی جارہی۔ قول وقرار نہیں۔

الْاَمَانَۃَ۔ حفاظت کے قابل ہے۔ خیانت میں نقصان ظاہر۔ جسم وروح انسانی سے بالکل علیحدہ کوئی چیز، ہر کیف بوجھ ہو سکتا ہے۔ یا ذمہ داری جیسے امین ذمہ دار کو بھی کہتے ہیں حفاظت خیانت کا ذمہ دار۔

عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ۔ سب موجودات پر، معلوم ہوا کہ تمام نظام موجودات پر فیضِ باری ہو رہا ہے یہی عدل وانصاف کا اقتضا ہے اور رحمتِ عامہ کا ثبوت تاکہ کل کسی کو شکایت وحکایت کا موقع نہ ملے اور وہ انسان جو اکثر شی جدلا اکثر باتوں میں جھگڑالو ہے، یہ نہ کہے کہ میں ہی رہ گیا تھا تمام ذمہ داریوں کے لئے۔

فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔ بس انکار کیا انھوں نے کہ اٹھائیں اس کو باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ یہ ہماری استعداد وقابلیت کے لایق نہیں اور یہ عرض انکار ہی کہلا سکتی ہے اللہ علیم یہ جانتا تھا کہ ان میں استعداد وصلاحیت نہیں۔ اس لئے باز پرس نہ ہوئی۔ یہاں امانت کو پیش کیا جارہا ہے۔ اور جو چیز بطور امانت پیش کی جاتی ہے۔ امین اس کی قبولیت میں عجز وانکسار ظاہر کر سکتا ہے۔ جبر وتعدی نہیں جو یہ کہا جائے کہ حکم سے انکار کی قدرت کس میں ہے کہ باری تعالیٰ عزاسمہ کے حکم کے سامنے چون وچرا کرے۔ یہاں محض حکم نہیں بلکہ حفاظت وخیانت کا امتحان مقصود ہے۔

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ برداشت کرلیا اٹھالیا۔ ذمہ لے لیا انسان نے۔ انسان اس وقت بالکل اعتدالی حالت میں تھا۔ اور اس کو معلوم تھا کہ دیگر موجودات سے انکار سرزد ہو گیا ہے۔ ان میں استعداد قابلیت نہیں۔ اس نے رب تعالیٰ کی پیش کردہ امانت کو پہلے دیکھا۔ اس کے بعد اپنی ذاتی قابلیت وصلاحیت پر نظر ڈالی۔ سوچ سمجھ کر آگے بڑھا۔ ہمت وجرأت سے کام لیا۔ اس کی دانش وفہم نے

رب تعالیٰ کی عظمت و عزت کا لحاظ کیا۔ یہ دیگر موجودات کے مقابل قابلیت کے باوجود کیونکر پیچھے ہٹتا۔ اس نے خود بڑھ کر اوامر و نواہی کے مجموعہ تھر نامبہم شکل کو اٹھا لیا۔ یہاں ہمت سے مری وہی ہمت مراد ہے جو اہلِ تصوف کی اصطلاح ہے یعنی حواس خمسہ ظاہرہ و باطنہ سب ہی کو لطف و احسانِ خداوندی کا منتظر بنایا۔

اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا۔ ظالم اس کو کہتے ہیں کہ جس کی شان عدل و انصاف کرنا ہو جاہل جس کی شان عالم ہونا ہو۔ انسان ضعیف البنیان نے بڑی ذمہ داری مول لے لی ہے۔ یہ ابھی نسل و تخلیقی دور سے آگاہ و واقف نہ تھا۔ اس کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ مجھ سے غلطی لازمی و ضروری ہے۔ اس کو یہ احساس نہ ہوا۔ کہ قوت بہیمیہ کا تقاضا روح حیوانی کا منشار و رجحانات کیونکر روک سکوں گا۔ عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ ان تمام باتوں کا خیال رکھتا۔ اس کو ابھی دنیاوی کدورتوں، معاملات کی نزاکت و باریکیوں، گمراہی و غلط روی سے واسطہ بھی نہ پڑا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس امانت احکاماتِ الٰہی کی حفاظت کر لوں گا۔ ایسی صورت میں یہ ناترس و نادان کہلانے کا مستحق نہیں تو کیا ہے۔

لِیُعَذِّبَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ الخ۔ تاکہ عذاب دے اللہ منافق مردوں اور منافقہ عورتوں کو۔ یہ برداشت و امانت کا اٹھانا اس شرط کے ساتھ تھا کہ اس کی حفاظت میں ثواب اور نافرمانی و عصیان میں سزا ہے اور رحمت دالدے گا اللہ اپنے بندوں پر الخ

اب اس صلاحیت و استعدادِ انسانی کے سمجھنے کے بعد قوی مودعہ سے واقف ہونے کے بعد اس امانت کے برداشت اور دیگر موجودات کا انکار اس سبب و وجہ سے تسلیم کرنا کہ انسان پہاڑ و زمین کی فرع ہے یا جزء ہے بالکل لایعنی سا معلوم ہوتا ہے، یا انسان کو اصل قرار دینا اور دیگر موجودات کو فرع یا جزء بے محل سی دلیل معلوم ہوتی ہے جیسے کہ کتاب مذکور میں لکھا گیا ہے۔ سلہ

البتہ یہ اظہار رائے کسی قدر موزوں معلوم ہوتا ہے کہ بروقت تفویضِ امانت انسان کی اصل جسمانی پیشِ نظر انسان تھی۔ علمِ حق میں جو کچھ تعلق ہوا نوا بذات و صفاتِ حق، بشر کی ذات و صفات سے متعلق تھا

سلہ۔ احسن التقویم ص ۱۸۰۔

وہ علم بشر میں نہ تھا۔ بلکہ صرف علم بشر میں صفت بشری تھی جو بارِ امانت کے حمل (اٹھانے) کے لئے بالکل بے بضاعت اور ناکارہ تھی۔ ایسی بے بضاعتی و کمزوری کی حالت میں اس بار امانت کے اٹھانے کا اقرار کرنا سراسر جہالت اور اپنی جان پر ظلم کرنا نہیں تو اور کیا ہے اسی بنا پر رب العالمین نے اس کو ظلوماً جہولاً فرمایا۔" اس عبارت میں صفتِ بشری کو "ناکارہ تھی" کہنا احسان کے احسن تقویم ہونے کے منافی۔ اور کلام الٰہی کی تردید ہے۔

ہم پہلے بھی مفسرین کی رائے کا اظہار کر آئے ہیں کہ امانت سے مراد تکالیفِ شرعیہ فرائض دینیہ اور حدود شریعت ہیں۔ اور یہ تمام احکام شریعت ہی ہیں۔ اب آخر میں ایک روایت حضرت علیؓ سے کہتے ہیں۔ "کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا چہرہ مبارک زرد پڑ جاتا اور رنگ بدل جاتا تھا۔ تو اس کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا۔ وقت امانت کا آگیا ہے۔ اللہ رب العزت نے امانت کو پیش کیا تھا اور آیۂ مذکور کو تلاوت فرمایا۔ فرمایا۔ میں نے اٹھایا اس امانت کو باوجود اپنی ذاتی کمزوری کے میں نہیں جانتا کس طرح ادا کروں گا۔ (روح المعانی)

اب اس کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہاں امانت یا بارِ امانت سے معرفت ذات و صفاتِ حق نہیں اور نہ محبت یا افراطِ محبت، یا دردِ عشق مراد ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ معرفتِ رب حق تعالیٰ بالکل ذاتی و وجدانی چیز ہے۔ ذوق و وجدان فطری تقاضہ کے مطابق ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا محبت و عشق وغیرہ غیر ارادی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی جدوجہد و کوشش و سعی سے کام نہیں چلتا۔ یہ ایک وہبی چیز ہے۔ قدرت نے ہر انسانی روح میں یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ ذاتی طور پر اپنے رب کو پہچانے اور حق سبحانہ کا نہ پہچاننا گناہوں کے ان پردوں کی وجہ سے تھا۔ جو ملکی و روحانی شعاعوں کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جہاں نفسِ انسانی کسی تکلیف و بلا میں مبتلا ہوا انسان کو اپنے عجز و ناچاری کا جہاں احساس ہوا تو فوراً باری تعالیٰ کو پکارتا ہے یا کم از کم ایسی قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے جو ظاہری قوتوں سے بالاتر اور بڑی عظمت و کبریائی کی مالک ہو۔

امانت کا برداشت کرنا، یا ذمہ داری لینا۔ نقل و حرکت چاہتا ہے۔ اس کی حفاظت جدوجہد و کوشش

کی طلبگار ہے جس کا ثبوت تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ امانت . فرائض و اطاعتِ الٰہی و دین کا نام ہے ۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب البدور البازغہ کے مقالہ ثانی میں فرماتے ہیں ۔

"یہ پُر از یقین دلائل سے ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ذات ہے جس کی طرف تمام ممکنات کو منسوب کیا جاتا ہے اور سمجھداری کے لحاظ سے یہ نفس کا کمال ہے کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کو اس کی وحدت و صفاتِ کمالیہ کے لحاظ سے پہچانے ہر وہ تغیر و تبدل جو صورت کا دوسری صورت میں ہوتا ہے تو اس کا فاعلِ حقیقی یعنی تبدیل کرنے والا وہ رحمٰن ہے جو صورت و شکل سے برتر ہے تو ہمارے لئے یہاں یہی مناسب ہے کہ بات کو اسی طریقہ سے مانیں جس طرح یا طریقہ سے اللہ رحمٰن نے انسانی ودیعت کا لحاظ طبیعتِ انسانی میں کیا کہ انہی طبائع میں ودیعت کردہ شے کی بدولت وہ ہدایت پاتا ہے اور اس کی ذات کے پہچان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔" ۱؎

اس کے بعد اس کی وضاحت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

اما الرجل الحنیف فقال لئن	مگر وہ آدمی جو خالصًا متوجہ الی اللہ ہے وہ کہے ۔
لم یھدنی ربی لاکونن من القوم	اگر مجھ کو اللہ نے ہدایت نہ دی تو میں گمراہ ہونیوالی
الضالین فتجرد الی فطرتہ	قوم میں سے ہو جاؤں گا تو یہ شخص اپنی فطرت کی
ان ربہ اودع فی فطرتہ	طرف متوجہ ہوا کہ اس کے رب تعالیٰ نے اس کی فطرت
علمًا حقا و معرفۃ حقۃ	میں علم حق و معرفت حق کو ودیعت کر دیا ہے
علی ما یناسب فطرتہ ۲؎	اس کی مناسبت کے لحاظ سے ۔

جو چیز فطری طور پر انسان میں پائی جاتی ہے وہ امانت نہیں کہلائی جا سکتی اور نہ خالق حقیقی ودیعت کرتے وقت کسی سے کہہ سکتا ہے کہ تو اس کو برداشت کر لے اور نہ فطرت کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نہ ثواب و عذاب کا تعلق معرفت و عدم معرفت سے قائم ہو سکتا ہے کیونکہ

۱؎ و ۲؎ البدور البازغہ فصل فی بیان معرفۃ اللہ تعالیٰ المودعۃ فی طبیعۃ الانسان ۔

ثواب وعذاب تعمیل احکام واطاعت یا نافرمانی کے سبب سے ہے۔ جس کی تائید نفاق وشرک کرنے والوں یا کرنیوالیوں کے لحاظ سے ہوتی ہے اور نفاق وشرک بغیر عمل کس طرح معلوم ہوسکتا ہے۔

حضرت علیؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت وطریقہ دین کے متعلق دریافت فرمایا تو آپ نے فرمایا "المعرفت راس مالی" (شفا قاضی عیاض) آپ نے یہاں معرفت کو پونجی فرمایا۔ اپنے ذاتی مال کی پونجی وہ ہی کہلا سکتی ہے جس کو انسان ضرورت ذاتی کے وقت خرچ کرے۔ مفروضہ اعمال کا ہونا احکام الٰہی کی انجام دہی کے وقت یہ جان کر کرنا کہ اپنے رب کا حکم بجا لا رہا ہوں خلوص کی بین دلیل ہے اور یہی اطاعت کرنے میں راس المال کا خرچ کہلا سکتا ہے۔ گویا ذمہ داری وامانت کی ادائیگی میں شریعت کا لحاظ رکھنا معرفت ہے۔ اور اعمال بذات خود امانت الٰہیہ کی ادائیگی کا نام۔ اعمال کرتے وقت رب تعالیٰ کی جانب نظر مشاہدہ رکھنا معرفت ذات حق سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بالکل وہبی ہے اور فضل باری پر موقوف۔ یہ فضل رب انبیاء وصلحا واولیا کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کا مکلف نہیں ٹھیرایا جا سکتا تو معرفت ذات حق کو امانت سے تعبیر کرنا مناسب نہیں اور نہ رازِ اسرار معرفت و دردِ محبت کہنا لائق ومناسب۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عنبر بیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانہ میں اپنے علمی محبِ خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کیے گئے، اس مجموعے کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمع فضل وکمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے۔ ان حضرات کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گردپوش چار روپے۔

مکتبہ برہان دہلی۔ قرول باغ

ادبیات

فتنۂ یہود

از جناب مولانا سیماب صاحب اکبر آبادی

جو ہیں مردودِ رب، مردود ہیں وہ دونوں عالم میں
اماں لیں چادرِ موسیٰ میں، یا دامانِ مریم میں

ابھی شاہد ہے نم آلودگی "دیوارِ گریہ" کی
یہودی آج تک مصروف ہیں صدیوں سے ماتم میں

یہی اک قوم ہے سرگشتہ و برباد و آوارہ
ٹھکانا ہی نہیں اس کا کہیں اقصائے عالم میں

خدا سے منحرف، نبیوں کی قاتل، گمرہ و سرکش
یہی اک ناخلف اولاد ہے، اولادِ آدم میں

یہ آخر سایۂ اسلام میں کیوں آ نہیں جاتے؟
یہ آخر کیوں پڑے ہیں مدتوں سے فکرِ مبہم میں

نہ مشرق غمگسار ان کا نہ مغرب دوستدار ان کا
کلیسا میں جگہ ان کی نہ بیت اللہِ اعظم میں

جلالِ حق کو جھوٹے آنسوؤں پر رحم کیوں آئے؟
ازل سے اختلافِ خاص ہے خورشید و شبنم میں

عرب کیوں ساتھ دیں اس قوم کا جو اُن کی دشمن ہے
انھیں ایسی پڑی ہی کیا کہ ڈالیں جان جوکھم میں

زبانوں پر ابھی یہ فیصلہ جاری ہے قرآں کا
"یہودی دوست ہو سکتا نہیں ہرگز مسلماں کا"

تبصرے

مسلمانوں کا روشن مستقبل تقطیع متوسط ضخامت ۲۰ ۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ ؎ مجلد

پتہ:۔ مولانا محمد سمیع اللہ قاسمی۔ کتب خانہ عزیزیہ جامع مسجد دہلی۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم کی مشہور کتاب کا پانچواں اڈیشن ہے جو پہلے سے زیادہ اہتمام وانتظام اور مزید اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس کتاب کی عام مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ چند سالوں میں ہی اس کے پانچ اڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس میں فاضل مصنف نے اپنی قوم سے احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے اس خیال کی پرزور تردید کر کے کہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مسلمان کمزور ہوگئے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ رہے تھے۔ نہایت مستند اور معتبر تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ زوالِ حکومت کے بعد بھی انیسویں صدی کے شروع میں ایسے رہنما پیدا ہوئے جنھوں نے اصلاح تعلیم وتربیت اور تجدید دین کے ساتھ قوم کی تنظیم کی۔

۱۸۷۰ء تک مسلمانوں کی یہ کوششیں جاری رہیں۔ اس کے بعد تعلیم جدید کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں مسلمانوں کی جو ذہنی کیفیت اور ایک عام قومی رجحان رہا ہے اور اس کا مسلمانوں کے اصل عزم وارادہ اور ولولۂ کار پر کیا اثر پڑا۔ مرحوم نے ان سب کا اور ان کے اسباب وعوامل کا بڑی دیدہ وری سے جائزہ لیا ہے۔ کتاب دس ابواب پر تقسیم ہے جن میں ہر قوم کے دس بنیادی حقوق کو بتانے کے بعد تاریخ کے ہر دور کی جانچ انھیں حقوق کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہر زمانہ کی تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی حالت واضح ہوجائیگی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کتاب موضوعِ بحث کے اعتبار سے نہایت مدلل جامع اور ٹھوس ہے

اور اس قابل ہے کہ مسلمان اس کا بغور مطالعہ کرکے نقوش ماضی کے پیشِ نظر مستقبل کے لئے کوئی راہِ عمل متعین کریں۔ کتاب نغمۂ خواب آور نہیں۔ بلکہ ایک جرسِ کارواں ہے جو اُن میں عزم و ہمت احساسِ خودی اور خود اعتمادی کے پیدا ہونے کا سبب ہوگی۔

حقیقتِ عبودیت ترجمہ کتاب امام ابن تیمیہؒ از جناب مولوی صدر الدین اصلاحی — تقطیع خورد ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر کاغذ عمدہ قیمت ۸ع پتہ:۔ دار الاشاعت نشاۃِ ثانیہ حیدر آباد دکن۔

فلسفہ اور تصوف کی غلط آمیزش سے مسلمانوں میں عقیدہ و عمل کی جو گمراہیاں آج نظر آتی ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں بھی تھیں اور آپ نے انھیں سے متاثر ہو کر ایک سائل کے جواب میں ایک رسالہ "العبودیۃ" کے نام سے لکھا تھا۔ لائق مترجم نے اس کو اردو کا جامہ پہنا کر قسطوار ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع کیا تھا۔ اب یہی ترجمہ کتابی شکل میں شائع کردیا گیا ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا نام نامی کافی ضمانت ہے۔ چنانچہ علامہ نے اس میں عبودیت کی حقیقت۔ اس کے لوازم وآداب اور اس کے اصل مقتضیات ومطالبات پر نہایت مدلل بحث کی ہے اور جیسے کہ ان کی عادت ہے اس ضمن میں بعض اور اہم بحثیں مثلاً جبر وقدر جہاد، حبِ رسول، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وغیرہ بھی آگئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک علامہ ابن تیمیہؒ کے ساتھ اس کتاب کے انتساب کا تعلق ہے۔ یہ ہر طرح قابلِ قدر ہے لیکن علامہ مرحوم کا اسلامی تصوف کی نسبت جو نقطۂ نظر ہے۔ اربابِ علم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ اس بنا پر اس کتاب کے ہر جزو سے کلی اتفاق کرنا ہر ایک کے لئے مشکل ہے۔ پھر علامہ کے طرزِ بیان میں بعض بعض جگہ جو درشتی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے اس سے یہ رسالہ بھی خالی نہیں ہے۔

حکومتِ الٰہیہ اور علماء مفکرین مرتبہ جناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔ تقطیع متوسط ضخامت ۴۰۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ پتہ:۔ مکتبہ نشاۃِ ثانیہ چنچل گوڑہ حیدر آباد دکن

دنیا میں کسی قوم کا زوال اتنا حیرت انگیز نہیں ہو سکتا جتنا کہ مسلمانوں کا ہے کیونکہ یہ

خلافتِ الٰہی کے امین ہیں۔ دنیا کے لئے آخری اور قطعی دستورِ عمل ان کے پاس ہے اور پھر خدا کی طرف سے ان کے لئے تمکن علی الارض اور استخلاف کا وعدہ بھی ہے۔ حسناتِ دینی و دنیوی کا مژدہ بھی انہیں کے لئے مخصوص ہے۔ ان سب کے باوجود ان کا زوال پذیر ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اگرچہ مسلمان قول و اقرار کے اعتبار سے مسلمان ہیں لیکن ان کا عمل مسلمانوں کا سا نہیں رہا ہے۔ پھر ان کا جو قول و اقرار ہے وہ بھی اپنی اصل روح اور اسپرٹ سے یکسر خالی ہے۔ یہ ایک راز ہے جس کو عالمِ اسلام کے مفکر علما نے محسوس کرکے اس پر مفصل مضامین اور مقالات لکھے اور انھوں نے مسلمانوں کو پھر از سرِ نو "اعتصام بحبل اللہ" کی دعوت دی۔ چنانچہ ہندوستان کے علما نے بھی اس سلسلہ میں نہایت بصیرت افروز اور حقیقت نما مقالات لکھے اور انھیں کا یہ اثر ہے کہ آج یہاں کے مسلمانوں میں رجوع الی الاسلام کا جذبہ بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے اس منصب کو ادا کرنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں جو بحیثیت مسلمان اُن کا اپنا حق ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں لائق مرتب نے اسی موضوع سے متعلق تقریباً ۲۴ مضامین جمع کر دیئے ہیں جو سب کے سب ہندوستان کے نامور علما اور سیاسی و دینی مفکرین کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو ایک ساتھ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ حکومتِ الٰہیہ کا منشا اور مطلب کیا ہے؟ یہ کیونکر قائم ہو سکتی ہے؟ اور اس کو قائم کرنے والوں کے اوصاف اور خصائص کیا ہونے چاہئیں؟ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں دیانت داری کے ساتھ اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ لیکن مرتب چونکہ ایک خاص جماعت کے رکن ہیں اس لئے انھوں نے مختلف مقالہ نگاروں سے متعلق جو تعارفی نوٹ لکھے ہیں ان میں جماعتی عصبیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ غیر مستحسن ہے۔ جب آپ کسی ایک مفکر کا مقالہ اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ وہ آپ کے مقصد سے ہم آہنگ ہے تو پھر اپنے جماعتی نقطۂ نظر سے مقالہ نگار کی سیاسی روش پر اعتراض کرنا گویا اس کا منہ چڑانا ہے۔ بہرحال مجموعی اعتبار سے ان مضامین کا مطالعہ مفید اور دینی بصیرت و موعظت کا سبب ہوگا۔

(۱) حبیبِ خدا۔ صفحات ۱۷۴۔
(۲) ستارے۔ صفحات ۱۲۸۔
(۳) جاں بازیاں۔ صفحات ۸۰
(۴) شہیدِ کربلا۔ صفحات ۶۳

از مجیبی صاحب۔ کتابت وطباعت بہتر قیمتیں حسب ترتیب یہ ہیں:- (۱) ۸عہ/ (۲) عہ/ (۳) ۸/ (۴) ۶/:- بچوں کا بکڈپو کلاں محل دہلی۔

مجیبی صاحب کو قدرت کی طرف سے بچوں اور بچیوں کے لئے زبان وبیان اور مواد کے انتخاب کے اعتبار سے کتابیں لکھنے کا ایک خاص سلیقہ عطا ہوا ہے اور وہ اس میدان میں بڑے کامیاب ہیں۔ یہ چاروں کتابیں بھی موصوف کے قلم کی رہین منت ہیں۔ پہلی کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک عورتوں اور بچوں کی عام استعدادِ ذہنی کے مطابق بیان کی گئی ہے۔ دوسری کتاب میں چالیس حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے چیدہ چیدہ اور منتخب حالات ہیں۔ تیسری کتاب میں چند ایسے جاں بازوں کی سچی اور تاریخی کہانیاں ہیں جنھوں نے اپنے مذہب، ملک اور قوم کے لئے غیر معمولی جاں فروشی کا مظاہرہ کیا ہے اب رہی چوتھی کتاب! اس میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ کے حالات اور شہادت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ چاروں کتابیں زبان وبیان اور اخلاقی درس وموعظت دونوں کے اعتبار سے بچوں اور بچیوں کے لئے خصوصاً اور متوسط درجہ کی استعداد کے عام لوگوں کے لئے عموماً نہایت مفید اور بصیرت افروز ثابت ہوں گی۔

برہان

جلد ہفدہم　　　　شمارہ (۴)

اکتوبر ۱۹۴۶ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۱۹۴
۲۔ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۱۹۷
۳۔ حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب دہلوی مکتوبات کے آئینہ میں	جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے	۲۱۷
۴۔ اقبال اور نظریہ سعی و عمل	جناب مولوی شیخ وحید احمد صاحب رئیس شیخوپورہ	۲۴۹
۵۔ ادبیات:۔		
فکرِ روشن۔	جناب روشن صاحب صدیقی	۲۵۴
عصرِ حاضر	جناب ناصر صاحب مالیگانوی	۲۵۵
۶۔ تبصرہ	م۔ ح	۲۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کسی قوم کے مخصوص کلچر اور تہذیب کے لئے سب سے بڑا نازک وقت وہ ہوتا ہے جب یہ قوم اپنے جغرافیائی حدود سے باہر نکل کر کسی دوسری قوم کے ساتھ خلا ملا پیدا کرتی ہے اور اس کا کلچر دوسری قوم کے کلچر کے ساتھ متصادم ہوتا ہے۔ اس تصادم کا ابتدائی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کلچر تاثیر و تاثر کے فطری قانون کے ماتحت ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور دونوں کا اپنا اصلی رنگ و روغن پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ اور آخر کار جس قوم کو سیاسی برتری حاصل ہوتی ہو اور وہ کسی بلند اور اعلیٰ نصب العین کی حامل ہونے کے ساتھ اس کے مطابق عمل کرنے میں بھی تشدد ہوتی ہے۔ اس کا کلچر دوسرے کلچر پر غالب آتا ہے اور وہ جسم کے ساتھ ساتھ دوسری قوم کے دل و دماغ کو بھی مسخر کر لیتی ہے اس بنا پر ہر وہ قوم جو اپنے کلچر کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کلچر کی حقیقی قدر و قیمت کو پہچانے۔ زندگی سے متعلق اس کا جو نصب العین ہے اس کی سچائی کا اذعانِ کامل اور یقین واثق رکھے اور پھر اس کے تمام اعمال و افعال بھی ایسے ہونے ضروری ہیں جو اس کے اس ایمانِ محکم۔ اعتقاد جازم۔ اور یقینِ واثق کے آئینہ دار ہوں۔ اگر بد قسمتی سے یہ قوم ان صفات کی حامل نہیں ہے تو اس کا کلچر خواہ اپنی اصلی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے کتنا ہی اعلیٰ اور بلند ہو جب وہ کسی دوسری قوم کے کلچر سے آشنا ہو گی تو عجب نہیں کہ اپنے "دل کے حرم" کو "گرو عجم" اور اپنے دین کو "خریدۂ کافری" کر بیٹھے۔

یہی وہ نکتہ تھا جس کے پیش نظر فطرت اسلام کے اصلی محرم و امین راز خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے ایران کی فتح کے بعد جب مسلمانوں کو اس مفتوح ملک کی آب و ہوا سے اثر پذیر پایا تو فرمایا کہ اے کاش ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کی ایک دیوار حائل ہوتی اور ہم اسے فتح کرنے نہ جاتے" اور غالباً یہی مصلحت تھی جس کے باعث۔ اگرچہ اسلام میں اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے حضرت عمرؓ اس کی حوصلہ افزائی نہ فرماتے

تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے وہ عرب کے جغرافیائی حدود کے اندر ہی محصور نہیں رہ سکتا تھا اسے لامحالہ تمام دنیا میں پھیلنا اور اقوامِ "عجم" کے مختلف کلچروں اور تہذیبوں سے متصادم ہونا تھا۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ کا منشا ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ عرب اپنے ملک میں ہی بند رہیں اور باہر کی کسی قوم کے ساتھ ارتباط پیدا نہ کریں۔ بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ جب مسلمان عقائد و اعمال اور سیرت کے اعتبار سے اتنے پختہ اور مضبوط ہوجائیں کہ وہ دوسری قوموں میں جذب ہونے کے بجائے ان کو خود اپنے اندر جذب کرسکیں تب مسلمانوں کو باہر نکلنا چاہئے ورنہ سیرت اور کیرکٹر کی پختگی کے بغیر اگر انھوں نے دوسری قوموں سے خلا ملا پیدا کیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں دوسروں میں گھل مل کر اپنی انفرادیت سے ہی محروم نہ ہوجائیں۔

بنوامیہ میں لاکھ برائیاں سہی! لیکن یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ جب تک وہ برسرِ اقتدار رہے اسلام کا اپنا اصل حجازی اور عربی آب ورنگ پھیکا نہیں ہوا۔ عباسی دور میں عربوں اور عجمیوں کے شدید اختلاط نے اسلامی کلچر کی انفرادیت کو متاثر کرنا شروع کیا اور پھر رفتہ رفتہ عقائد و اعمال میں جو کثرت بدعت اور انقلاب و تغیر ہوا کوئی شبہ نہیں کہ اس نے اسلامی افکار کی وحدت کا شیرازہ یکقلم منتشر کردیا۔ اور آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اخلاقی اور روحانی زوال کے ساتھ ساتھ سیاسی سطوت و اقتدار سے بھی محروم ہوگئے۔ قومی تعمیر و تربیت کا یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے قوم کا کوئی مبصر اور روشن دماغ معمار کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔

پچھلے دنوں روس سے متعلق بعض انگریزی اخبارات میں جو مقالات شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فتح ایران کے وقت عربوں سے متعلق جو نقطۂ نظر حضرت عمرؓ کا تھا آج کل اسٹالن بھی اپنی قوم کی تربیت اسی ڈھنگ پر کررہا ہے۔ تعمیر بعد از جنگ کے لئے اسٹالن نے پانچ سال کا پروگرام بنایا ہے اور اس مدت میں وہ نہیں چاہتا کہ اس کی قوم اقوامِ غیر اور خصوصاً یورپ کی تہذیب و تمدن سے کوئی علاقہ پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک میں غیر ملکی سنیماؤں اور تھیٹروں کو ممنوع قرار دیدیا ہے۔ اور ان تمام کتابوں کی اشاعت بند کردی جو "آرٹ برائے آرٹ" کے نظریہ کی آئینہ دار ہوں۔

اسلام میں بعض ایسی چیزیں ممنوع ہیں جن میں بہ ظاہر فوری طور پر کوئی قباحت نظر نہیں آتی — تصویر کشی، تشبہ بالغیر اور بے پردگی وغیرہ اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ فقہاءِ اسلام کی ان چیزوں کے بارے میں

ایک خاص اصطلاح "سدّ الباب الذرائع" کی ہے یعنی یہ چیزیں اگرچہ بالفعل کوئی قباحت نہیں رکھتیں لیکن چونکہ ان کا تواتر عمل اور ان پر اصرار بعض خطرناک نتائج کا موجب اور سبب ہو سکتا ہے اس بنا پر ان کے متوقع نتائج سے محفوظ رکھنے کے لئے ان چیزوں کو شروع میں ہی ناجائز قرار دیدیا گیا ہے ہمارے بعض وہ "روشن خیال" تعلیم یافتہ احباب اور "شہری آزادی" کے سب سے زیادہ سرگرم حامی دوست جو اسلام کو اس قسم کے مسائل پر تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا طعنہ مارتے ہیں۔ امید ہے کہ سوویٹ روس کے فرمانروائے مطلق کی اس پالیسی سے عبرت حاصل کریں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ اسلام میں جو چیزیں سدّ الباب الذرائع ممنوع کی گئی ہیں ان میں قومی تعمیر و تربیت کا کیسا اہم نفسیاتی نکتہ مضمر ہے۔

خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مولانا عبید اللہ سندھی کو اکثر فرماتے تھے کہ اسٹالن جس نہج پر اپنی قوم کی تعمیر کر رہا ہے وہ بالکل وہی نہج ہے جس پر اسلام کے ابتدائی دور میں عربوں کی تعمیر و تربیت کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط۔ طاقتور۔ اور منظم قوم ہے اور اس کا پروگرام دنیا میں سرعت سے پھیل رہا ہے۔ مولانا کے اس مقولہ کا مطلب کوتاہ بینوں نے یہ سمجھا کہ مولانا اسلام اور سوشلزم دونوں کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مقصد صرف یہ تھا کہ اگرچہ اسلام اور سوشلزم دینی اور لادینی نظام ہونے کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن چونکہ اس لادینی نظام کو انھیں اصول پر عملی شکل دی جارہی ہے اور انھیں طریقوں پر اسے دنیا میں رائج کیا جارہا ہے جو اسلام ایسے دینی نظام کے اپنے تھے۔ اس بنا پر اس کو بھی سیاسی اور اخلاقی فتوحات کے اعتبار سے وہی فروغ حاصل ہو رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلام کو ہوا تھا۔

ان حالات میں ہمارے زعمائے قوم کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کی تعمیر کس طرح کر رہے ہیں؟ اور کیا اُن کے طریقۂ تعمیر کا بھی نتیجہ یہی ہوگا کہ عقائد و اعمال اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے مسلمانوں کو جس حقیقی عظمت و بزرگی کا اور قومی انفرادیت کا مالک ہونا چاہیئے وہ اسے واقعی مستقبل قریب میں حاصل کر لیں گے؟۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۲)

ھُدًی قرآن عزیز نے "الکتاب" کے علاوہ اپنی دوسری صفت "ھُدًی" ہدایت - ہادی" بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ میرا یہی کمال نہیں ہے کہ میں "الکتاب" ہوں بلکہ میرا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ میں کتابِ ہدایت ہوں اور ہدایت ورہنمائی میں میری قیادت و امامت کا یہ حال ہے کہ قرآن اور ہدایت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہو کر رہ گئے ہیں اس لئے میری ہدایت کی حقیقت نمائی کی تعبیر ناقص ہوتی اگر یہ کہا جاتا کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں ہدایت کا پیغام ہے کیونکہ ایک عادل حکمراں عدل وانصاف کا پیکر ہو کر "سلطانٌ عدلٌ" کہلا سکتا ہے اور اگر ایک صادق القول ہستی صدق وصفا کی تصویر ہو کر "رجلٌ صدقٌ" کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے تو بلاشبہ اس اظہار میں کوئی مبالغہ اور شائبۂ افراط وتفریط نہیں ہے کہ میں کتابِ ہادی ہی نہیں بلکہ "کتابِ ہُدًی" ہوں۔

پس جب تم دنیائے مذہب وملت کا تذکرہ کرتے ہوئے "ہدایت" کی تاریخ اور اس کے پسِ منظر کو سامنے لاؤ گے تو ہدایتِ کامل اور معراجِ ہدایت کی آخری منزل کا دوسرا نام قرآن کے علاوہ اور کچھ نہ پاؤ گے۔ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" "قُلْ ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَاءٌ"

ہدایت کے لغوی معنی نرمی اور لطف کے ساتھ کسی کو راہ دکھانے کے آتے ہیں۔ گویا ہدایت کے مفہوم میں "راہ نمائی" کے ساتھ رفق ونرمی شرطِ لازم ہے۔ اس لئے کہ جس طرح تنہا رفق ونرمی بذاتِ خود کوئی کمال نہیں ہے اور اپنے مواقع اور محل کی اقدار کے مطابق مذموم اور محمود کہلانے کا

استحقاق رکھتی ہے اسی طرح جو "ہدایت" درشتی اور غفلت پر مبنی ہو وہ ناقص اور غیر مفید ہے اور گمراہ کی سعادت کا باعث نہیں بن سکتی چنانچہ اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق محمود کا اعلان کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ (آل عمران)

"پس خدا کی رحمت سے انھوں نے (مسلمانوں نے) تم کو نرم خو پایا اور اگر کہیں تم درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمام کے تمام تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے"

پس اگر لفظ ہدایت اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی نرمی اور رفق کا طالب ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اصطلاحی معنی میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ نمایاں اور روشن ہونی چاہیے اور جو کتاب ہدایت، رشد و ہدایت بن کر آئے از بس ضروری ہے کہ اس کا پیغام رفق و نرمی اور حسن و لطافت کا پیکر ہو اور اگر بہ تقاضائے محل وقوع ظاہری رنگ و روپ میں اس کو درشتی کا اظہار کرنا ہو تب بھی اس کی درشتی میں مودت و محبت کا پیغام مستور ہو۔

کون نہیں جانتا کہ اگر ایک غافل اور بداندیش انسان لطف و نرمی سے منع کرنے کے باوجود سانپ کے منہ میں انگلی دینے پر مصر ہو تو اس کے ہاتھ کو جھٹک کر اس غلط اقدام سے زبردستی باز رکھنا درشتی اور سخت گیری کی قبیح روش نہیں کہلایا جا سکتا۔

لہٰذا قرآن کی ہدایت و رشد میں جس طرح "وعد و بشارت کے روشن پیغام ہدایت کا جزء ہیں اسی طرح وعید و تحذیر بھی ہدایت ہی کی تکمیل کا منظر پیش کرتی ہیں اور اس طرح گویا وہ بھی رفق و یقین اور حسن خلق کا دوسرا پہلو ہیں جس کے بغیر ہدایت کو معراج کمال کا نصیب ہونا ناممکن ہے۔

قرآن عزیز کے اعجاز کمال نے "ہدایت" کے تمام مراتب کو کس طرح ادا کیا ہے یہ بجائے خود ایک مستقل عنوان ہے اور عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنے کے لائق۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم کائناتِ ذی روح پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں اور روشن نظر آتی ہے کہ رب العلمین نے عالمِ موجودات پر اپنی صفتِ ربوبیت کا کمال اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ اول اس کو وجود بخشا اور کتم عدم سے لباسِ وجود عطا فرما کر اس کو "ہستی" کے اعزاز سے نوازا اور جب وجود کی فطرت نے یہ تقاضا کیا کہ اس کی ہستی اس خاکدانِ عالم کے اسرار و حکم کے دائرہ میں تخلیقِ مادی کے لحاظ سے اپنی صحیح جگہ حاصل کرے اور تسویہ و ترتیب میں جس طرح اس کو ہونا چاہیے اسی طرح موجود ہو تو حق تعالیٰ نے اس کو اس عزت سے بھی سرفراز کیا پھر یہ بھی تقاضائے فطرت ہی تھا کہ پردۂ عدم سے جس نے وجود کا ظہور کیا اور وجود کو اس کا حقِ تسویہ عطا فرمایا تو اس کے وجود و بقار اور معیشت بلکہ مبدر و معاد کے لئے ایک مقرر اندازہ اور معین اقدار کا بھی فیصلہ کر دے تاکہ وہ اس ہی کے مطابق اپنی زندگی کے مراحل کو طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ سکے اسی کا دوسرا نام تقدیر ہے۔

تخلیق، تسویہ اور تقدیر کے ان ہر سہ مراحل کے بعد کمالِ ربوبیت کی جانب سے وہ چوتھی منزل سامنے آجاتی ہے جس کا نام "ہدایت" ہے یعنی رب العلمین کے یدِ قدرت نے جس کو پیدا کیا اس کے مناسبِ حال اس کا بناؤ سنوار ہوا اور پھر اس کی حیات و بقار، زوال و عروج، اور زندگی سے موت تک کے سکون و رفتار کے ایک ایک پل کے لئے اقدار کا تقرر ہوا تو کیا کمالِ ربوبیت کا تقاضا یہ نہیں کہ اس کی معیشت و حیات دنیوی و دینی کے لئے ایسی راہ کھول دی جائے جس پر گامزن ہو کر وہ اپنے وجود کے صحیح مقصد کو پورا کر سکے اور مستحق آفرین و تحسین ہو اور اگر اس سے منہ موڑ کر اور فطرت کی رفتار کے خلاف ہو کر راہ بنانا چاہے تو بجز خسران و حرمان کے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آسکے پس یہی وہ تقاضائے فطرت ہے جس کا اصطلاحی نام "ہدایت" ہے۔

یہی وہ روحی حقیقت ہے جس کو قرآنِ حکیم نے اس اعجاز کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اَلَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی وہ پروردگار جس نے پیدا کیا پھر اس کو درست کیا اور

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (اعلیٰ) وہ پروردگار جس نے ہر شے کیلئے اندازہ مقرر کیا اور پھر اس کو راہ دکھائی۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی صورت

خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (طٰہٰ) دی اور پھر اس پر راہ کھول دی۔

اب اگر آپ "ہدایت" کے چہرے سے پردہ اٹھا کر اس کی صورت و شکل ہی نہیں بلکہ اس کی رعنائیوں اور نازک لطافتوں کا جائزہ لینا چاہیں تو آپ پر یہ منکشف ہوگا کہ ہدایت اپنی وسعتِ حدود کے لحاظ سے مختلف مراتب و درجات کی حامل ہے یعنی رب العلمین کی ربوبیتِ کاملہ نے اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انسان کو اس کے اندر ہی ایک آواز سے روشناس کر دیا۔ یہ آواز اس کی طبیعت و فطرت کا طبعی خاصہ ہے اور دوسرے الفاظ میں ایک "الہام" ہے جس کا قدرتِ خداوندی کی جانب سے اس پر فیضان ہوتا رہتا ہے۔

یہی وہ الہام ہے جو ایک انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتی کی جانب دودھ کے لئے راہنمائی کرتا اور مچھلی کے بچہ کو انڈے سے نکلتے ہی تیرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اصطلاح میں اس الہام کا نام "وجدان" یا "نورِ ضمیر" ہے پھر اس وجدان سے بلند ایک اور درجہ ہے جس کو "حواس" کہا جاتا ہے۔ ہدایت کی یہ وہ منزل ہے جس کا تعلق انسان کے حواس و مشاعر سے ہے وہ آنکھ سے دیکھتا، کان سے سنتا، زبان سے چکھتا، ناک سے سونگھتا اور ہاتھ سے چھوتا ہے اور یہی وہ قویٰ ہیں جن کے ذریعہ ہم خارجی امور کا علم حاصل کرتے ہیں۔

حواسِ خمسہ کی یہ راہنمائی کچھ انسانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ وجدان و حواس دونوں کا تعلق جس طرح انسان سے وابستہ ہے اسی طرح حیوان کے ساتھ پیوستہ ہے اور وہ دونوں ہی کو علیٰ قدر مراتب و درجات اپنی افادیت سے مستفید کرتے رہتے ہیں۔

لیکن ان دونوں سے جدا اور بلند و بالا تیسرا درجہ بھی ہے جو صرف حضرتِ انسان ہی کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ ہدایت کے اس مرتبہ کا نام "عقل" ہے۔

عقل و خرد بھی بلاشبہ ہدایت ہی کی منزلِ عالی ہے یہ انسان کی ہر گوشہ میں راہنمائی

کرتی اور دوسرے حیوانات سے ممتاز کرکے اس کو انسانیت کا شرف بخشتی ہے اور جو کام وجدان وحواس نہیں کرسکتے اس جگہ اس کی راہنمائی کام دیتی ہے اس لئے کہ تم وجدان وحواس سے کسی شے کا تصور کرسکتے اور کس خارجی شے کی شکل وصورت اور اقدار واوزان اور صفات خارجیہ کا اندازہ تو لگا سکتے ہو لیکن جزئیات کا تجربہ کرکے کس کلیہ کا استنباط اور کلیات پر نظر کرکے ان سے جزئیات کا استخراج دونوں کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے اور اس جگہ عقل اور صرف عقل ہی رہبری کا کام انجام دیتی ہے۔

مگر ان ہر سہ درجات میں آپس میں بے تعلقی اور بیگانگی نہیں ہے بلکہ ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ ہونے میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یعنی وجدان قدم قدم پر حواس کے لئے دلیلِ راہ بنتا اور خیر وشر کے امتیاز سے باخبر کرتا رہتا ہے اور اسی طرح حواس ووجدان اپنے اپنے احاطۂ اقتدار میں لمحہ بہ لمحہ عقل کے لئے اعانت ومعونت کی پیشکش کرتے رہتے ہیں اور ان ہی دونوں کو ذریعہ اور وسیلہ بنا کر عقل اپنے بلند مرتبہ میں انسان کی راہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وجدان اور حواس کی سرحدیں ختم ہوجاتی ہیں تو اس وقت عقل ہی انسان کو اس کے وجدان اور حواس کے ضعف ومرض پر مطلع کرتی اور جس جس مقام پر حواس کی درماندگیاں اور بیچارگیاں نظر آتی ہیں ان کے لئے چارہ گر ثابت ہوتی ہے۔

صفراوی مرض کا مریض جب مٹھائی کھاتا ہے تو کڑوی محسوس کرتا ہے لیکن عقل راہنمائی کرتی ہے کہ مٹھائی بہرحال شیریں ہے تلخ نہیں ہے لیکن مزاجِ انسانی کے فساد کی وجہ سے قوتِ ذائقہ مریض ہوگئی ہے۔

اسی طرح دور کی انسانی شبیہ کو آنکھ نے دیکھ کر جب یہ سمجھ لیا کہ چارپایہ نظر آرہا ہے تو عقل آگے بڑھ کر دلیلِ راہ بنتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ چوپایہ نہیں بلکہ انسان ہے اور نگاہِ دوربین نہ ہونے کی وجہ سے مرض میں مبتلا ہے تب ہی اس کو چوپایہ سمجھ رہی ہے۔ غرض "عقل" ہدایتِ انسانی کے لئے وہ بلند درجہ ہے جو حیوانات کو عطا نہیں کیا گیا اور انسانیت کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے

ہدایت کی یہی سہ گانہ منازل ہیں کہ قرآنِ عزیز نے جن کو ان آیات میں بصراحت واضح کیا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ عَیْنَیْنِ ۝ وَلِسَانًا	کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان
وَّشَفَتَیْنِ ۝ وَھَدَیْنٰہُ	اور دو ہونٹ عطا نہیں کیے اور اس کو نیک و بد
النَّجْدَیْنِ ۝	دونوں راہوں کو دکھلا دیا۔
وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	اور اللہ نے تم کو سننے کے لئے کان اور دیکھنے کے
وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ	لئے آنکھیں دیں اور (سوچنے کے لئے) دل دیئے
تَشْکُرُوْنَ۔	(یعنی حواس اور عقل عطا فرمائے) تاکہ تم شکر گذار بنو۔
وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا	"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی اٹھائی
لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ	تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں
لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔	اور بلاشبہ اللہ نکوکاروں کا مددگار ہے۔

ہدایت کے ان ہر سہ منازل طے کرنے کے باوجود عقل جب یہ سوچتی ہے کہ گو میرا درجہ ہر دو منازلِ ہدایت سے بلند ہے تاہم جس طرح وجدان، حواس کی رہنمائی کے لئے اور حواس عقل کی رہبری کے لئے محتاج ہے اسی طرح انسان کی معراجِ انسانیت اور اس کا فطری ارتقاء واضح کرتا ہے کہ میری راہنمائی اسی حد تک کارآمد اور مفید ہے جو حواس کے دائرہ میں ہو لیکن اگر یہ سوال پیدا ہو جائے کہ ان حواس کے پسِ پردہ کیا ہے اور حواس سے باہر کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے تو اس مقام پر میں بھی درماندہ اور عاجز ہوں اور کسی مزید راہنمائی کی محتاج۔

نیز جبکہ یہ ظاہر ہے کہ "عقل" جذبات، اوہام، خیالات اور ماحول کے احاطہ میں گھری ہوئی ہے اور اس لئے جب ہم عملی زندگی میں عقل کی اقدار کا اندازہ کرتے ہیں تو نہ ہر حالت میں مفید ثابت ہوتی ہیں اور نہ ہر صورت میں موثر بلکہ بسا اوقات عقل پر جذبات غالب

آجاتے۔ یا اوہام وشہوات کی کشمکش عقل کو مغلوب کرلیتی ہے تو فطرت اعلان کرتی ہے کہ جس ربوبیتِ کاملہ نے انسان کی ہدایت وراہنمائی کا ہر درجہ اور ہر منزل پر انتظام کیا ہے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عقل کی اس درماندگی اور عاجزی کی حالت میں دستگیری نہ کرتی اور ہدایت کا وہ درجہ نہ بخشتی جوان ہرسہ درجات سے بلند تر ہو اور ان تمام درماندگیوں کا پردہ چاک کرکے آفتابِ حقیقت کو روشن وتاباں بنادے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ منزل ہے جس کو مذہب کی زبان میں "وحی" کہا جاتا ہے اور نبوت ورسالت کی معرفت انسانی کائنات کے سامنے حقیقتِ سرمدی کو روشن ودرخشاں کرتا ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہی وہ مرتبۂ ہدایت ہے جو انسان کو سعادتِ کبریٰ اور حیاتِ ابدی وسرمدی بخشتا اور راہنمائی میں ہر قسم کی درماندگیوں اور بیچارگیوں سے بالاتر ہوکر حقِ رفاقت ادا کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس کے متعلق جگہ جگہ یہ اعلان کیا ہے کہ میں پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہوں "هُدًى لِلْمُتَّقِين" بلکہ میں تمام عالمِ انسان کی ہدایت کا کفیل ہوں "هدًى للناس" بہرحال "ہدایت" کا یہی وہ رتبۂ عالی ہے جس کا سلسلہ تخلیقِ انسانی کے ابتدائی دور سے مسلسل اس وقت تک جاری رہا جب تک حدِّ کمال کو نہ پہنچ گیا اور "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممتُ علیکم نعمتی" کا طغرائے امتیاز نہ پالیا

چنانچہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے خاتم الانبیاءؐ تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا اور کائناتِ انسانی کے اہم فرض کو انجام دیتا رہا اس لئے کوئی دور کوئی زمانہ ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ جس میں انسان اس حقیقت سے ناآشنا اور بیگانہ رہا ہو اور اس نے اس راہنمائی کو قبول کیا ہو یا کردیا ہو، بہردوصورت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان نے جب بھی حیوانیت اور وحشت کے زمرہ سے ابھر کر تہذیب وشائستگی کا چولا بدلا ہو اس حالت میں وہ اس روشنی سے محروم رہا ہو۔ قرآن کہتا ہے غور کرو اور سوچو کہ انسان دورِ تاریخ میں اس ہدایت کی راہنمائی کن مقدس ہستیوں

کی معرفت آتی رہی ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ	اور یہ ہماری حجت و دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم
عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ	کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند
نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ	کرنا چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا
عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ	پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے۔ اور ہم نے
وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا	ابراہیم کو اسحاق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب دیا۔
هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ	ہم نے ان سب کو راہ راست دکھائی اور ابراہیم
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَ	سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں اور ابراہیم کی نسل
يُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَ	میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ،
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ	ہارون کو بھی راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح نیکو کاروں
زَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ	کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ، عیسیٰ، الیاس کو
كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ	کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے اور نیز اسمٰعیل
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا	الیسع، یونس اور لوط کو کہ ان سب کو ہم نے دنیا
فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ	والوں پر برتری دی تھی۔ اور ان کے آباء واجداد
اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ	اور ان کی نسل اور ان کے بھائی بندوں میں سے
وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى	بھی کتنوں ہی کو ہم نے اسی راہ پر چلایا۔ ان سب
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى	کو ہم نے برگزیدہ کیا تھا اور سیدھی راہ ان پر
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ	کھول دی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں
عِبَادِهٖ ۭ (انعام)	میں سے جسے چاہے اس کی روشنی دکھا دے۔

الہدیٰ | اس حقیقت کی نقاب کشائی کے بعد قرآن کہتا ہے کہ بات صرف یہیں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی کہ یہیں "ھدیٰ" اور عقلِ انسانی کے لئے سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لئے ہادی

اور رہنما ہوں بلکہ میں وہ جانی پہچانی ہدایت ہوں جس کا تجربہ انسانی تاریخ نے اپنے ہر دور میں کیا اور جس کے فیضان سے زمانہ کا ہر ایک حصہ بہرہ ور رہا ہے اس لئے میں "الہدیٰ" ہوں۔ یعنی وہی ہدایت جس کا آغاز حضرت آدم و حضرت نوح (علیہم السلام) سے ہوا اور وہی ہدایت جس نے تاریخِ انسانی سے قبل اور دورِ تاریخی میں حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ (علیہم السلام) کے ذریعہ کائناتِ انسانی کو روحِ حیات بخشی۔ آج اپنے عروجِ کمال اور شکلِ اعلیٰ پر پہنچ کر "قرآن" کی شکل میں نمودار ہوئی ہے۔

پس اگر وہ اسی آغاز کا انجام ہے اور سابق ہدایت کی نہایت و غایت اور حدِ کمال ہے تو اس کے دعویٰ "ہدیٰ" سے گریز کیوں اور اس کے اعلانِ ہدایت سے اجنبیت کی کیا وجہ؟

اگر انسان اپنی شکل و صورت اور جسم و مادہ کی تاریخی شہادت کو نہیں بھولا تو اس روحانی سعادت کے آغاز اور اس کے نشوو ارتقار کو کیسے فراموش کر دے سکتا ہے۔ اور اگر فراموش نہیں کر سکتا تو بلاشبہ میرا یہ اعلانِ حق و صداقت کی صدا ہے کہ میں ثقلین اور کائناتِ انسانی کے نظامِ ہدایت کی آخری کڑی "الہدیٰ" ہوں۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (انعام)	اے پیغمبر کہدیجئے کہ بے شبہ اللہ کی ہدایت ہی "الہدیٰ" ہے۔
وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (البقرہ)	اور یہودی اور نصرانی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو (اے پیغمبر!) کہدیجئے کہ بے شبہ اللہ کی ہدایت ہی "الہدیٰ" ہے۔

وہ کہتا ہے کہ حقیقی ہدایت کی پہچان کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی اساس و بنیاد میں ایک انوکھی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ جو شخص بھی اس حقیقت کے تاریخی پہلو پر نظر ڈال کر غور کرے تو وہ فوراً پہچان لے کہ یہ صدا وہی صدائے بازگشت ہے جو گذشتہ انسانوں نے

اپنے اپنے دور میں برابر منی ہے۔ پس اس معیار پر میں ایسی "ہدایت" ہوں جو عالمگیر ہے اور بلا تفریق تمام کائناتِ انسان کے لئے ہے اور اس کے کمال کی شہادت کے لئے خود انسان کی اپنی زندگی شاہد عدل ہے کہ جس طرح وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت میں ربوبیتِ کاملہ نے بغیر کسی تنگ دامنی کے تمام کائناتِ انسانی کو یکساں فیضیاب کیا ہے۔ اسی طرح "الہدیٰ" کی ہدایت بھی بلا امتیاز نسل وقوم اور بلا تفریق اسود و احمر سب کو اپنے فیضِ کامل سے سرفراز کرنے والی ہے۔

قرآنِ حکیم نے جس طرح ہدایت کے ان تمام درجات کو واضح کرتے ہوئے ہر گوشۂ ہدایت کو بے نقاب دکھلایا ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ اس کا پیغام ان تمام ہدایات سے وابستہ ہو کر ہدایت کے مقصدِ عظمیٰ تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح اس نے ہدایت کی افادیت سے بھی بحث کی ہے۔

اور اس نقطۂ نظر سے اس نے ہدایت کے دو معنی بیان کئے ہیں اور ان ہی دونوں کے ساتھ اس کی دعوت و ارشاد کا منصب وابستہ ہے۔ ایک بمعنی "راہ نمودن" اور دوسرے بمعنی "توفیق دادن"۔

ہدایت کے ان دونوں معانی کے باہم فرق کو آپ ایک مثال میں اس طرح سمجھئے کہ ایک گم کردہ راہ آپ سے التجا کرتا ہے کہ مجھ کو جامع مسجد تک جانا ضروری ہے کیا میں آپ سے توقع کروں کہ آپ منزلِ مقصود کے لئے میری مدد فرمائیں گے؟ اس التجا کے قبول میں آپ کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ گم کردہ راہ کو جامع مسجد تک پہنچنے والی سڑک کی پُر پیچ راہوں کے فرق کو بتلا کر اس کی صحیح راہ نمائی کر دیں کہ اگر وہ اس کا امتثال کرے تو بلا تکلف منزلِ مقصود تک پہنچ جائے اور دوسری صورت یہ کہ آپ اس کے ساتھ جا کر اس کو جامع مسجد پر لے جا کر کھڑا کر دیں بلکہ مسجد کے اندر تک پہنچا آئیں۔ پہلی صورت کو "راہ نمودن" راہ دکھلانا" کہتے ہیں اور دوسری صورت کو "توفیق دادن منزلِ مقصود تک پہنچا دینا" کہا جاتا ہے اور اسی کو عربی زبان میں "ارائۃ الطریق" اور "ایصال الی المطلوب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ یہ منصب تو صرف خدائے برتر ہی کے لئے مخصوص ہے کہ وہ جس کو چاہے قبولِ حق کی توفیق بخشدے یہ بشری اور انسانی طاقت سے باہر ہے خواہ وہ عام مصلح ہو یا پیغمبر و رسول حتی کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ صاف صاف فرمادیا۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (قصص)

اے پیغمبر! بلاشبہ تم جس کو راہ پر لانا چاہو، نہیں لاسکتے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ پر لے آئے۔

اس آیت کا بے غل وغش یہی مطلب ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہیں کہ کسی کو قبولِ حق کی توفیق بخشدیں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے یہ تو خدا ہی کے لئے زیبا ہے اور "توفیق" اسی کی ذاتِ حق کے ساتھ مخصوص ہے اور ہدایت کا یہی وہ درجہ ہے جس کو بندہ کی زبان سے دعائیہ پیرایہ میں یوں کہا گیا ہے "اهدنا الصراط المستقيم" یعنی ہم کو توفیق نیک عطا فرما کہ ہم راہِ مستقیم تک پہنچ جائیں کہ گمرہی کا پھر گذر ہی نہ ہوسکے۔

البتہ "راہ نمودن" کا انتساب جس طرح خدائے برتر کی جانب ہوتا ہے اسی طرح کتابِ رشد و ہدایت اور اس کے حاملین انبیاء و رسل کی جانب بھی بے تکلف ہوتا ہے بلکہ کتاب اللہ اور رسول اللہ کا فرض ہی یہ قرار پایا ہے کہ وہ گم کردگانِ راہ کی راہ نمائی کریں اور راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لئے مشعلِ راہ بنیں چنانچہ کتابِ حکیم نے ان ہر سہ گونہ انتسابات کو متعدد مقامات میں اس طرح ذکر کیا ہے

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ (حٰم سجدہ)

لیکن ثمود، تو ہم نے ان کو راہ دکھلائی پس انھوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اس آیت میں "راہ نمودن" کا انتساب اللہ تعالیٰ کی جانب ہے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي

بلاشبہ یہ قرآن وہ دکھلاتا ہے جو سب سے

لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل) سیدھی ہے۔

یہاں قرآن کو "راہ نمودن" کا حامل قرار دیا ہے۔

وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ) اے پیغمبر! بلاشبہ تم راہ دکھلاتے ہو سیدھی۔

اس مقام پر ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض "راہ نمودن" کو بیان کیا ہے۔

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ اے باپ! میرے پاس بلاشبہ وہ علم (اللہ کی جانب سے)

الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْۤ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے پس میری پیروی کر

اَهْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا (مریم) کہ میں تجھکو سیدھی راہ دکھلادوں۔

اس جگہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی جانب اسی راہنمائی کا انتساب ہے۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِکُمْ اے قوم! میری راہ چل، پہنچادوں میں تجھ کو

سَبِیْلَ الرَّشَادِ (مومن) نیکی کی راہ پر۔

اور اس موقع پر ایک مردِ مومن کے اس فریضہ کا ذکر ہے جو قوم کے لئے ہادی و راہنما کی حیثیت سے انجام دے رہا تھا۔

غرض صراطِ مستقیم، صراطِ سوی، سبیلِ رشاد کی جانب رہنمائی ایسا اہم فرض ہے جس کی عظمت وجلالت کا ذکر مختلف اسالیب بیان کے ساتھ کتبِ سماوی میں موجود ہے اور یہی وہ ہدایت ہے جس کو قرآن نے بہ درجۂ اکمل واتم انجام دیا ہے۔ مگر جب یہ ہدایت اپنا اثر دکھلاتی ہے اور گم کردہ راہ گمرہی سے نفور ہو کر ہدایت سے فائز المرام ہوتا ہے تو انسان اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے پیشِ نظر مطمئن نہیں ہوتا کہ جامِ عمر کے لبریز ہونے تک وہ ایسی نیک راہ پر قائم بھی رہ سکے گا یا نہیں اس لئے وہ خالقِ کائنات کی بارگاہ میں دستِ سوال پھیلا کر عرض رسا ہوتا اور استقامت وثبات ہدایت کے لئے دعاگو نظر آتا ہے اور کبھی کہتا ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہم کو سیدھی راہ پر قائم رکھ

اور کبھی یوں گویا ہوتا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا ۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اُس کے بعد کہ تونے ہم کو راہِ ہدایت دکھلا دی ہے۔

اور کبھی شکر و حمد کے پیرایہ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا ۔ اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں جس نے ہم کو اس نیک راہ کی توفیق بخشی۔

اور ہدایت کے اسی پہلو کو کبھی اللہ تعالیٰ جزاءِ ہدایت اور ثواب ہدایت کے معنی میں ظاہر فرماتا اور عبدِ مہتدی کو بشارت دیتا ہے۔

یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ ۔ ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ان کو ثوابِ ہدایت عطا فرماتا ہے۔

ہدایت کے ان تمام شعبہ ہائے گوناگوں اور درجات و مراتب کو قرآن حکیم نے اعجازِ بیان کے ساتھ اس طرح واضح اور نمایاں کردیا ہے کہ اس باب میں ماضی اور مستقبل کے تمام عملی پہلو روشنی میں آجاتے ہیں اور بغیر کسی مبالغہ کے کہا جا سکتا ہے کہ رشد و ہدایت کی عظمت کے جس قدر بھی گوشے عقلی تصورات کے دائرہ میں آسکتے تھے ان سب ہی کو قرآن نے ابھری ہوئی حقیقت کی طرح پیش کردیا ہے۔ اور معیشت و معاشرت، اخلاق و سیاست، تمدن و حضارت دنیا و آخرت غرض معاد و معاش کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن میں ہدایت کے اصول و قوانین اور نوامیس موجود نہ ہوں اس لئے بلاشبہ وہ صرف "ہادی" اور "ہدیٰ" ہی نہیں ہے بلکہ سرچشمۂ ہدایت اور "الہدیٰ" ہے اور یہی اس کا طغرائے امتیاز ہے۔

اس تفصیل کے بعد ایک مرتبہ آپ پھر قرآن کے اس اعلان کا جائزہ لیجئے کہ وہ کائناتِ انسانی کے معاش و معاد دونوں کی رشد و ہدایت کے لئے امامِ ہدیٰ اور سرچشمۂ ہدایت ہے کیونکہ وہ ہدایت کے ان تمام اطراف و جوانب اور درجات و منازل کے لئے مکمل روشنی بہم پہنچاتا ہے جو بنی آدم کی پیدائش سے لے کر موت اور مابعد الموت تک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں

وہ کہتا ہے کہ وجدان اور نورِ ضمیر ہدایت کی پہلی منزل ہے جو انسانی وجود کے ابتدائی دور میں مادی تربیت کی کفیل ہے اور شعور و بلوغ کے ساتھ ساتھ اس کی مادیت و روحانیت دونوں کے لئے نورِ روشن ہے اس لئے وہ اپنے دلائل و براہین میں اس ہدایت کے ذریعہ اپیل کرتا اور مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اپنے پیغامِ حق کو اس کے ساتھ وابستہ کرتا ہے تاکہ دینِ فطرت کے پیغام کی اساس فطری برہان و حجت ہی پر قائم رہے اور حواس و عقل اس راہ کے وہ تمام منازل و مدارج ہیں کہ کائناتِ انسانی کے تمام امتیازات ——— مادی ہوں یا روحانی ——— ان ہی کے فیض کے نتائج و ثمرات ہیں اور اسی بنیاد پر اُس کے دلائل و براہین کا رخ منطقی اصطلاحی استدلالات سے بے نیاز ہو کر فطرت کے سادہ اور روشن دلائل کی جانب ہے اور وہ خدا کی ہستی، پیغمبرانِ خدا اور کتبِ سماوی کی صداقت، موت اور ما بعد الموت کے غیبی مسائل، پر جس قدر دلائل پیش کرتا ہے اُن کا نوامیسِ فطرت اور مناظرِ قدرت کے ساتھ گہرا تعلق نظر آتا ہے کیونکہ اس قسم کے تمام مسائل کے استدلالات کے بعد اس کا بار بار یہ کہنا "افلا تبصرون" "افلا تشعرون" "افلا تعقلون" اس کے لئے روشن شہادت ہے۔

وجدان، حواس اور عقل کے بعد وہ آگے ایک اور قدم بڑھاتا ہے اور ہدایت کی آخری منزل کی جانب راہنمائی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہدایت کے یہ ہر سہ منازل باوجود اپنی وسعتِ حدود کے مادیات و محسوسات سے آگے کچھ کہنے اور حکم کرنے سے درماندہ و عاجز ہیں اور نہیں بتلا سکتے کہ اس پردہ کے پیچھے کیا ہے لیکن وجودِ انسانی کی فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میری ہستی کسی غرض و غایت کے بغیر معطل و بیکار نہیں بنائی گئی اور یہ زندگی بلاشبہ پیدا کرنے والے کے سامنے "مسئول عنہ" ہونی چاہیے۔

لہذا عقل سے بالاتر مگر اس کی ہدایت کے لئے معاون و مددگار ہدایت کا نام ہدایتِ "وحی و الہام" ہے اور یہی اسی ہدایت کی ترقی یافتہ آخری کڑی ہے اور کائناتِ انسانی بلکہ ثقلین کی سعادتِ ابدی و سرمدی کے لئے سرمایۂ حیات بن کر حیاتِ جاودانی کی کفیل ہے

وہ کہتا ہے میرے اس دعوی کی تصدیق کے لئے ادیان ملل کی تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کائناتِ ہست وبود میں تیرگی وتاریکی کا یہ عالم تھا کہ خدائے واحد کی ہستی کا اعتقاد مشرکانہ عقائد ورسوم میں گم ہوکر بے کیف ہوچکا تھا۔ خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی نے لے لی تھی اور خدا اور اس کے بندوں کا حقیقی علاقہ گم ہوگیا تھا اور چاردانگ عالم کے سچے ہادیوں کی ہدایت پردۂ ضلالت میں مستور ہوچکی تھی اُس وقت رعد وبرق کی طرح کڑک اور چمک کر کس نے گم کردگانِ راہ کو راہِ ہدایت دکھلائی، کس نے توحیدِ خالص کا سبق دہرایا، اور کس نے کائنات کا حقیقی رشتہ خالقِ کائنات کے ساتھ جوڑا، اور کو آزادیِ فکر کی راہ کس نے سجھائی۔ اور شنکراچاریہ کو توحیدِ الٰہی کا سبق کس نے یاد دلایا اور شرک کی محفلِ سرود میں توحید کا نغمہ کس نے سنایا؟

اولاً تاریخ عالمِ سیاسی سے شہادت حاصل کرو کہ جب تمام کائناتِ بوقلموں میں کمزور کو قوی کہا جارہا تھا، مظلوم پر ظالم غالب ومتسلط تھا اور عرب وعجم اور ایشیا ویورپ، افریقہ وامریکہ یا جہالت کی تاریکی میں تمدن سے ناآشنا زندگی بسر کررہے تھے اور یا تمدن کے نام پر جور وظلم کی حکمرانی تھی اس وقت کس آواز نے روم وایران کو لرزہ براندام کرکے غلاموں اور بیچاروں کے لئے آقائی اور چارۂ کار مہیا کیا اور مساواتِ انسانی کا سبق سنا کر کس نے مظلوم اور بیکس کو ظلم وجبر سے نجات دلائی؟۔

اور فلسفۂ معاشیات کے مبصر سے استفسار کرو کہ جب روم وایران بلکہ ایشیا ویورپ میں ہر طرف تمدن کے نام سے عام بدحالی اور فاقہ مستی پھیلی ہوئی تھی اور دولت وثروت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کی وراثت بن گئی تھی۔ جب کروروں انسان ٹیکس کے نیچے دبے ہوکر نانِ جویں سے محتاج تھے اور دولتِ شاہی حکام اور درباری مصاحب کے درمیان چکر کھارہی تھی اس وقت زکوٰۃ، حرمتِ سود، وراثت جیسے تقسیم دولت کے قوانین نافذ کرکے کس نے یہ اعلان کیا کہ یہ سب اس لئے ہے "کیلا یکون دُولۃً بین الاغنیاء منکم" تاکہ دولت مالداروں کے درمیان ہی چکر نہ کھاتی رہے"؟

اور پوچھو سماج اور معاشرت کی قدیم تاریخ سے کہ جب انسانی دنیا کاسٹ سسٹم کی مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور جب انسان دو حصوں اچھوت اور غیر اچھوت میں تقسیم تھا۔ جب عورت انسانی حقوق سے محروم تھی، جب غلام انسانی حقوق سے بیکار و بے بس تھا۔ جب بیوہ عورت ننگِ خاندان تھی، جب زندہ لڑکیاں درگور کی جاتی تھیں، جب عورت مذہب کے نام پر کنواری اور دیوداسی بن کر مرد کی نفسانی خواہشات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور جب مردہ شوہر کے ساتھ زندہ ستی ہو کر حیاتِ مستعار سے محروم کر دی جاتی تھی اس وقت ان رسومِ جاہلیت اور عقائد باطلہ کے خلاف کس نے عالمِ رنگ و بو میں علمِ بغاوت بلند کیا اور کس نے ان کو فنا کے گھاٹ اتار کر سماج اور معاشرہ میں یکسر انقلاب کر دیا۔ غرض حیاتِ مستعار اور حیاتِ جاوداں دونوں گوشوں کے تاریک پردوں کو چاک کر کے کس نے مشعلِ ہدایت دکھلائی اور اقوامِ عالم کی اقدار کو کس نے بدل ڈالا تو ان سب باتوں کا حقیقی جواب، تاریخی اور سماجی جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے یعنی وہ یہ کہ یہی "الہدیٰ" ہے جس کا دوسرا نام "الکتاب" ہے اور یہی ہے جس کے لئے صاف صاف کہا گیا ہے "قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی"۔

گذشتہ بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہو گا وہ ذاتِ واحد کے ایک ہی قانونِ وحدت کے زیرِ اثر ہے اور فطرۃ اللہ کی کارفرمائیاں جس طرح مادیات میں کارفرما ہیں ٹھیک اسی طرح روحانیات پر بھی اثر انداز ہیں تو اب حقیقتِ بالا، کو دوسرے انداز میں یوں سمجھئے کہ اقوام و امم کے کوائف و حالات اس بات کی زبردست شہادت ہیں کہ حق تعالیٰ انسان کی حیاتِ اجتماعی کے لئے بھی وہی تطورات و درجاتِ ارتقا ودیعت کئے ہیں جو ایک فردِ انسانی کی بقا و ترقی کے لئے مقرر ہیں اور عنایاتِ الٰہیہ دونوں پر یکساں طریق سے فیضان کرتی رہتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ایک بچہ اپنی پیدائش کے وقت صد درجہ کمزور اور بے بس مخلوق کی طرح ہوتا ہے۔ نہ وہ علم و عقل سے کام لے سکتا ہے اور نہ فکر و کاوش سے، اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (النحل)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے سننے کے لئے کان دیئے اور دیکھنے کے لئے آنکھیں دیں اور سمجھنے کے لئے دل دیئے تاکہ تم شکر گذار بنو۔

اس کے بعد والدین یا دوسرے کفیل اس کی مدد کرتے اور تربیت و تادیب کے ذریعہ اس کے شعور و وجدان کو ترقی دیتے ہیں اور غلط راہوں سے محفوظ کر کے صحیح راہ پر لگاتے ہیں پھر جب قویٰ بدنی و عملی میں قوت و استعداد نشوونما پاتی ہے اور اب سنِ رشد و بلوغ آجاتا ہے تو اس وقت بیشتر عقل کی راہنمائی کام دیتی ہے اور بہ تفاوتِ درجات عقل ہی اس کی رہنمائی کرتی ہے اور جس طرح قوتِ جسم و بدن کی نشوونما کی حدود سن رشد پر پہنچ کر کامل ہو جاتی ہیں اسی طرح اس کے شخصی قوائے مدرکہ و علمیہ "عقل" کی کارفرمائی پر پہنچ کر نشوونما کے حدِ کمال تک منتہی ہوتے ہیں۔

پس جس طرح شخصی قویٰ بدنی و قوی مدرکہ آہستہ آہستہ اور بہ تدریج نشوونما پاکر حدِ کمال کو پہنچ جاتے ہیں اسی طرح انسان کی جماعتی زندگی بھی بچپن، سنِ شعور اور سنِ کمال کے درجات تک آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے چنانچہ انسان کی حیاتِ اجتماعی کا دورِ صبا (بچپن) کا زمانہ ایسی حالت میں گذرتا ہے کہ وہ اجتماعی ضروریات اور اس کے شئون و تطورات سے ناواقف ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ جماعت کے کیا مقاصد عالیہ ہیں اور کیا ان کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ نظامِ اجتماعی کس طرح منظم ہوتا اور کائناتِ انسانی کو ایک سلک میں منسلک کرتا ہے بلکہ سادگی اور سادہ لوحی سے ایک دوسرے کے ساتھ روابط و حاجات کو محسوس اور مشاہدہ کرتے ہوئے اسی دائرہ میں محدود رہتا ہے اس دور کے بعد حوادثِ عالم، تطوراتِ زمانہ اور تکویناتِ عالم اس کو والدین کی طرح اپنی آغوش میں تربیت دیتے اور حیاتِ اجتماعی میں نشوونما پانے کی

استعداد کو قوی سے قوی تر بناتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس نشو و ارتقا کے ذریعہ اس زندگی کے حدِ کمال تک پہنچ جاتا ہے اور اجتماعی حیات کے اعلیٰ مقاصد، احسن مطالب اور اکمل معانی کا حامل بن جاتا ہے اور ان ہی درجات و تطورات اجتماعی کو تاریخی اصطلاح میں دورِ حجری، دورِ حدیدی دورِ بخاری اور دورِ کہربائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پس جس طرح عالمِ مادیات کا یہ نظامِ اجتماعی بہ تدریج ترقی کرتا ہوا حدِ کمال تک پہنچا ہے۔ ٹھیک اسی طرح عالمِ روحانیات میں بھی انسان کا یہی حال ہے کہ جب عقل کے ماوراء اس کی عقل نظر کرتی ہے تو ایک عرصہ تک وہ اسی دائرہ میں محدود رہتا ہے اور اس کی عقل و خرد کا ماحول جو خیالات، جذبات، شہوات سے گھرا ہوا ہے، الٰہیات و روحانیات کے فہم میں ایک بچہ کی مانند نظر آتا ہے۔ پس یہ ماحول اس کو ایک عرصہ تک تو اس میدان سے بے شعور و بیگانہ رکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے کبھی انسان مظاہر پرستی میں عالمِ سفلی کا پرستار نظر آتا ہے اور کبھی عالمِ علوی کے سامنے سربسجود دکھائی دیتا ہے۔ تب عنایتِ خداوندی اور رحمتِ باری سہارا دیتی ہے اور ماوراء مادیات و محسوسات کے درک و استدراک کے لئے عقل سے زیادہ لطیف اور خیالات و اوہام سے بالاتر ہدایت سے روشناس کراتی اور اس کے ذہنی و روحانی ارتقا کے حدِ کمال تک پہنچاتی ہے اسی کا نام مذہب کی اصطلاح میں "وحی و الہام" ہے وہ آکر انسان کو اذعانِ کامل اور یقینِ محکم کے ساتھ مظاہر پرستی کی حقیقت کو عریاں کرتی اور حقیقت و مظہر کے درمیان امتیاز پیدا کرکے پرستارِ حقیقت بناتی ہے۔

چنانچہ انبیاء و رسل کی تاریخِ ہدایت اسی حقیقت نمائی کا ایک غیر فانی سلسلہ ہے جو کائناتِ انسانی کے روحانی نشو و نما کا کفیل اور ضامن ہے اور قرآنِ عزیز اسی سلسلہ کی غیر متبدل و غیر متحرف دستاویزِ ہدایت ہے جو رہتی دنیا تک اپنے بے پایاں کمالات اور غیر محدود افادات کے ذریعہ "الہدیٰ" بن کر راہنمائی کرتا رہے گا تا آنکہ عالمِ انسانی کی حیاتِ اجتماعی میں وہ روشن دور بھی آجائے جبکہ کوئی سوسائٹی، سماج کا کوئی گوشہ اور قانون کا کوئی نقطہ اس مرکز و محور

سے باہر نہ رہ سکے

الحاصل ہدایت کے تمام مراتب و درجات اور معانی و مطالب کے پیشِ نظر بلاشبہ قرآن ہدایتِ کامل اور ہُدیٰ ہے اور اسی لئے آیاتِ قرآنی میں جگہ جگہ اس کے اِس وصفِ عالی کو دُہرایا اور یاد دلایا گیا ہے تاکہ اس کا یہ وصفِ کامل ایک لمحہ کے لئے بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ، آلِ عمران، انعام، نساء، مائدہ، اعراف، طٰہٰ، لقمان، توبہ نمل، نحل، اسرائیل، قصص، محمد، نجم، جن، کہف میں اس حقیقت کو اعجازِ بیان کے مختلف طریقوں سے واضح کیا گیا ہے۔

نور | قرآن "الکتاب" اور "الہدیٰ" ہے۔ اس تفصیلی بحث کے بعد قرآنِ حمید یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ "نور" ہے۔ یعنی واضح اور روشن ہے جس کے معانی میں گنجلک نہ مطالب میں اغلاق، جس کے اعجاز میں خفاء نہ وضاحتِ احکام میں پیچیدگی، وہ جس طرح نظم و انسجام میں بے غل و غش نورٌ علیٰ نور ہے۔ اسی طرح ادا، مطالب و معانی میں بھی روشن و درخشاں ہے، اس کے دعاوی کی سادگی، دلائل کی شگفتگی، اوامر و نواہی کی وضاحت، وعد و وعید کی فخامت غرض ہر گوشۂ بیان نور ہی نور ہے جو تاریکی سے کوسوں دور اور ظلمت کے خلاف مظفر و منصور ہے اس کی تعلیم کی درخشانی و تابانی خود اس کے لفظ لفظ سے عیاں ہے اور اس کا ہر جملہ تابشِ حقیقت کا ترجمان ہے کیوں ہے اور کس طرح ہے؟ اس کو اس طرح غور فرمائیے۔

اگر تم کو گذشتہ سطور فراموش نہیں ہوئیں اور کائنات مادی و روحانی میں وحدت کی کارفرمائی اور ناموسِ فطرت کی ہم آہنگی کا تصور پیشِ نظر ہے تو غور کرو کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسان کے حواسِ خمسہ میں سے آنکھ کو قوتِ بصارت عطا فرمائی ہے اور وہ بصارت کی حِس کا احساس کر کے اپنی خدمت کو انجام دیتی رہتی ہے۔ اس فلسفیانہ موشگافیوں سے جدا رہ کر کہ بصارت کیا ہے؟ کیا باہر سے شے کا عکس پڑ کر آنکھ بینائی کا فرض انجام دیتی ہے یا آنکھ کی روشنی مخروطی شکل بن کر شے کو روشن کر دیتی ہے اور اسی کا نام رویت و بصارت ہو جاتا ہے؟

یہ بات بہرحال مسلمات میں سے ہے کہ ید قدرت نے انسان کے اندر بصارت کی قوت ودیعت فرمائی ہے لیکن ہم شب و روز یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگر بقول حافظ شیراز۔ شبِ تاریک بیم موج گرد لبے چنیں حائل ۔۔۔ کا منظر سامنے ہو اور تاریکی تو بر تو چہار سمت چھائی ہو تو اس وقت ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ اس قدر اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب کوئی سائل یہ دریافت کرنے بیٹھے کہ انسان کے اندر جبکہ بصارت کی قوت ودیعت ہے اور وہ تلف بھی نہیں ہوئی تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تب آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ بلاشبہ نہ آنکھ کا قصور ہے اور نہ آنکھ کی بینائی کا بلکہ قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت کا یہ فیصلہ ہے کہ انسان کے اندر ودیعت شدہ قوتِ بصارت ماحول کے اثراتِ ظلمت سے اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ صحتِ بصارت کے باوجود اس وقت تک کام کرنے اور اپنی افادیت کا مظاہرہ کرنے سے معذور ہے جب تک باہر سے کوئی روشنی اعانت و مدد نہ کرے اب خواہ وہ روشنی دیئے اور چراغ کی ہو یا شمع کافوری کی، ہری کین کی ہو یا گیس کی اور یا بجلی کے قمقمے کی یا ستاروں اور ماہتاب و آفتاب کی ہو ان میں سے جیسی قوت و وسعت کی روشنی ہوگی انسان کے اندر کی قوتِ بصارت اسی وسعت کے ساتھ اپنی خدمت انجام دے گی۔

(باقی آئندہ)

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ
مکتوبات کے آئینہ میں

از جناب پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔اے

آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کا ذکر ہے کہ دہلی میں ایک نہایت عظیم المرتبت بزرگ حضرت شاہ کلیم اللہ چشتیؒ رہتے تھے۔ شاہ جہاں آباد، بازار خانم میں ان کی خانقاہ تھی۔ خانقاہ کیا تھی، علم و معرفت کا سرچشمہ تھی۔ ہزاروں تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے آتے تھے۔ شایقینِ علم و فضل ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا باعث فخر و مباہات تصور کرتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔

"امرا و فقرا حلقہ اعتقاد در گوش داشتند و بہ مطالب دینی و دنیوی کامیابی اندوختند"[1]

شاہ صاحب کے علمی اور روحانی دونوں مراتب نہایت بلند تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ مصنف ماثر الکرام کا بیان ہے "در علوم عقلی و نقلی پایہ بلند و در حقایق و معارف رتبۂ ارجمند داشت"[2]

شاہ صاحب کے اسلاف معماری کا پیشہ کرتے تھے لیکن خود اُن کو بقول آزاد "اللہ تعالیٰ نے دلوں کی معماری کے لئے مخصوص کیا تھا"[3]

شاہ صاحب نے رشد و ہدایت کی شمع ایسے زمانہ میں روشن کی جب کہ ہندوستان کے مسلمان ایک نہایت نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا۔

---

[1] ماثر الکرام ص ۴۲۔ [2] و [3] ایضاً ص ۴۲۔

معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھا رہا تھا۔ زندگی "سکرِ دوام" میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہر شخص ایک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ دلی کی عظمت روز بروز گھٹ رہی تھی۔ صوبوں میں نوابیاں اور خود مختاریاں قائم ہو رہی تھیں۔ مرہٹوں کا سیلاب طوفانِ بلاخیز کی طرح امنڈتا چلا آرہا تھا مسلمانوں کا جاہ و جلال جواب دے رہا تھا۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی۔ اور اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو اوہام کا تار و پود۔ شاہ صاحب نے تنزل اور انحطاط کے اس دور میں احیاءِ ملت اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے جو کوششیں کیں وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ حالات کی ناسا عدت کو پہچانتے تھے، زمانہ کی رفتار کو دیکھتے تھے لیکن ہمت نہ ہارتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے:۔ "در اعلائے کلمۃ الحق باشید و جان و مال خود صرفِ ایں کار کنید" [۱]

شاہ صاحب کی تبلیغی مساعی کا پتہ ان کے مکتوبات سے چلتا ہے لیکن افسوس ہے اس حیثیت سے ان کے مکتوبات کا اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی تبلیغی مساعی سے لوگ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اس مضمون میں شاہ صاحب کی تبلیغی کوششوں اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کے مکتوبات کی روشنی میں بحث کی جائے گی۔

مختصر حالات | شاہ کلیم اللہ صاحبؒ ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کو پیدا ہوئے تھے، خود ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔ "بست و چہارم جمادی الثانی مولد فقیر است و تاریخ تولد فقیر غنی است" (غ ۱۰۰۰ + ن ۵۰ + ی ۱۰ = ۱۰۶۰) [۲]

علوم ظاہری کی تکمیل دہلی میں فرمائی۔ اس کے بعد عازم حج ہوئے۔ مدینہ منورہ میں حضرت شیخ یحییٰ مدنیؒ سے ملاقات ہوئی۔ شیخ کے تقدس اور علم و فضل سے شاہ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً ان کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد شاہ کلیم اللہ صاحب دہلی واپس تشریف لائے

---

[۱] میرے پیشِ نظر شاہ صاحب کے مکتوبات کے تین نسخے ہیں۔ ایک قلمی دو مطبوعہ۔ قلمی پر سنہ کتابت درج نہیں۔ ایک نسخہ مطبع یوسفی دہلی ۱۳۰۱ھ کا ہے دوسرا مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ کا۔ اس مضمون میں جس جگہ میں نے صفحات کے حوالہ دیئے ہیں وہ موخر الذکر نسخہ سے ہیں۔ مکتوب ۲۱ ص ۲۶۔ [۲] مکتوب ۱۲۵ ص ۹۳

اور بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا اور سلسلہ درس وتدریس شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ امرا و فقرا، سب آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کے درس میں شریک ہونے لگے۔

شاہ صاحب کو توکل اور قناعت کی بے پناہ دولت ملی تھی۔ وہ عسرت اور تنگی میں دن گذارتے تھے لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا تو کیا معنی امراء وسلاطین کی نذریں اور جاگیر نامے تک قبول نہ کرتے تھے۔ "تکملہ سیر الاولیا" کا بیان ہے کہ "شیخ کی ملکیت میں لے دے کے کل ایک حویلی تھی جس کا ماہوار کرایہ ۱۰؍ آتا تھا۔ شیخ اسی سے گذراوقات کرتے تھے ۸؍ ماہوار پر ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور باقی دو روپے میں پورے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔" [1]

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ قحط یا دیگر غیر معمولی حالات کے باعث اس مختصر سی آمدنی میں گذراوقات نہ ہو سکی اور وہ قرض دار ہو گئے۔ ایک مکتوب میں شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کو لکھتے ہیں:-

"دریں سالہا کہ از تنگی باراں صورتِ قحط دریں ملک شدہ بود۔ وبا نہ دہ نفر سوار مہمان گذران می شد گاہ بیگاہے قرض دار می شدم" (م ۱۷، ص ۲۱)

لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب نے کسی بادشاہ سے کچھ قبول نہیں کیا۔ ان کی شانِ استغنا اور خودداری کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ان کے سلسلہ کے کسی بزرگ نے اُسے روا نہ رکھا تھا۔ فرخ سیر نے بہت کوشش کی شاہ صاحب کو بیت المال سے کچھ دیدیا جائے لیکن انھوں نے ہر بار انکار کر دیا۔ "تکملہ سیر الاولیا" میں لکھا ہے۔

"بادشاہ فرخ سیر بارہا الحاح نمود کہ حضرت از بیت المال چیزے قبول فرمانید ایشاں جواب دادند کہ حاجت نیست، باز عرض کرد کہ حویلی از بہر نزول در معرض اقدس فرمودند	بادشاہ فرخ سیر نے بارہا اصرار کیا کہ حضرت بیت المال سے کچھ قبول فرمالیں جواب دیا کہ ضرورت نہیں ہے پھر بادشاہ نے کہا کہ اچھا اپنے رہنے کے لئے ایک حویلی ہی قبول کر لیجئے۔ ارشاد ہوا۔ اس کی

[1] "ذکر الاصفیا" معروف بہ "تکملہ سیر الاولیاء" مصنفہ خواجہ گل محمد احمد پوری ص ۸۵۔ مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ

بہ این نیز حاجت نیست[۱]، باز عرض نمود اگر	بھی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے پھر عرض کیا، اگر
اجازت باشد بندہ در خدمت آمدہ سعادت	اجازت ہو تو خاکسار خدمتِ والا میں حاضر ہو کر
دارین بہ قدم بوسی حاصل نمودہ باشد فرمودند	شرف قدمبوسی ہی حاصل کر لیا کرے، فرمایا "آپ
کہ تو ظلِ الٰہی ہستی در سایۂ آں ذات ہمیشہ بہ	ظلِ الٰہی ہیں۔ آپ کے زیرِ سایہ میں ہمیشہ دعا گوئی
دعا گوئی مشغول ام۔ بہ آں نیز حاجت	میں مشغول ہوں اس کی حاجت نہیں ہے۔ بلکہ
نیست بلکہ بندہ را تصدیع خواہد رسید" (ص ۸۵)	بندہ کو اس سے تکلیف ہوگی۔

شاہ صاحب نہایت حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان تھے۔ جب کوئی شخص جس کو ان کی ناراضگی کا خیال ہوتا معذرت کا خط لکھتا تو اس انداز میں جواب دیتے کہ مومن کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہے

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے　　　میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہ ہوتے تھے۔ بلکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرح یہ اشعار اُن کی زبان پر رہتے تھے ہے

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد[۲]　　　ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد

ہر کہ خارے بر نہد در راہِ ما از دشمنی　　　ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

آخر عمر میں شاہ صاحب کو نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے۔ ایک خط میں جو تقریباً ۷۸، ۷۹ سال کی عمر میں لکھا گیا ہے[۳] فرماتے ہیں۔

---

[۱] بعد کو شاید شاہ صاحب نے ایک حویلی قبول فرمالی تھی۔ ایک مکتوب میں نظام الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔
"شاہ ضیاء الدین برائے فقیر از بادشاہ حویلی یک ہزار و دو درعہ بازار خانم کہ مشتمل است
بر یک ایوان و دو حجرہ و یک چاہ و یک چاچہ گرفتند" ص ۸۱ ص ۶۴

[۲] حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زبانِ مبارک پر بھی اپنے دشمنوں کے لئے یہی اشعار آتے تھے ملاحظہ ہو
سیر الاولیاء۔ از میر خورد۔ ص ۲۰۴ (اردو۔ لاہور)

[۳] اسی مکتوب میں لکھتے ہیں "امروز نہم شہر جمادی الثانی است۔ سال عمر ہفتاد و ہشت است۔ چہاردہ یا پانزدہ روز باقی است کہ شروع سال نہم خواہد شد" م ۱۲۵ ص ۹۳۔ شاہ صاحبؒ نے ۸۲ سال کی عمر پائی۔

"آزارِ نقرس و وجع المفاصل بافراط شدہ	نقرس اور گٹھیا کی تکلیف حد کو پہنچ گئی ہے، بایاں
کہ دست چپ و زانوئے پائے راست ہر دو	ہاتھ اور سیدھے پاؤں کا گھٹنا اور دونوں پر سوجے
پاآماسیدہ اند و چہار ماہ است کہ صاحبِ	ہوئے ہیں۔ چار مہینوں سے بستر پر پڑا ہوا ہوں
فراشم دریں روز لنگ لنگاں باستعانت	ان دنوں میں بعض لوگوں کی مدد سے لنگڑاتا
چندے از اندروں بخانہ میتوانم رفت	لنگڑاتا گھر سے باہر جا سکتا ہوں۔ نماز تیمم
نماز بہ تیمم نشستہ می خوانم" (م ۱۲۵ ص ۹۳)۔	سے بیٹھکر پڑھتا ہوں۔"

لیکن ان تکالیف کے باوجود اعلار کلمۃ الحق میں مصروف رہے۔[۱] اسی حالت میں وہ اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو خطوط لکھتے تھے اور ضروری ہدایات دیتے تھے۔

شاہ صاحبؒ نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ[۲] کو وصال فرمایا۔ جامع مسجد اور قلعہ کے درمیان آپ کا مزار پر انوار ہے۔ غلام سرور نے ان اشعار سے تاریخ وفات نکالی ہے[۳] ؎

کلیم اللہ چو از فضلِ الٰہی	ز دنیا شد بخلدِ جاودانی
دو تاریخت بہر سال وصلش	برآید مدعا از وے چو خوانی
یکے موسیٰ ثانی کاشف دیں ۱۱۴۲	دگر عرفانِ دیں موسیٰ ثانی ۱۱۴۲
کلیم اللہ چشتی مبارک ۱۱۴۲	بگو ترحیل آں شیخ زمانی

تصانیف | شاہ کلیم اللہ صاحبؒ بڑے پایہ کے بزرگ ہونے کے ساتھ بڑے جید عالم بھی تھے انھوں نے تصانیف کا ایک بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جن سے اُن کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلام پاک کی نہایت اعلیٰ تفسیر انھوں نے عربی زبان میں لکھی۔ اس کے علاوہ تصوف پر مختلف کتابیں سپرد قلم فرمائیں

---

[۱] "در ہدایت خلق اللہ و اعلار کلمۃ اللہ تا دم واپسیں کوشش بلیغ بکار بردند"
مولوی محمد قاسم کلیمی مرتب مکتوبات ص ۲

[۲] آزاد بلگرامی نے سنہ وفات ۱۱۴۳ھ لکھا ہے۔ خزینۃ الاصفیا (جلد اول ص ۴۹۵) میں ۱۱۴۲ھ ہے محمد قاسم کلیمی نے دیباچہ مکتوبات میں ۱۱۴۲ھ ہی دیا ہے۔

[۳] خزینۃ الاصفیا۔ جلد اول ص ۴۹۵۔

مثلاً عشرۂ کاملہ، سوار السبیل، کشکول، مرقع۔ شاہ صاحب نے ایک کتاب "ردِ روافض" بھی تصنیف فرمائی تھی۔

شاہ صاحبؒ کی ان تمام تصانیف میں "کشکولِ کلیمی" کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ صوفیاءِ متاخرین اسے اپنا "دستور العمل" سمجھتے تھے۔ خود شاہ صاحب نے کشکول کے شروع میں فرمایا ہے۔

"یہ ایک ایسا کشکول ہے جس کے نوالے لطیفہ ربانی کو طاقت بخشتے ہیں۔ نفسِ ناطقہ کو قوت دیتے ہیں اور مجازی اسلام کے پیکر میں ایمانِ حقیقی کی روح پھونکدیتے ہیں طبیعت کے مردہ لوگوں کو ابدی زندگی عطا فرماتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی کے بیماروں کو روحانی شفا دیتے ہیں"[۲]

شاہ صاحبؒ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاص مریدین کو اصلاحِ نفس اور روحانی ترقی کے لئے کشکول کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"شما صحبت ہا دریافتہ اند۔ دو کشکولے و مرقع آنجا موجود اند ہر طالب را موافق حوصلہ آں بہ نیابت ذکرے و شغلے بفرمائید" (م ۱۲۶ ص ۹۴)

مکتوبات | ان تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے مکتوبات بھی چھوڑے ہیں جن کا مجموعہ "مکتوباتِ کلیمی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مکتوبات کئی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ ان میں اگر ایک طرف شاہ صاحب کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے تو دوسری طرف ان کی تبلیغی کوششوں کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے پُرخلوص جدوجہد، چشتیہ سلسلہ کی ترقی کے لئے ان تھک کوشش، لشکریوں اور عوام میں روحانی تعلیم و تربیت کے لئے سعی بلیغ۔ ان سب کا اندازہ ان ہی مکتوبات سے ہوتا ہے۔

تعداد میں کل مکتوبات ۱۳۲ ہیں۔ یہ سب اپنے مریدوں کے نام مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ سو سے زیادہ خطوط شاہ صاحب نے اپنے ایک عزیز مرید شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو

---

[۱] تکملہ سیر الاولیا ص ۸۱ ۔ [۲] کشکول کلیمی۔ ص ۲۔ مطبع مجتبائی ۱۸۹۷ء

دکن بھیجے ہیں۔ باقی خطوط مولانا محمد، دیارام، عبدالرشید وغیرہ کے نام ہیں۔ شیخ نظام الدین صاحب کے نام جو مکتوبات لکھے گئے ہیں وہ نسبتاً زیادہ صاف اور مفصل ہیں اور حقیقت میں تمام مجموعہ کی جان ہیں۔ چونکہ اکثر مکتوبات شیخ نظام الدین صاحب کے نام ہیں اس لئے بے جا نہ ہوگا اگر ان کے متعلق بھی یہاں کچھ عرض کر دیا جائے۔

شیخ نظام الدین اورنگ آبادیؒ

شیخ نظام الدین اورنگ آبادی، شاہ کلیم اللہ صاحب کے عزیز ترین مرید اور خلیفۂ راشین تھے۔ ان کے وطن کے متعلق معلوم نہیں تکملہ سیر الاولیا، خزینۃ الاصفیا اور مناقب فخریہ میں یہ لکھا ہے کہ ان کا وطن پورب میں تھا۔ وہاں سے علوم ظاہری کی تحصیل وتکمیل کے لئے دہلی چلے آئے تھے۔ مناقب فخریہ میں لکھا ہے کہ پہلی بار جب شیخ نظام الدین، شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو محفلِ سماع منعقد ہو رہی تھی۔ شاہ صاحب کا دستور تھا کہ سماع کے وقت مکان کے دروازے بند کرا دیتے تھے اور پھر کسی ناآشنا شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ شیخ نظام الدین نے دروازہ پر دستک دی۔ شاہ کلیم اللہ صاحب نے آواز سن کر ایک مرید کو اشارہ کیا کہ باہر جا کر دیکھے۔ مرید نے ایک غیر متعارف شخص کو دروازہ پر کھڑا دیکھا تو نام دریافت کیا اور آ کر شیخ سے عرض کی کہ ایک بیگانہ شخص، گدا صورت نظام الدین نامی طالبِ ملاقات ہے شیخ نے نام سنتے ہی فوراً حکم دیا کہ جلدی سے اس کو اندر لے آؤ۔ مریدوں کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ شیخ نے کیوں ایک ناآشنا اور بیگانہ شخص کو سماع کے وقت اندر آنے کی اجازت دی، لیکن شیخ نے فوراً یہ کہہ کر ان کی تسلی کر دی "ازیں شخص ونام نامی وے بوئے آشنائی می آید غیر نیست" اور شیخ نظام الدین سے نہایت خلوص اور محبت سے ملے۔ اور ان کی ظاہری تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

عرصہ تک شیخ نظام الدین، شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں رہے اور علوم ظاہری میں دستگاہ حاصل کرتے رہے۔ ایک دن شاہ کلیم اللہ صاحب مجلس سے اٹھے اور فرش کے کنارے پر آئے شیخ نظام الدین نے فوراً جوتے اٹھائے اور صاف کر کر رکھے۔ شاہ صاحب کو شیخ نظام الدین کی

یہ ادا بہت پسند آئی۔ اور کمالِ محبت سے اُن کی طرف دیکھ کر پوچھا "نظام الدین تو ہمارے پاس علوم ظاہری حاصل کرنے آیا ہے یا فوائد باطنی حاصل کرنے جو زیادہ اچھے اور بہتر ہیں"۔ شیخ نظام الدین نے فوراً جواب دیا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را　　تو دانی حساب کم و بیش را

شاہ صاحب کو یہ شعر سن کر اپنے پیر شیخ یحییٰ مدنی کی وہ پیشین گوئی یاد آگئی جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک شخص ایسے موقع پر یہ شعر پڑھے گا وہ ہماری نسبت کا مالک ہوگا اُس سے سلسلۂ چشتیہ کو بے حد ترقی ہوگی۔ شاہ صاحب سمجھ گئے کہ ؏

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اور اس وقت سے ان پر خاص التفات اور توجہ فرمانے لگے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب تعلیم و تربیت کا سلسلہ ختم ہوا تو شاہ صاحب نے ان کو دکن روانہ فرما دیا۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ ہندوستان کی سیاست کا مرکزِ ثقل شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ بادشاہ، شاہی خاندان، فوج کا بیشتر حصہ، سب دکن میں پہنچ چکا تھا۔ شمالی ہندوستان کی اہمیت نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ دہلی۔ آگرہ۔ لاہور سب اپنی عظمتِ پارینہ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ محلات میں حسرتناک خاموشی طاری تھی۔ سارا ساز و سامان تالوں میں بند پڑا تھا۔[۵] اسلامی ہند کی تاریخ کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ شاہ صاحب نے وقت کی آواز کو پہچانا اور اپنے عزیز ترین مرید شیخ نظام الدین کو تبلیغ و اصلاح کے کام کے لئے دکن روانہ فرمایا۔ خود ایک مکتوب میں شیخ نظام الدین کو لکھتے ہیں۔

"تم کو اللہ تعالیٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے تم یہ کام پورے طور پر انجام دو۔ میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ۔ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہو، اور اپنے جان و مال کو اس میں ہی صرف کر دو"۔ (م ۲۱ ص ۲۶)

مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین لشکرِ شاہی کے ہمراہ دکن گئے تھے اور کچھ عرصہ

۵؎ ماثر عالمگیری ص ۴۸۳ -

دکن میں اُن کی نقل وحرکت لشکر کے ساتھ ہوتی رہی۔ ان کے خطوط لشکریوں کے ذریعہ آتے جاتے تھے اور شاید اسی وجہ سے شاہ صاحب نے ایک مکتوب میں تاکید کی تھی کہ وہ دکن کے حالات بڑی احتیاط سے لکھا کریں۔ (م ۵۱ ص ۴۸)

مکتوبات میں جگہ جگہ لشکر کا ذکر ملتا ہے، مثلاً

(۱) "از ابتدائے آمدن شما در لشکر بادشاہی کہ تا تاریخ حال ہفت ہشت ماہ گذشتہ باشد دو کتابت رسیدہ" (م اول، ص ۶)

(۲) "در لشکرے کہ شما ہستید اکثر شنیدہ می شود کہ معتقدات رفض بغایت رائج است (م ۲، ص ۱۳)

(۳) "قبل ازیں می نوشتم کہ بہ لشکر بروید اکنوں ایں امر است ہر جا باشید در اعلائے کلمۃ الحق باشید" (م ۲۱، ص ۲۶)

(۴) "مکتوب شما از لشکر رسید" (م ۳۲، ص ۳۴)

(۵) "شاہ ضیاء الدین ہمراہ لشکر اعظم شاہ بہ شہر کانور رفتہ اند۔ وشاہ اسد اللہ لشکر را نخواہند گذاشت واللہ یحق الحق وھو یھدی السبیل واللہ متم نورہ ولو کرہ المشرکون۔ بہر طریق بودن شما در لشکر موجب رحمت علی عباد اللہ است۔" (م ۳۳، ص ۳۵)

(۶) "حکم آں است کہ در لشکر خدمت گاری طالب علمان حق نمائید وایں سعادت خود شمارید وجہد کنید تا مردم بسیار از حضیض غفلت بزاویہ معرفت بطفیل شما رسند" (م ۶۰ ص ۵۲)[1]

چنانچہ شیخ نظام الدین نے اپنے پیر ومرشد کے زیر ہدایت عرصہ تک دکن کے لشکریوں میں تبلیغ واصلاح کا کام کیا۔ ان کی کوششیں اس بارے میں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ لشکر کے لوگ ان کے گرویدہ ہونے لگے۔ خود شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"دیگر معلوم شد کہ از لشکر دو جوان بسیار از وضع شما محظوظ بودند وتعظیمے از مذاق شما می کردند

---

[1] اختصار کے مدنظر اور مکتوبات جن سے شاہ صاحب کا لشکر سے تعلق ظاہر ہوتا ہے یہاں نقل نہیں کئے گئے مثلاً م ۸۰ ص ۶۰، م ۱ ص ۷ وغیرہ۔

معلوم شد کہ کمال رشد شناختہ اند" (م ۱۶، ص ۲۲)

دکن میں شاہ نظام الدین صاحب مختلف مقامات پر اقامت گزیں رہے۔ مکتوب (۵۴، ص ۴۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور بھی آپ کا قیام رہا" خطے کہ بعد از سیر بیجاپور ۲۱ شوال مرقوم بود رسید" (ص ۴۴)

مکتوبات کلیمی سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ دہلی سے دکن روانہ ہوئے تو برہان پور بھی کچھ عرصہ قیام فرمایا، ایک مکتوب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔

"اللہ اللہ دریں روزہا در برہان پور خوبیہا است وطن اختیار بکنید اما بر لب آب اگرچہ صحرا باشد انشاء اللہ تعالیٰ آبادی ہم آنجا خواہد رفت" (م ۲۵، ۲۹)

برہان پور کی تاریخی[۵۱] اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر اسی کو وطن بنانے کا مشورہ دیتے ہیں :۔

"برائے توطن شہر برہان پور در جمیع خوبیہا است خوب است ہم گذر مردم ہندوستان و ہم گذر مردم دکھن و ہم گذر حجاج بیت الحرام واکثر درویشاں دریں شہر بودند اما تکیہ بر لب آب اختیار کنند واز نظام پورہ نام نہند" (م ۶۱، ص ۵۳)

لیکن بقضائے الہی برہان پور مستقر نہ بن سکا اور آپ اورنگ آباد پہنچے۔ پیرو مرشد نے خط لکھا۔

"خواجہ عبداللطیف نے لکھا تھا کہ شاہ نظام الدین جیو اورنگ آباد چلے گئے ہیں لیکن تمہارے خط نہ آنے سے تشویش ہے۔ معلوم ہوا کہ ابھی جگہ مقرر نہیں ہوئی ہے" (م ۵۲ ص ۴۸)

آخر کار اورنگ آباد ہی میں قیام فرمایا[۵۲] اور رشد و ہدایت کی وہ شمع روشن کی جس کے گرد شاہ و گدا پروانہ وار نثار ہوئے[۵۳]۔ اگر ایک طرف عوام کا ان کی خانقاہ میں ہجوم تھا تو دوسری طرف نواب غازی الدین بہادر اور نظام الملک آصف جاہ اول ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت و نیاز پیش کرتے تھے۔

---

۵۱ برہان پور کے تاریخی حالات کے لئے ملاحظہ ہو مخزن اگست ۱۹۰۶ء مضمون مولانا سعید احمد مارہروی۔ (ص ۳۴ - ۲۸)

۵۲ شیخ نظام الدین صاحب نے ۱۱۴۲ھ میں بمقام اورنگ آباد وصال فرمایا وہیں آپ کا مزار پر انوار ہے۔

۵۳ "نقل است از مناقب فخریہ کہ حضرت شیخ نظام الدین را از صد ہزار مرید زیادہ بود و اکثر مریدانش صاحب حال و اہل کمال اند" تکملہ سیر الاولیا ص ۹۴۔

شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کی تبلیغی مساعی

شاہ کلیم اللہ صاحبؒ کی تبلیغی مساعی کا اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے۔ ان مکتوبات میں ایک بے قرار اور بے چین قلب کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ہر خط میں وہ اپنے مرید کو اعلائے کلمۃ الحق کی ہدایت کرتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں۔

(۱) "جان و مال خود را صرف ایں کار کنید" (م ۲۱، ص ۲۶)

(۲) "فیضِ دینی و دنیوی بہ عالم رسانند و ہمہ حلاوت و عیش خود را فدائے آں بندگان باید کرد" (م ۷۵، ص ۶۰)

ان کی حساس روح اسلام کو ہندوستان میں انتہائی ترقی پذیر دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کا احساسِ ملی اسلام کا پیغام ہر کان تک پہنچانے کے لئے مضطرب تھا۔ بار بار مریدوں سے کہتے ہیں "دراں کوشید کہ صورتِ اسلام وسیع گردد و ذاکرین کثیر" (م ۷۶، ص ۶۰)

وہ خطوط میں اور باتیں بھی لکھتے ہیں لیکن جس کو بار بار دہراتے ہیں وہ یہ ہی ہے (۱) "بہرحال در اعلائے کلمۃ الحق کوشید و از مشرق تا مغرب ہمہ اسلام حقیقی بر کنید" (م ۶ ص ۱۱) (۲) "متوجہ اعلاء کلمۃ الحق باشند واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون" (م ۸۰ ص ۶۲)

ان کے قلب مضطر کی آواز صرف ایک جملہ میں پوشیدہ تھی "از مشرق تا مغرب ہمہ اسلام حقیقی بر کنید"۔ اسی دُھن میں ان کے شب و روز گزرتے تھے۔ وہ دہلی میں تے لیکن دکن کا نظامِ تبلیغ و اصلاح ان کی ہدایتوں کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ وہ ناسازگار حالات کو دیکھتے تھے لیکن اللہ پر ان کا بھروسہ تھا اور لا تقنطوا پر ان کا ایمان۔

امراء کو مادیت پسند دیکھ کر ان کا قلب پریشان ہونے لگتا تھا اور گھبرا گھبرا کر کہتے تھے۔

(۱) "دراں باید کوشید کہ اکثر اہلِ دول دل از دنیائے دوں کندہ میل بطرف عقبیٰ پیدا کنند" (م ۷۵، ص ۶۰)

(۲) قصد کنید کہ مخلصاں شما از سیر دنیا پرستی بر خیزند" (م ۶۱ ص ۵۳)

(۳) بر دل بندگان خدا محبتِ دنیا سرد گردانند" (م ۱۳ ص ۱۹)

جب عیش پرستی اور نفس پروری میں عام مسلمانوں کو گرفتار دیکھتے ہیں تو چلا چلا کر کہتے ہیں "اے دوست دنیا جائے نفس پروری و تن آسانی نیست" (م ۷۴ ص ۵۹)

تبلیغِ دین و دعوتِ حق کے ثواب اور فضیلت کو ان پُرزور الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ "واقرب عند اللہ و رسولہ آں کسے روز رستخیز است کہ در افشائے نور باطن ایمان ساعی است" (م ۴، ص ۵۹)

جذبۂ اعلاءِ کلمۃ الحق کا اتنا غلبہ ہے کہ شیخ نظام الدین کو اپنے ایک مرید کے منصبِ شاہی ملنے کی اطلاع دیتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ اپنے اصل نصب العین کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں "اے برادر منصب ما و شما فقر است کوشش کنید در اعلاءِ کلمۃ اللہ" (م ۵۴ ص ۷۹)

ان کی تمنا تھی کہ ان کے تمام مرید اشاعتِ اسلام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور وہ خلافت اسی مقصد کے پیش نظر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے ایک شخص کے لئے خلافت کی سفارش کی تو جواب میں ارشاد ہوا "جب تک اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے کمرِ ہمت نہ باندھی جائے خلافت سے کیا فائدہ" (م ۳۹، ص ۳۹)

بار بار ان کی زبان سے یہ ہی نکلتا ہے کہ تبلیغِ اسلام اور احیائے دین کی کوشش کرو۔ یہ ہی مسلک ہمارے بزرگوں کا رہا ہے۔ اس میں کوتاہی اچھی نہیں۔ اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں "ہمیشہ در اعلائے کلمۃ اللہ کہ از پیران من و عن رسیدہ کوشش نمایند" (م ۱۱۵، ص ۸۸)

احیائے دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی فضیلت کو وہ یہ کہکر ذہن نشین کراتے ہیں کہ یہ موجب رضائے الٰہی ہے اور انبیاء کا خصوصی کام ہے۔ "دریں باب جہاد نمایند و ایں کار سہل نہ انگارند و منتشرا در معمورۂ عالم سازند کہ رضائے الٰہی دریں است و اصلاح مفاسدۂ فرزندانِ آدم نمایند کہ انبیاء مبعوث برائے ہمیں کار بودہ اند"[۱] (م ۱۱۵، ص ۸۸)

ایک مکتوب میں اس کو "کار بزرگ" کہتے ہیں "شمارا کار بزرگ ایصال فیض و اعلاءِ کلمۃ اللہ فرمودہ ام ہم دریں کار گرم آمدید" (م ۲۸، ص ۳۱)

---

[۱] حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحؒ نے تبلیغ و اصلاح کا جو مرکز بستی نظام الدینؒ میں بنایا ہے اور اس کا کام جس نہج پر ہو رہا ہے اس میں بھی اسی تحریک کی جھلک نظر آتی ہے۔ مولانا مرحوم کی دعوت و تحریک کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ تبلیغ کا کام انبیاء کا خصوصی کام ہے۔ اور نبوت اگرچہ ختم ہو چکی لیکن کارِ نبوت ختم نہیں ہوا۔

شاہ صاحب کے اس اصرار پیہم اور کوشش مسلسل نے مریدوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ شیخ نظام الدین صاحب نے اپنے پیرو مرشد کی ہدایات پر عمل کیا اور بہت جلد کامیابی حاصل کی۔ جب شیخ نظام الدین کا ایک مرید نور محمد ان کا خط لیکر دہلی آیا تو شاہ کلیم اللہ صاحب نے سب کیفیت دریافت فرمائی۔ شیخ نظام الدین کی تبلیغی مساعی کو بنظر استحسان دیکھا اور اس مضمون کا ایک خط بھیجا "مطالعہ فرمایند امروزکہ ۶ محرم الحرام سنہ ۱۱۱۳ مرقوم می گردد کہ میاں نور محمد خادم شما کہ از اولاد حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا کتابت شما آوردہ اند...... الحمدللہ والمنۃ در اعلاء کلمۃ اللہ سعی موفور مبذول است۔ مرقوم بود کہ درحین وضع اعلاء بیشتر است بہ نسبت آں وضع۔ اے برادر بہر حال مقصود ایصال فیض فقر محمدی است بعالمیان بہر وضع کہ بیشتر ایں کار سر انجام یابد باید کرد" (م ۴۸ ص ۴۶)

شیخ نظام الدین صاحب کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدۂ اسلام ہو گئے بعض اپنے قبیلہ کے ڈر سے اپنے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "و دیگر مرقوم بود بہیہ دیارام و ہندوہائے دیگر بسیار در ربقہ اسلام درآمدہ اند اما با مردم قبیلہ پوشیدہ می مانند" (م ۲۱ ص ۲۵)

ساتھ ہی ساتھ اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مسلمان ہونے کو مخفی رکھے مبادا بعد موت اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے

"برادر من اہتمام نمایند کہ آہستہ آہستہ ایں امر جلیل از بطون بظہور انجامد کہ موت درعقب است مبادا احکام اسلام بعد از رحلت بجا نیارند و مسلمانان حقیقت را بسوزانند، دیارام اگر خطے می نویسد خطے نوشتہ خواہد شد" (م ۲۱ ص ۲۵)

اس مکتوب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کی تبلیغی مساعی کس حد تک دکن میں کامیاب ہوئی تھیں۔ اس خط میں دیارام کا ذکر ہے۔ یہ شخص بھی ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن قبیلہ کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے خط سے پتہ چلتا ہے کہ دیارام کا اسلامی نام شاہ صاحب نے فیض اللہ رکھا تھا۔ "بہ دیارام یعنی شیخ فیض اللہ اگر کتابت

می نویسد جواب می نویسیم" (م ۴۲ ص ۱۸)

معلوم ہوتا ہے کہ دیارام نے اس خوف سے کہ کہیں اس کے مسلمان ہونے کا اظہار نہ ہوجائے خطوط بہت کم لکھے۔ شاہ کلیم اللہ صاحب ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"محبت اطوار خواجہ دیارام از یاد حق بہ آرام تمام باشند قبل ازیں نمیقہ ارسال ایں طرف نمودہ بودند۔ یکے از دوستاں شاہ نظام الحق والدین رسانید۔ وازیں طرف مکرر جواب رفتہ۔ قاصداں نامہ بر را چہ تواں کرد" (م ۱۰۸ ص ۸۴)

دیارام کو درود کی مواظبت اور چند کتب سلوک کے مطالعہ کی تاکید شیخ نظام الدین صاحب کے ذریعہ اس طرح فرماتے ہیں:۔

در جواب دیارام نوشتہ آمد کہ مواظبت بہ درود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسیار نمایند کہ سرمایہ سعادت ایں است دیگر مطالعہ کتب سلوک و تواریخ چوں نفحات و تذکرۃ الاولیا و رسائل حقائق چوں لمعات و شرح لمعات و لوائح و شرح آں در مطالعہ داشتہ باشند اما احدے از بیگانگاں مطلع نشود" (م ۶ ص ۱۲-۱۱)

شاہ صاحبؒ کا نظام تعلیم و تربیت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کے لئے ایک نہایت مکمل نظام قائم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ان تمام مریدوں کی جن کو تبلیغی و اصلاحی کام پر مامور کیا تھا نہایت سختی سے نگرانی کی۔ وہ ان سے بار بار معلوم کرتے رہتے تھے۔

"کجا تا بکجا ترقی کردہ اند" (م ۳۳، ص ۳۵)

وہ خود دہلی میں رہتے تھے لیکن دکن کا نظام تعلیم و تربیت ان کی زیر ہدایت کام کر رہا تھا معمولی معمولی معاملات پر مرکز سے ہدایات روانہ کرتے تھے۔ مریدوں کا حال یہ تھا کہ بغیر اُن کی اجازت کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔ ایک خط میں خود نظام الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔

"رحمت خدائے تعالیٰ بر شما باد کہ بے اجازت قدم برندارند کسیکہ بدولتے رسید ہمیں ادب رسید" (م ۵ ص ۹)

خطوط کے معاملہ میں نہایت باقاعدگی برتتے تھے۔ خط میں دیر ہوجاتی توشاق گذرتا انتظار میں رہتے اور لکھتے ہ۔

(۱) "درایصال ناجات تسامح نورزند المکتوب نصف الملاقات است" (م ۲۳ ص ۲۸)

(۲) "عذر نوشتن کتابت از طرف ما اگر باشد مقبول است و مسموع واز طرف شما نامقبول ونامسموع" (م ۳۳ ص ۳۵)

(۳) "مکتوب محبت اسلوب مدتہا است کہ نرسید چشم نگراں است" (م ۶۴ ص ۵۴)

(۴) "مکتوب پے در پے نوشتہ باشند چشم انتظار در رہ مکتوب شما است" (م ۷۷ ص ۶۰)

(۵) "مکتوب شما مدتے است کہ دیدہ راسرور نہ بخشیدہ" (م ۷۶ ص ۶۰)

وہ چاہتے تھے کہ مرید جو خط بھیجیں وہ محض رسمی نہ ہوں بلکہ اس میں اپنے پورے حالات وواردات اور تقسیم اوقات کی بابت لکھیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن کن مشاغل میں ان کا وقت صرف ہوتا ہے اور اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کس حد تک سرگرم ہیں شاہ صاحب کے نزدیک ان کے اصلاحی نظام کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ مریدوں کی پوری نگرانی کی جائے۔ اور اُن کی خلوت وجلوت کا پورا پروگرام مرتب کیا جائے۔ وہ ضبط اوقات اور پابندی اصول کا درس دیتے رہتے تھے۔ اکثر مکتوبات میں اپنے مریدوں سے نظامِ اوقات دریافت فرماتے ہیں۔ اور معلوم ہونے پر اپنے اطمینان کا اظہار فرماتے ہیں۔

(۱) "تقسیم اوقات و توزیع مراتب خلوت وجلوت ہمہ معلوم شد" (م ۹۳ ص ۷۱)

(۲) "تقسیم اوقات معلوم شد" (م ۶ ص ۱۱)

اگر کوئی خلیفہ اپنے پروگرام کے متعلق نہ لکھتا توشاہ صاحب خود دریافت فرماتے ۔

"اما خوب معلوم نشد کہ اوقات گرامی بکدام توزیع مصروف است آیا برنگ طالب علماں یا درویشاں یا نہ ایشاں ونہ ایشاں" (م ۱۵ ص ۲۰)

پابندی اوقات نہ کرنے والے کے متعلق صاف صاف لکھدیتے ہیں۔

"ضبط اوقات آنکہ ندارد خسر الدنیا والآخرۃ است" (م ۲۲ ص ۲۶)

سرگرمیِ کار اور مشغولیت کی برابر تاکید رہتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"شما در کارِ خود سرگرم تر باشید کہ ہیچ کس بر شما شائق نتواند بود مگر آنکہ کار شما بکند" (م ۶۴ ص ۵۴)

بعض اوقات خود بھی شاہ صاحب اپنے مریدوں کے لئے نظامِ اوقات متعین فرماتے تھے۔ ایک خط میں فجر کی نماز کے بعد سے لے کر رات تک کا انفرادی اور نفلی پروگرام بتانے کے بعد اجتماعی پروگرام کی طرف اس طرح متوجہ کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔ شریعت را احکام باید نمود ۔۔۔۔۔ یاران اہلِ علم را درسِ تفسیر و حدیث و عبادات و فقہ درمیان ظہر و عصر و بعد از صبح بگوئید و اہلِ شوق کہ اندکے بعلم آشنا باشد درس لمعات و لوائح و امثال آں بہر حال مراتب تمکین بہ از مراتب تلوین است"۔ (م ۹۹، ص ۷۹-۸۰)

ذاتی مطالعہ کے لئے حدیث و فقہ، اخلاق و تصوف، سیر و تاریخ کی کتابوں کی ہدایت فرماتے ہیں۔

(۱) "بمطالعہ کتب حدیث و فقہ و سلوک چوں احیا و کیمیا و امثال ذلک چوں تواریخ مشائخ پیشین بہتر است" (م ۷، ص ۱۴)

(۲) "درس نسخہائے سلوک و سیر مشائخ اللہ مطالعہ باید کرد۔ خاصہ تذکرۃ الاولیا شیخ فریدالدین عطار و نفحات الانس مولانا جامی و منازل السائرین و رشحات نقشبندیہ و امثال ذلک باقی ماند" (م ۹۹ ص ۷۹)

شاہ صاحب اپنے مریدوں کے تعلقات کی نگرانی بھی فرماتے تھے۔ اگر بربنائے بشریت کوئی جھگڑا یا بدمزگی آپس میں پیدا ہو جاتی تو اس کو جلد سے جلد رفع کرنے کی کوشش اور عفو و درگذر کی ہدایت فرماتے تھے تاکہ نظام میں خلل واقع نہ ہونے پائے۔

(۱) "حقائق میاں اسد اللہ و میاں ضیاء اللہ بہ تفصیل معلوم شد شما ہرگز مخالفت باہر دو عزیز

نخواہید کرد و شما متوجہ کار خود باشید" (م ۲۰ ص ۲۴-۲۳)

(۲) "میاں اسد اللہ و میاں ضیاء الدین برادران شما اند باید کہ بایک دیگر فانی باشند واگر از یکے خلاف مرضی امرے شد دیگرے از کرم عفو نماید و بہ محبت زندگانی کنند" (م ۲۱ ص ۲۶-۲۵)

شاہ صاحبؒ نے ایک مکتوب میں جس کو خود وہ "دستور العمل" قرار دیتے ہیں اپنے تعلیمی اصول و ضوابط کا پورا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ اس دستور العمل کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

"اے برادر ایں نامہ مرا دستور العمل خود شناسید و در حکم آں احتیاط نمائید کہ فرد گذاشت را دراں مدخل نباشد و حداوسط از دل بروں نرود" (م ۹۶ ص ۷۳)

اس کے بعد حسب ذیل اصول بیان فرماتے ہیں:۔

(۱) ایصال[۱] خیر کو مقصود قرار دیا جائے۔

(۲) ایصال خیر میں اخلاص اور تصحیح نیت سے کام لیا جائے:۔ (م ۹۶ ص ۷۳)

(۳) ہجوم خلائق مستوجب شکر الٰہی ہے۔ (ص ۷۴)

(۴) اگر فتوحات ملیں تو آپس میں تقسیم کر دیا جائے ورنہ اس دن کو غنیمت سمجھا جائے جس دن فتوحات میسر نہ آئیں۔

"انچہ مفتوح برسد باں فقیرا ہمراہ صرف نمایند و روزیکہ نرسد آں روز را غنیمت شمارید کہ در فقر و فاقہ تاثیرے عظیم است فہم من فہم" (ص ۷۴)

(۵) مسئلہ وحدت الوجود کو ہر کس و ناکس کے سامنے نہ چھیڑا جائے[۵۳] بلکہ استعداد و اہلیت

---

[۱] "خیر عبارت از فنا ء ماسویٰ از جمیع المسالک الی بقا بحق تعالیٰ و قیام المسالک فی جمع محبۃ اللہ ایں معنی باید کہ ہمیشہ در نظر باشد و شرح ایں را دریں نامہ نتوانم" (م ۹۶ ص ۷۳)

[۵۳] یہ نہایت اہم ہدایت تھی۔ متقدمین صوفیاء سلسلہ چشتیہ نے بھی اپنا اصول یہی رکھا تھا گو اس مسئلہ پر ان کا ایمان تھا لیکن جاہل عوام میں اس کا پھیلانا وہ مضر سمجھتے تھے۔ حقیقت میں یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو سمجھنے کے لئے بڑی علمی قابلیت اور صلاحیت درکار ہے۔ اگر جاہلوں میں اس مسئلہ کو بیان کیا جائے تو اس کا نتیجہ گمراہی اور بے دینی ہوتا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

دیکھنے کے بعد حسب موقع اس پر بحث کی جائے۔

"مسئلہ وحدتِ وجود را پیش ہر آشنا و بیگانہ نخواہید بر زبان آورد" (ص ۴۷)

(۶) ہندو اور مسلمان دونوں سے تعلقات رکھے جائیں تاکہ غیر مسلم تعلیماتِ اسلام سے متاثر ہوں اور

"ذکر بخاصیت خود او را بربقۂ اسلام خواہد کشید" (ص ۴۷)

(۷) مریدوں میں ادب اور احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے چونکہ

"صحبت انبیاء با اصحاب چناں بود" (ص ۴۷)

(۸) اپنے مریدین سے "احیائے سنت" اور "اماتتِ بدعت" کے لئے پوری کوششیں کرائی جائیں۔

"ہر کہ از یاران خود اذن دہند مبالغہ در احیائے سنت و اماتتِ بدعت خواہد بود (ص ۷۵)

اشاعت سلسلہ کے لئے ہدایات | شاہ صاحب اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ جگہ جگہ مریدین کو حکم ہوتا ہے۔

(۱) "سعی در شیوع سلسلہ نمایند" (م ۱۳، ص ۱۹)

(۲) جہد بلیغ نمایند کہ مردم در سلک شما داخل شوند و بہ مرتبہ فقر رسند" (م ۴۷ ص ۶۶)

ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے۔

"شما در اصلاح دل محجوباں بکوشید کہ بعز وصال و قرب رسند و بریاضت و مجاہدہ و عشق و بے خودی مریداں و طالباں را تربیت کنید کہ تا قیام قیامت برائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انگریزی کی ایک مثل ہے "ایک شخص کی خوراک دوسرے کا زہر ہے" صوفیاء کے لئے مسئلہ وحدت الوجود پر اعتقاد روحانی ترقی کے لئے از حد ضروری تھا۔ لیکن جاہلوں میں اس کا اظہار کفر و الحاد پیدا کرنے کا پیش خیمہ۔ جس زمانہ میں یہ عقیدہ جاہل لوگوں میں پھیلا ہے گمراہی اور بے دینی عام ہو گئی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس مسئلہ کی مخالفت اس لئے بھی کی تھی کہ یہ عوام میں بے حد عام ہو گیا تھا۔
شاہ کلیم اللہ صاحب نے یہ ہدایت فرما کر گمراہی کا ایک زبردست دروازہ بند کر دیا تھا۔

ما و شما فواتح پیہم و متصل برسد" (م ۱۱، ص ۱۷- نیز م ۴، ص ۹)

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین صاحب نے اپنے پیر و مرشد سے فتوحات قبول کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ شیخ نے اشاعتِ سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا کہ اگر فتوحات سے کام میں رکاوٹ واقع ہوتی ہو تو قبول نہ کرنا بہتر ہے ورنہ قبول کر لینی چاہیے۔

"اے درویش خدائے تعالیٰ شمارا عقل معاش و عقل معاد ہر دو دادہ است۔ آں کنید کہ دراں اجرائے سلسلہ باشد، ما گرفتن و ناگرفتن نمی دانیم۔ اگر رونق سلسلہ از عدم قبول است عدم قبول بہتر از قبول" (م ۱۳ ص ۱۹)

ساتھ ہی ساتھ صوفیا رمتقدمین کے فتوحات قبول کرنے کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"درویشان ماضی کہ قبول بعضے فتوحات کردہ اند اغلب کہ برائے استمالت خاطر معتقدان کردہ اند والا بضرورت خود کم کسے قبول کردہ باشد" (م ۱۳ ص ۱۹)

مرید کی اشاعت سلسلہ کی کوششوں کا جب علم ہوتا ہے تو اظہار مسرت کرتے ہیں۔ دعائیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ارواحِ مشائخ اس کام سے خوش ہوتی ہیں۔ اگر شیخ کی اولاد کو خزانہ بھی دے دیا جائے تو شیخ کی روح اس قدر خوش نہیں ہوتی جتنی احیار سلسلہ کی کوششوں سے خوش ہوتی ہے۔

"پس رحمت خدائے تعالیٰ بر شما باد کہ ایں سلسلہ را جاری کردید شکر اللہ سعیکم و ایں ہمہ افتادگان حضیض غفلت را باوج حضور رسانید یدو ارواح مشائخ باخود خوشنود کردید بالفرض اگر کسے گنجے بہ اولاد شیخ بہ بخشد آنقدر رضامندی جناب ایشاں دراں نباشد کہ در احیار سلسلہ ایشاں باشد۔ فقد بروکن من الشاکرین" (م ۴۴ ص ۵۴)

نظامِ خلافت | مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں خلافت کا نہایت مکمل اور مضبوط نظام تھا۔ ہر کس و ناکس کو خلافت نہیں دی جاتی تھی اس کے لئے چند اصول مقرر تھے جن کی پابندی

لازم تھی۔ خلافت میں احتیاط کی وجہ یہ بھی تھی کہ نااہل لوگوں کے ہاتھ میں یہ کام پہنچنے کی صورت میں گمراہی اور ضلالت پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ جس کو وہ جا بجا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ خلافت سے متعلق ان کے اصول یہ تھے۔

(۱) خلافت دینے کا مقصد اشاعتِ اسلام کے لئے جدوجہد ہے۔ (م ۲۹ ص ۳۹)

(۲) خلافت جس شخص کو دی جائے اس کے[۱] تفصیلی حالات مرکز کو لکھے جائیں تاکہ اس کی صلاحیت اور اہلیت کا اندازہ ہو سکے۔ (م ۱۸، ص ۲۲)

(۳) صرف اہلِ علم کو خلافت دی جائے[۲] اس لئے کہ

"در صحبت او ضلالت رواج نخواہد گرفت" (م ۴۷ ص ۴۵)

(۴) خلافت کی دو قسمیں کی جائیں۔ خلافت ربانی اور خلافت سلوک۔

"اول ہر کہ حیثیت فقر داشتہ باشد باید فرمود من غیر امتیاز بین ان یکون عالما او جاہلا۔ اما قسم ثانی کہ مثال بنولیسند و بر و مہر بکنند ایں قسم مخصوصاً با اہلِ علم دارند" (م ۹ ص ۱۶)

(۵) بیعت کرنے کے بعد فوراً اجازت بیعت نہ دی جائے۔ (م ۹۶ ص ۷۴)

عورتوں کی بیعت کے متعلق | شیخ نظام الدین صاحب کو دکن میں جو صورت حال پیش آتی تھی اس کے متعلق وہ اپنے پیر و مرشد سے ہدایت اور مشورہ طلب کرتے تھے چنانچہ جب عورتوں کو

---

[۱] شیخ نظام الدین صاحب نے ایک شخص محمد مرزا یار بیگ کو خلافت دی۔ شاہ صاحب نے خط لکھا

"محمد مرزا یار بیگ را خلافت دادید۔ خوب کردید۔ بیت

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس — کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس (م ۶ ص ۱۲)

اُن کی اہلیت کے متعلق رائے اس طرح قائم کی تھی۔

"از رقعہ ایشاں کہ بفقیر نوشتہ بودند۔ معنی عشق می ریخت" (م ۶ ص ۱۲)

[۲] مکتوبات میں جگہ جگہ اس کا اصرار ہے م ۴۴ ص ۴۳، م ۶۹ ص ۵۶، م ۵۲ ص ۵۸، م ۹۴ ص ۷۴۔

صوفیاء متقدمین کا بھی یہی اصول تھا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیا نے علم ہی کو ہمیشہ خلافت کا معیار قرار دیا۔ جب حضرت محبوب الہیٰ کے پاس خلافت کے لئے ۳۲ درخواستیں آئیں تو بیشتر آپ نے یہ کہہ کر مسترد فرما دیں "اس کام میں پہلا درجہ علم کا ہے" (سیر الاولیا ص ۱۹۶-۱۹۵)

سلسلہ میں داخل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو شیخ نظام الدین نے اپنے شیخ کو لکھا۔ جواب میں حکم ہوا کہ بیعت کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی خلوت سے بچا جائے اور براہِ راست ہاتھ میں ہاتھ دیکر بیعت نہ کیا جائے چونکہ مس اجنبیہ حرام ہے۔

"برادر من زنان را بیعت کنید اما با زنان جواناں خلوتہائے طویلہ کہ موجب فتنہ مردم بشود نکنند و در صحبت اولیٰ وقت بیعت دامنے بر دست پیچیدہ دست بر دست او دارند کہ مس اجنبیہ حرام است۔" (م ۲۱ ص ۲۵)

اس مشروط اجازت نامہ کی رو سے شاہ صاحب نے عورتوں کو بھی اصلاح باطن سے محروم نہ رکھا لیکن شیخ نظام الدین نے اس کے بعد بھی عورتوں کو داخل سلسلہ کرنے میں تامل کیا، اس پر آپ نے لکھا۔

"شما در بیعت کردن با عورات چرا اہمال می ورزید اگر جوان اند و اگر پیر اگر حسین اند و اگر قبیح ہمہ را بجائے محرمات پنداشتہ کلمہ حق بگوش ایشاں باید رسانید" (م ۴۵ ص ۳۷)

چنانچہ اکثر مکتوبات میں (م ۷۸ ص ۶۱، م ۸۰ ص ۶۲) میں یہی ہدایت ہوتی ہے کہ عورتوں کو سلسلہ میں داخل کرو۔ رشد و ہدایت کا جو دروازہ کھولا گیا ہے اس میں عورتوں کا داخلہ کیوں روکا جائے فیض عام ہونا چاہیئے اور ہر شخص کو مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہیئے۔ صرف اتنی احتیاط لازم ہے کہ ان کو محرمات سمجھا جائے۔

اتباع شریعت کی تلقین | صوفیا رکرام کے متعلق اکثر یہ غلط خیال کیا جاتا ہے کہ وہ احکام شریعت کی زیادہ پابندی نہیں کرتے تھے۔ یہ خیال جہل پر مبنی ہے اور حد درجہ غلط اور گمراہ کن ہے حضرات صوفیا رشریعت پر نہ صرف عمل کرتے تھے بلکہ روحانی ترقی کے لئے اسے ازبس ضروری تصور کرتے تھے۔ ان کا عقیدۂ راسخ یہ تھا کہ شریعت سے ہٹ کر روحانی ترقی کے لئے جو کوشش کی جائیگی وہ نقش برآب ثابت ہوگی۔ چنانچہ صوفیا رمتاخرین میں حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب نے بھی اس حقیقت کو بار بار دھرایا ہے۔ اور جادۂ شریعت پر چلنے کی تلقین فرمائی ہے جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) "بر نہج شریعت باید رفت" (م ۹۵ ص ۷۲)

(۲) "ظاہر را موافق شریعت تواند نگاہ داشت" (م ۱۰ ص ۱۷)

(۳) "ہمہ داخلان طریقت را تاکید نمایند کہ ظاہر شریعت آراستہ دارند و باطن بعشق مولیٰ پیراستہ سازند" (م ۱۲۹ ص ۹۵)

جو شریعت پر نہیں چلتا وہ گمراہ ہے اور طریقت و حقیقت کے منازل کبھی طے نہ کرسکے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"آنچہ در شریعت راسخ نیست ناقص است، بلکہ طریقت و حقیقت او معلوم کہ حقیقتے ندارد۔ مرد آں است کہ جامع باشد میاں شریعت و طریقت و حقیقت" (م ۹۵ ص ۷۲)

وہ شریعت کو معیار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی سے کسی شخص کی روحانی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اے برادر در تفاوت مراتب فقرا اگر امروز خواہی کہ دریابی بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار است عیارِ فقر بر شریعت روشن می گردد" (م ۹۵ ص ۷۲)

اسی مکتوب میں آگے چل کر وہ اس طرح سمجھاتے ہیں کہ اگر کسی شیخ کے دس صاحب کمال مرید ہوں اور ہر ایک اپنی علیحدہ وضع رکھتا ہو اور شیخ کو ہر ایک کے متعلق حسن ظن ہو اور عوام بھی اچھا سمجھتے ہوں اور تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ کون شخص ان میں قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا تو یہ دیکھو کہ ان دس آدمیوں میں سے کون شریعت کے ساتھ آراستہ ہے اگر خدا نے چاہا تو قیامت کے دن یہی شخص سب سے بلند مرتبہ ہوگا۔ (م ۹۵ ص ۷۲)

شریعت، طریقت اور حقیقت کا باہمی تعلق اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"بنیاد حقیقت طریقت است، و بنیاد طریقت شریعت آنکہ در چشم او جمال شریعت بیش بود طریقت و حقیقت اتم و اکمل بود، علامت وصول بدرجہ حقیقت ایں است کہ روز بروز آنا فانا سالک را در شریعت قدم راسخ گردد" (م ۱۱۰ ص ۸۵)

آگے چل کر وہ اُن صوفیاء خام کی مذمت کرتے ہیں جنھوں نے شریعت کو ترک کر دیا اور نہایت سختی کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

"ایں ملحداں کہ شریعت را از دست دادہ کلام لاطائل ملحدانہ بسبب گدائی و لقمۂ چرب نمودہ بہ متشرعان طعنہ بے حقیقتی میزنند تعزیر کردنی اند کہ ہمہ توحید ایشان بے معنی است و بے لطفی قالی است بے حال زنہار در صحبت ہم چنیں حمقا نخواہند نشست" (م ۱۰۱ ص ۸۵)

اصلاح دولت منداں شیخ نظام الدین صاحب جب دکن بھیجے گئے تو بہت جلد آپ مرجع خلائق بن گئے۔ امیر و غریب سب آپ کی خانقاہ میں حاضر ہونے لگے۔ جب دولتمندوں کا ہجوم بڑھا تو آپ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ متواتر اس ماحول سے دل برداشتگی اور تنگی کا اظہار کرتے تھے لیکن شاہ کلیم اللہ صاحب ہر بار ان کو لکھتے تھے کہ ان لوگوں کو بھی نظر انداز نہ کرو۔ احیائے ملت اور ترویج سلسلہ کے لئے جب کوششیں ہوں گی تو سوسائٹی کے کسی حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ دولت مندوں کو متاثر کرنا بعض دیگر مصلحتوں کی بنا پر بھی ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مقصود از دخول اہل دول نہ آں است کہ ایشاں طے مراتب درویشی کنند۔۔۔ بلکہ مقصود آں است کہ بسبب دخول ایں مردم اکثر مردم دیگر داخل می شوند[۲] و در نظر عوام دخول ایں مردم اعتبار تمام دارد" (م ۶ ص ۱۲)

پیر و مرشد کی اس ہدایت کے بعد شیخ نظام الدین نے دولت مندوں سے زیادہ پرہیز نہ کیا۔ بلکہ ان کی اصلاح باطن کے لئے کوشاں ہوئے۔ جب نتیجہ کوششوں کے برابر نہ پایا تو

---

[۱] شاہ کلیم اللہ صاحب کے بعد اس ہی قسم کے گمراہ کن صوفیوں کی تعداد بڑھ گئی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ یہ لکھنے کے لئے مجبور ہو گئے ——— "وصیت دیگر آں است کہ دست در دست مشائخ ایں زماں ہرگز نباید داد و بیعت ایشاں نباید کرد" وصیت نامہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ص ۳ مطبع الرحمٰن سید حیات علی شاہ جہاں آباد ۱۲۶۸ھ

[۲] ایک دوسرے مکتوب میں دولتمندوں کے متعلق لکھتے ہیں "اینہا آلۂ رجوع خواص و عوام اند" (م ۱۸ ص ۲۲)

آزردہ خاطر ہوئے اور مایوس ہوکر شیخ کو لکھا کہ میں دولت مندوں کی صحبت سے تنگ آگیا ہوں میری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں۔ چاہتا ہوں کہ کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ پیرو مرشد نے جواب میں لکھا

"اے جان برادر معلوم باد کہ صحبت دولت منداں کسے راکہ بالطبع خوش می آید از فرقۂ فقرا نیست زیراکہ تفاوت تمام است درمیان اوضاع غنی وفقیر ہیچ میدانید کہ شما چندیں آزار از اوضاع ایشاں چرا می کشید می خواہید کہ نفس پروراں مانند فقرا، ومساکین بذوقِ ذکر وفکر ومراقبہ وتلاوتِ قرآن و اوراد و عمارتِ اوقات وسائر حسنات چوں ذوق وشوق وسماع ووجد مشرف گردند۔ ... زینہار ازیں فرعونیاں توقع خصائل موسیٰ نداشتہ باشند غنیمت نمیدانید کہ ایشاں بآں جرأت از مرتبہ خود افتادہ گاہ باشد کہ بشما بیعت کنند ما در سلف و خلف درویشے نہ شنیدیم وندیدیم کہ قاطبۂ اہل دول بردست ایشان واز صحبت ایشاں بفلاح فقرا رسیدہ باشند" (م ۷، ص ۱۳-۱۲)

شاہ صاحب نے سمجھایا کہ ان دولت مندوں سے زیادہ امیدیں وابستہ کرنی ٹھیک نہیں ان کو تم فقیر یا درویش نہ بنا سکو گے۔ ایک مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے۔

"بہ یقین شناسید کہ دولت منداں ہرگز در ہیچ عصرے مرید ہیچ شیخے نشدہ اند اگر شدہ دولت مند نماندہ ہمہ را گذاشتہ لنگ بستہ اند" (م ۲۷ ص ۳۰)

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کو ذکر واشغال سے کیا تعلق۔ یہ تو صرف منصب ووجاہت کے لئے تعویذ گنڈے کی فکر میں رہتے ہیں۔

"یقین دانید کہ دولت منداں ذکر واشغال را عبث کاری وہرزہ کاری می شمارند۔ دولت منداں را تعویذے برائے منصب جاہ یا اسمے برائے زیادتی دولت وبکنت از جفر وجامع امام جعفر صادق رضہ باید گفت کہ ایشاں بغایت رضامند ازیں ہستند" (م ۴۵ ص ۴۴)

شیخ نظام الدین ان لوگوں میں مسلسل کام کرتے رہے۔ آخر کار اس طبقہ کے کچھ لوگ اُن کے مرید بھی ہو گئے۔ پیر و مرشد کو معلوم ہوا تو لکھا :-

"معلوم شد کہ ازیں امیراں و منصب داراں کہ شما بیعت نمودہ اند پائے تلقین ذکر و شجرہ درمیان بیا شد یا نہ ایں را مفصل خواہند نگاشت" (م ۱۴ ص ۲۰ - ۱۹)

پھر شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو بادشاہوں، امراء اور رؤسا سے ارتباط کی نوعیت سے بھی خبردار کرنا مناسب سمجھا۔ لکھا کہ مقصد یہ نہیں کہ تم ان سے بے حد تعلقات پیدا کرلو۔ ایسا کرنے سے کام میں خلل واقع ہوتا ہے اور روحانی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ شناسائی کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ اگر خط لکھنا ہو تو بابا فریدؒ کی طرح :-

" وسفارش بایں نمط مستحسن است کہ اگر مصلحت باشد بکنند والا فلا حضرت گنج شکر قدس سرہ بباد شاہ زمانہ نوشتہ بودند عرضت حاجتی الی اللہ ثم الیک فان اعطیت فاللہ ہو المعطی وانت مشکور وان منعت فاللہ ہو المانع وانت معذور والسلام[1]" (م ۶ ص ۱۲)

شاہ صاحب نے بابا فریدؒ کے اس مکتوب کو نقل فرما کر بادشاہوں اور امراء سے تعلقات کی اصل نوعیت بتادی کہ کس درجہ خودداری اور بے تعلقی کے ساتھ ان لوگوں سے پیش آنا چاہئے تملق، خوشامد اور درباداری سے فطرتِ صوفی ابا کرتی ہے اس لئے بار بار ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) ملاقات سلاطین کہ بردر درویش آیند روا باشد اما بر در آنہا نباید رفت۔ (م ۴۴ ص ۴۳)

(۲) بر در ملوک نباید رفت و آئندہ ہر قسم کہ باشد اورا منع از آمدن نباید کرد" (م ۷۵ ص ۶۰)

(۳) درویش را باید کہ اختلاط بباد شاہاں نماید و بخانہ اہل دول طواف ننماید کہ اختلاط ملوک رونق ایمان می برد" (م ۶۵ ص ۵۵)

---

[1] یہ خط حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے سلطان بلبن کے نام لکھا تھا۔ سیر الاولیا میں یہ خط موجود ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اخبار الاخیار۔

چنانچہ شیخ نظام الدین صاحب نے ان دولت مندوں سے زیادہ اختلاط نہ کیا۔ ایک مرتبہ اعظم شاہ نے ان کی خدمت میں قابِ طعام بھیجی۔ تو اس کو قبول نہ کیا۔ پیر و مرشد نے خط لکھا۔

"برادرِ من آنچہ شما کردید خوب کردید۔ فقیر کہ از دولت منداں چیزے قبول می کند باعث تالیف ایشاں می گردد و در عدم قبول وحشت می افزاید سلف صالحین ہر دو طریق ورزیدہ اند" (م ۶ ص ۱۰)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ قبول و عدم قبول دونوں خدا کے لئے ہونے چاہئیں۔ اس میں اپنا نفس شامل نہیں ہونا چاہئے۔

"ہرچہ باشد برائے خدائے تعالیٰ باشد قبول و رد اگر برائے خدا است محمود است والا مذموم۔۔۔ آں کنید کہ دراں مرضیِ خدائے تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشد" (م ۶ ص ۱۱)

بہت لوگوں نے کوشش کی، خود سلطانِ وقت نے بلایا لیکن شاہ نظام الدین صاحب نے دربار میں جانا پسند نہ کیا۔

(۱) مرقوم بود کہ مردم بجد اند با بادشاہ ملاقات کنید بلکہ فلاں شیخ جیو کہ بجد اند کہ من تقریب می کنم ملاقات بکنید۔ اے برادر ملاقات بادشاہ ہیچ نیست۔ آخر خفیف می شود درویش۔ کہ بادشاہ تا امروز ہزار درویش را دیدہ باشد اما اعتقادے و اخلاصے بہ ہیچ یکے پیدا نہ کرد" (م ۲۴ ص ۲۸)

(۲) "مفاوضہ شما کہ در و برخے از ذکر مراودت متعلقان سلطان وقت و طلب ملاقات سلطان بود رسید۔ خوب کردید کہ قبول ایں معنی نہ کردید کہ ہمیں طلب سلاطین دلیل رعونیت و جباری است اگر در طبیعت ایشاں شکستگی و فدویت فقرا باشد ابرام بہ سلطانیت نکنند بلکہ خود از سر قدم ساختہ بخدمت شتابند تا ممدوح جناب صمدیت کہ نعم الامیر علی باب الفقیر باشند" (م ۲۴ ص ۴۵)

(۳) "قبل ازیں نوشتن در جواب مکاتبے کہ دراں مذکور اشتیاق خلیفۂ وقت بود رسید

مکرر آنکہ خوب کردید کہ نہ رفتید" (م ۹۴ ص ۴۷)

(۴) "قبل ازیں نوشتہ بودید کہ یاراں ملاقات بادشاہ می خواہند۔ اما ایں معنی قبول خاطر نیست . . . . زنہار قصد ایں امور کہ موجب اہانت خرقہ درویشاں است نکنند" (م ۵۹ ص ۵۲)

سماع | چشتیہ سلسلہ میں سماع کا ہمیشہ رواج رہا ہے۔ مشائخِ چشت اس کو "روحانی غذا" سے تعبیر کرتے تھے اور باوجود علماءِ ظاہر کی مخالفت کے انھوں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا لیکن اس ضمن میں اُن کے چند نہایت سخت اصول اور قواعد تھے جن کی پابندی لازمی طور سے کی جاتی تھی۔ ہر کس وناکس محفلِ سماع میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ قواعد کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار محفلِ سماع میں حضرت امیر خسروؒ نے ہاتھ اونچے کر کے رقص کرنا شروع کر دیا۔ سلطان المشائخ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا تمہارا تعلق دنیا سے ہے تمہیں اس کی اجازت نہیں۔"[1]

رفتہ رفتہ صوفیاء نے ان قواعد وضوابط کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ محفلِ سماع ہوتی تھی لیکن وہ روح اور جذبہ غائب تھا جس کے بغیر صوفیاءِ متقدمین اس کو جائز بھی نہیں سمجھتے تھے شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے جب یہ حال دیکھا تو سماع کو کم کرنے کی کوشش کی، فرماتے ہیں۔

"امروز قدرراگ مشائخ نمی شناسند و آداب را رعایت نمی کنند" (م ۱۰۵ ص ۸۳)

وہ اس کو "ہائے ہوے سماع" کہتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو کم کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

"اے برادر کثرتِ سماع ہم خوب ندارم بلکہ تعین ہر روز ہم نیامدہ" (م ۷ ص ۱۴)

وہ ہدایت کرتے تھے کہ سماع کی بجائے مراقبہ میں وقت صرف کیا جائے۔

"حلقہ مراقبہ وسیع از حلقہ سماع باید کرد" (م ۹۹ ص ۷۸)

اکثر مکتوبات میں (م ۱۳، م ۹۷، م ۱۰۳، م ۱۲) میں مراقبہ ہی کی ہدایت ہے وہ زمانہ کی حالت کو دیکھ رہے تھے اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں سماع کی شکل مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔ فی نفسہ وہ

---

[1] سیر الاولیا ص ۵۰۶۔ آج ہندوستان میں جس قسم کا سماع جاری ہے اس کا بعید ی تعلق بھی اس سماع سے نہیں جو صوفیاءِ متقدمین میں رائج تھا۔

اس کے مخالف نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات میں اپنے پیرو مرشد حضرت یحییٰ مدنی کا وہ خط نقل کیا ہے جو انھوں نے اورنگ زیب کے نام سماع کے متعلق لکھا تھا۔

"از جانب شیخ یحییٰ سلام برسد از آنجا کہ سماع قوت صالحانست منع کردن راہم وجہے ندارد۔ والسلام"۔ (م ۱۰۳ ص ۸۲)

لیکن حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ اس معاملہ میں سختی سے کام لیں۔ خود وہ نہایت سخت اصول برتتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر مجلس سماع منعقد کرو تو۔

"مجلس سرود بطور ما می کنند" (م ۹۴ ص ۷۴)

یہ زمانہ تھا جب مشائخ نقشبند کے اثرات بہت پھیل رہے تھے۔ بادشاہوں پر ان کا اثر تھا۔ اور وہ ان کی رائے کی عزت کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے اس خیال سے کہ کہیں کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہو، اس امر کی کوشش کی کہ جہاں مشائخ نقشبند کا اثر ہو وہاں سماع کو بند رکھا جائے۔ ایک مرتبہ جب کہ بادشاہ دکن میں تھا مشائخ سرہند حج سے واپسی پر اس کے پاس پہنچے۔ شیخ کلیم اللہ صاحب کو معلوم ہوا تو مرید کو خط لکھا کہ اس زمانہ میں مجلس سماع کو موقوف رکھنا۔ بادشاہ کے ساتھ علمار سرہند ہیں۔

"تا ہیچان مخالفان نشود" (م ۹۴ ص ۷۴)

خاندان تیموریہ کے متعلق

سب جانتے ہیں کہ جہانگیر اور اس کے بعد کے سلاطین مغلیہ پر سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں کا بہت اثر تھا۔ اس کی ابتدار شیخ مجدد الف ثانی رح کے تجدیدی کارناموں سے ہوتی ہے۔ خواجہ محمد معصوم، شاہ سیف الدین اور دیگر بزرگان نقشبند کا جس قدر ان بادشاہوں پر اثر تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ شاہ کلیم اللہ صاحب نے اس کا ذکر بعض مکتوبات میں فرمایا ہے لیکن وہ ان اثرات کی ابتدا جہانگیر سے نہیں بلکہ تیمور سے بتاتے ہیں (۱)۔

(۱) "درایں زمانہ بادشاہ ہندوستان کہ از اولاد امیر تیمور اند بطریق حضرت نقشبندیہ بغایت آشنا اند۔ زیرا کہ امیر تیمور بحضرت خواجہ بہا الدین نقشبند ارادت تمام بود"۔ (م ۶ ص ۱۱، م ۹۹ ص ۷۵)

(۲) امروز طریقۂ نقشبندیہ بسبب آنکہ انقیا دوارند بسیار شائع است" (م ۲، ص ۵۷)

خاندان آصفیہ پر اثرات

جس زمانہ میں شیخ نظام الدین صاحب دکن بھیجے گئے تھے اس زمانہ میں نواب غازی الدین خاں وہاں موجود تھے۔ چنانچہ شیخ کے تقدس کا شہرہ سن کر انھوں نے شیخ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ شیخ نے اپنے بزرگوں کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جانے سے انکار کر دیا۔ پیر و مرشد کو جب معلوم ہوا تو خط لکھا۔

"مرقوم کہ غازی الدین خاں طلب ملاقات کرد۔ نرفتم خوب کردید کہ نرفتید اگر اورا فتادر خدمت فقرا بودے خودمی آمد و خود آرائی نمی کرد" (م ۳۵ ص ۳۶)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس انکار کے بعد بھی غازی الدین خاں نے اصرار کیا۔ پیر کو معلوم ہوا تو لکھا:۔

"اے درویش بدانکہ رفتن بخانہ دولت منداں یمن ندارد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ من رخصت ایں معنی نہ دادہ ام ونخواہم داد و اگر اورا نفس وشیطاں یاور نیست پس چرا بہ خدمت شمانمی آید۔ می دانند کہ پیش فقرا بادشاہاں رفتہ اند وسعادت دانستہ اند۔ غازی الدین خاں نوکراست از نوکران بادشاہ اگر احیاناً او بہ فقیر نوشت من اجازت نامہ نخواہم نوشت" (م ۸۹ ص ۶۷)

مکتوبات میں غازی الدین خاں اور شیخ نظام الدین کے متعلق اس سے زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ وہ بعد کو حاضر ہوئے اور اپنے عقیدت مندانہ جذبات کو برقرار رکھا۔

آصفیہ خاندان نے دو کتابیں "احسن الشمائل" اور "مناقب فخریہ" اس سلسلہ کے بزرگوں کے حالات میں لکھیں۔ مناقب فخریہ[1] سے پتہ چلتا ہے کہ غازی الدین خاں کے بعد بھی

[1] مناقب فخریہ کا ایک قلمی نسخہ مجھے بچھراؤں کے ایک صاحب ذوق بزرگ قاضی جمیل احمد صاحب کے کتب خانہ میں سرسری طور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

عقیدت مندی کا سلسلہ جاری رہا۔ میرا خیال ہے کہ نظام الملک آصف جاہ اول جن کی تعریف آزاد نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"امیرے باین جلالتِ شان میر مسند امارت قدم نگداشتہ اختر طالع این صاحب اقبال از آغاز عمر تا انجام بر مدارج ترقی صعود نمود . . سادات و علما و مشائخ دیار عرب و ماوراء النہر و خراسان و عجم و عراق و سند آوازہ قدردانی استماع یافتہ رو بدرگہِ آوردند" سلہ

شیخ نظام الدین کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہ نسخہ وہاں کے ایک پرانے رئیس مولوی ابراہیم علی صاحب نے ۱۹ ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ کو نقل کرایا تھا۔ مصنف مناقب فخریہ نے لکھا ہے:-

"جد مرحوم راقم عفی عنہ نواب نظام الملک آصف جاہ بعد شرف بیعت در خدمت آں ظل الٰہی گشت"

لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ مصنفِ کتاب کون ہے۔ تکملہ سیر الاولیا اور خزینۃ الاصفیا میں بھی مناقبِ فخریہ کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن مصنف کے نام میں ہر دو نے غلطی کی ہے۔

خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے۔

"نواب نظام الملک آصف جاہ کہ جد مرحوم نواب غازی الدین خاں مصنف مناقب فخریہ بود قبل از ہمہ مرید آں حضرت شد و کتاب احسن الشمائل در احوال شیخ تصنیف کرد" (جلد ا، ص ۴۹۷)

ظاہر ہے کہ اس میں چند در چند اغلاط موجود ہیں جو اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ تکملہ سیر الاولیا میں لکھا ہے۔

نواب مستطاب نظام الملک آصف جاہ جد امجد حضرت نواب صاحب نظام الملک غیاث الدین خاں بشرف بیعت در خدمت آں ظل الٰہی مستفید گردید" (ص ۹۵)

اس عبارت کی اغلاط بھی نمایاں ہیں۔ مناقب فخریہ کا مصنف یقیناً مولانا فخر الدین چشتی خلیفہ نظام الدین کا مرید ہے اب جس کو وہ جد مرحوم قرار دیتا ہے وہ سنین کے لحاظ سے غازی الدین خاں ہو سکتے ہیں لیکن وہ آصف جاہ نہیں۔ کوئی صاحب اگر مناقب فخریہ کے مصنف کی تعین فرما سکیں تو باعث مشکوری ہوگا۔

سلہ روضۃ الاولیا۔ آزاد بلگرامی۔

ذاتی حالات | مکتوبات سے شاہ صاحب کے ذاتی حالات، افکار ورجحانات کا پتہ چلتا ہے
ایک خط میں اپنی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"سہ فرزند وسہ دختر موجود اند۔ حامد بہ کتب سلوک مشغول است۔ محمد فضل اللہ دہ سالہ دوازدہ سیپارۂ قرآن حفظ کردہ، محمد احسان اللہ پنج سالہ بمکتب شدہ بخواندن ابجد مشغول است۔ اما سہ دختر یکے بخانہ محمد ہاشم دادیم بی بی رابعہ نام[1] دارد ودیگر بی بی فخر النسا برادرزادۂ خود دادیم، سیوم زینب بی بی مشہور بہ بی بی مصری چہاردہ سالہ است تاحال جائے منسوب نشدہ" (م ۱۲۵ ص ۹۳)

ایک پہلے مکتوب میں جو حامد سعید کے بچپن میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح ان کی شکایت کرتے ہیں:۔

"فرزند حامد سعید کہ دریں پریشانی عطا شدہ دہ سالہ است چنداں دل بخواندن نمی دہد بہزار محنت کتاب منشعب درصرف می خواند" (م ۸ ص ۱۶)

شیخ محمد ہاشم کا حال ایک مکتوب میں اپنے مرید کو لکھتے ہیں۔

"تفصیل حال موصی الیہ آں است کہ بزرگان ایشاں از شہر ہا اندکہ شہر یست در دکن۔ شاہ حسن پدر ایشاں مرید شیخ عبد الطیف دولت مندانی کہ بادشاہ بایشاں اخلاص داشت شدند۔ ایشاں را اذن واجازت الہ آباد دادہ رخصت الہ آباد نمودند۔ اینجا محمد ہاشم بہمر سید چوں بہفت سالگی رسید درگذشتند۔ حالا خانقاہ وروضہ پدر آنجا است مزار متبرک۔ ایں فرزند بہ تحصیل علم مشغول شدہ بہ دہلی آمدہ۔ ہفت ہشت سال در مدرسہ دہلی مشغول شد تا بعضے مردم از ایشاں فارغ شدند چوں بسیار صالح وفقیر وفقیر زادہ بود ایں عقد منعقد شد" (م ۵۷ ص ۵۱ — ۵۰)

شاہ صاحب کے ایک لڑکے خواجہ محمد کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

---

[1] ایک مکتوب میں ان کا نام بی بی شرف النسا لکھتے ہیں۔ (م ۵۷ ص ۵۰)

انتقال پر اپنے مرید کو خط لکھا اور اس طرح سے شروع کیا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ مخفی نماند کہ بتاریخ بست وچہارم شہر ربیع الثانی فرزند عزیز خواجہ محمد بہ دار البقار حلت نمود۔ داغ جدائی بر سینۂ دوستاں گذاشت۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ماہمہ صبر نمودیم و شکیبائی ورزیدیم۔ شماہم مصابرت نمائید" (م ۴۲ ص ۴۰)

پھر لکھتے ہیں کہ حامد سعید کی درازیٔ عمر کے لئے خدا سے دعا کرو۔

"درازیٔ عمر و کمالیت فرزند عزیز حامد سعید از حضرت واہب العطایا خواہید" (م ۴۲ ص ۵۰)

شاہ صاحب مذہبی جذبات میں غرق رہتے تھے۔ سرکار مدینہ سے والہانہ محبت کا یہ عالم ہو کہ لکھتے ہیں

"دریں روزہا داعیہ زیارت حضرت مدینہ در دل جوش می زند اگرچہ اسباب آں موجود نیست۔ اما قبل ازیں بے اسباب ایں دولت میسر آمدہ بود۔ اکنوں ہم دل می کشد کہ سر و پا برہنہ شدہ جانب مدینہ رواں شدم" (م ۵۶ ص ۵۰)

مولانا آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عنبر بیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانہ میں اپنے علمی محبِ خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے اس مجموعے کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمع فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے، اِن خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گرد پوش چار روپے۔

مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

اقبال اور نظریۂ سعی و عمل

(۲)

از جناب مولوی شیخ وحید احمد صاحب رئیس شیخوپورہ بدایوں

مآل کی تشریح کی جا چکی ہے۔ اس کا آغاز بجائے خود مہتم بالشان ہے۔

یہ کل کائنات وجودِ مطلق کی خود نمائی یا ارادۂ الٰہی کی قدرتِ کاملہ کا ایک نمونہ ہے۔ ارادۂ الٰہی نے لفظ "کُن" کہکر جنبش کی اور یہ جنبش خود بخود محرک ہوگئی۔ مختلف جنبشوں کی اور سلسلۂ لامتناہی وجود میں آگیا۔ جنبش مابعد نہ مولود ہے اور نہ جز، بلکہ بذاتِ خود ایک نتیجۂ نسبتی ہے۔ ارادۂ الٰہی نے حرکت کی اس کی تھیس کا اثر معلوماتِ الٰہی کے نام سے موسوم ہوا اور ان کی حرکت سے دوسری حرکتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اگر تحریک نہ ہوتی تو معلوماتِ الٰہی کا وجود کیسے ہوتا اور وہ تعمیلِ حکم کیسے کرتے۔

اسی طرح عالمِ امر سے عالمِ خلق تک جملہ منازل حرکتِ اولیٰ کی جنبش کے سلسلے ہیں۔ جن کی عینیت ان کی غیریت میں مخفی ہے۔ ذاتِ واجب تعالیٰ، وحدتِ مطلقہ ہے جس کو "لا بشرطِ شی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہونے اور نہ ہونے کی قید نہیں۔ اور چونکہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہے اس لئے وہ غنیِ مطلق بھی ہے۔ یہ احدیتِ ذات صرف تصور میں باعتبار ذہن خیال کی جاتی ہے اس لئے اعتباری ہے۔

جب احدیت نے وحدت میں تنزل فرمایا یا بہ اصطلاح اصولِ حرکت، احدیت وحدت کا باعث بنی تو یہ حرکت قیدِ سلبی میں آگئی۔ قیدِ سلبی کے لئے وجود کی ضرورت نہیں۔ واحدیت صرف اعتبارِ ذہنی اور مصنوعاتِ عقلی سے سمجھی جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کا امتیاز بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہی واحدیت،

تعینِ اول نورِ محمدی، قلم۔ یا فکر کے مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

تعین دوم کو ملکوتی کہتے ہیں۔ اس حرکت میں ماہیات کی وجہ سے امتیاز نمایاں ہے مگر صورت و شکل کا پتہ نہیں۔

تیسرا مرتبہ برزخ یا عالمِ مثال کے نام سے مشہور ہے یہاں صورت و شکل بھی پائی جاتی ہے لیکن تغیراتِ جسمانی نہیں ہوتے۔

چوتھا درجہ عالمِ شہادت یا ناسوت کہلاتا ہے جہاں صورت و شکل کے ساتھ تغیر جسمانی بھی دکھائی دیتا ہے اور یہ عالمِ جسمانیاتِ متغیر ہونے کی وجہ سے حرکت کو مادی شکل میں پیش کرتا ہے۔

جب یہ مادی حرکت شکل پنجم میں جلوہ نمائی کرتی ہے تو ظہورِ انسانِ کامل کی شبیہ اختیار کر لیتی ہے جو کل عوالمِ اعلیٰ کی مظہر ہے۔

عالم غیب یا عالمِ امر عقول و نفوس و ارواح کا مقام ہے اور عالمِ شہادت یا عالمِ خلق مادہ و مدت کی جگہ ہے لہذا قید زمان و مکان میں مبتلا ہے۔

بہرحال ان سب حرکاتِ ارتقائی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حرکت اولیٰ کی سلسلہ جنبانی سے ایک مسلسل لرزش وجود میں آگئی جس کو خلقت کہا گیا۔

ذاتِ مطلق اگر حرکت اولیٰ ہے تو تعینِ اول کو حرکت ثانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ حرکت اولیٰ اور حرکاتِ مابعد کا تعلق بوئے شرک سے پاک ہے اور توحید کے منافی نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی اسی طرح توحید میں نقص کا شبہ نہیں کیا جا سکتا مگر چراغ کی مثال میں دوئی نمایاں ہے لیکن حرکت سے جب حرکت وجود میں آتی ہے تو اس میں دوئی، تقسیم، تفریق یا تولید کا گمان بھی نہیں گذرتا۔ لہذا توحیدِ خالص سے جب مختلف توحیدیں ظہور میں آتی ہیں تو توحید کے مکمل و خالص ہونے میں بھی بدرجہ اولیٰ ذرا فرق نہیں آتا۔ فلسفۂ قدیم نے اس حقیقت کو یوں ظاہر کیا ہے کہ وجودِ ذات ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ فلسفۂ جدید بزبانِ اقبال یوں بیان کرتا ہے کہ حرکت مسلسل کا نام وجود ہے۔ طریقۂ اظہار یہ ہو یا وہ ہو مگر وحدت الوجود دونوں طرح

ثابت ہے۔ تخیل قدیم میں غیریت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور اسی غیریت کی جھلک نے توحید کے تصور کو منتشر و پراگندہ کرکے بحث کے ہزاروں دروازے کھولدیئے۔ فلسفۂ جدید نے حرکت کی مثال دیکر نہ صرف غیریت کو معدوم کردیا بلکہ عینیت کو برملا اور بے لاگ دکھادیا۔

حرکتِ اولیٰ یا لا فانی وجود کا اگر علم نہ ہوتا تو اس کو تسلیم کرنے والا کون تھا۔ وجود کی شناخت علم سے ہوئی۔ لہٰذا وحدت الوجود کے فلاسفہ نے تمامتر توجہ علم کی طرف منعطف کردی اور قعر سمندر سے دُرِ بے بہا نکالکر دکھادیا۔ یہ کوشش بجائے خود قابل آفریں ہے لیکن اگر ارادہَ الٰہی جنبش نہ کرتا تو یہ علم کہاں ہوتا۔ بعض علمار نے اس حقیقت کے پہلو پر بھی غور کیا لیکن وہ سبب و نتیجہ اور علت و معلول کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہوکر مبدار سے بے نیاز ہوگئے اور منکرینِ خدا کہلائے۔ جنھوں نے علم کے ذریعہ وجود کا پتہ لگایا تھا انھوں نے علت و معلول کے معتقدین کو سمجھایا تو وہ علت العلل کے قائل ہوگئے مگر پھر وہ اس استدلال میں ایسے کھوئے گئے کہ مقصود نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے کہیں سے کہیں نکل گئے۔

ارادہ ایک حرکتِ عمل ہے جو ذات بے ہمتا سے ظہور میں آئی اس حرکتِ یقینی کی صفت و شان ہے "امر و خلق"، حرکتِ امر لامکانی و لازمانی ہے جو حرکتِ خلق کی صورت اختیار کرنے پر مکانی و زمانی بن گئی۔ وجودِ حرکت ہر جگہ اور ہر تغیر میں ایک ہی ہے "صاحبِ ارادہ" جل شانہٗ کے تمام صفات و شیون میں (جن کی تشریح قرآن پاک نے کی ہے اور جن کی تفصیل فلسفۂ وحدت الوجود نے بتائی ہے) قوتِ ارادہ اور قوتِ امری فوقیت و امتیاز رکھتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ارادہ و امر میں حرکت پائی جاتی ہے لہٰذا ذاتِ مطلق خصوصیت کے ساتھ متصف بہ حرکت ہے۔ اس ذاتِ مطلق کو حرکتِ مطلق یا حرکتِ اولیٰ کہنے میں کسی قسم کا کفر و شرک نہیں بلکہ توحیدِ خالص کا واضح اظہار ہے۔ اس صورت میں سورۂ اخلاص کی، بغیر کسی ابہام کے اس سے بہتر اور کیا تشریح ہو سکتی ہے۔

یہ انائے مطلق علم و عمل۔ حیات و ادراک کی تحریک اولیٰ ہے اپنی فطرت کے لحاظ سے حیّ و قیوم ہے۔ ماہیت کے لحاظ سے روح ہے اور حرکت۔ اس کی احدیت لامتناہی اور غیر محدود ہونے کی وجہ سے زمان و مکان سے اعلیٰ ہے۔ ھو اللہ احد۔ احدیت ایک نقطہ ہے جس کا نام ہے

مگر نشان نہیں۔ ایک سرچشمہ ہے جس میں عُمق ہے مگر گھیر اور پھیلاؤ نہیں۔ اس نقطہ و سرچشمہ سے تمام حیات اور خودیوں کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور اس شان کے ساتھ کہ خود جملہ سلسلوں سے بے نیاز ہے اور علیحدہ۔ منہ سے نکلنے والی مسلسل آواز کے حلقے ایک دوسرے سے غیر متعلق بھی ہوتے ہیں اور ایک نسبتِ مشترک بھی رکھتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے اندر سے گذر کر آگے نہ بڑھے۔ اللہ الصمد۔ یہی صمدیت ہے اور اسی سے یہ ثابت ہے کہ اس کی شان لم یلد ولم یولد ہے۔ ارادۂ امر خلق انھیں اوصاف کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ خود غیر محدود۔ لاتناہی اور مختار ہے اور اسی کی حرکت سے ایک مسلسل حرکت جاری ہوئی ہے جو ہمیں بصورتِ خلق مبتلائے زمان و مکان دکھائی دیتی ہے۔

ذاتِ مطلق کو حرکتِ مطلق سے متصف کرنے کا پورا لطف و ذوق وہی اہل علم اٹھا سکتے ہیں جن کو نیوٹن کے "قوانین حرکت" پر عبور ہے۔ میں بہ خیال طوالت اس ضروری تشریح کو فی الحال نظر انداز کرتا ہوں۔

روح امرِ ربی ہے اور امر، ذات سے جدا اور مختلف نہیں۔ لہذا روح میں صفاتِ رب ضرور ہونا چاہئیں۔ آمریت کی شان اگر روح میں نہ پائی جائے تو اس روح کو روح نہیں کہا جا سکتا۔ ذاتِ مطلق اور حرکتِ اولیٰ میں آزادی و مختاری مسلم ہے۔ چنانچہ ہر شے ایک قاعدہ پر ہے ہر اصول میں جدت ہے اور ہر قانون میں استثنیٰ ہے۔ کبھی اضداد سے محبت کی بو آتی ہے۔ کبھی اتحاد میں منافرت نظر آتی ہے۔ انائے مطلق کی یہی شانِ آمریت ہے۔ انائے مقید میں بھی حسب استعداد اسی قسم کی شانِ امریت کا ظہور لازمی و ضروری ہے۔ جب اس صورت سے سلسلۂ خودی جاری ہو گیا تو تغیر و بقا اس کا یقینی حق ہے۔ قرآن پاک بھی اسی آمریت سے پیدا ہونے والی بقار کی ترغیب دیتا ہے اور اس بقار کے حصول کے لئے مسلسل و متواتر جدوجہدِ صحیح لازمی ہے۔ نت نئی ترقی کرنے والی خودئ مقید کا مقدر یقینی بقائے دوام ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے جب اس خاک کے پتلے میں اپنا امر شامل کر دیا تو آثارِ حیات نمودار ہو گئے،

شیونِ خداوندی کا وہ حامل ہوگیا۔ وہ امرِ تخلیق کا مکمل ترین نمونہ کہلایا۔ اشرف المخلوقات کا خطاب ملا۔ خودی سے مزین ہوا اور اس کی بنا پر بارِ امانت کی حامی بھرنے کے بعد خلیفۃ اللہ فی الارض کے لقب سے ممتاز و مشخص ہوا۔

جملہ اشیاء نے جس بارِ امانت کو قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ رکھے اور جس کو آمریت کا حامل ہونے کی وجہ سے ظالم و جاہل مگر صاحبِ خودی انسان نے اٹھالیا وہ بارِ امانت تھا کیا؟ اس کو عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نئی اصطلاح میں خودیِ مطلق سے خودیِ مقید کی نسبت کو قایم واستوار رکھنے کا نام بارِ امانت ہے اور غالباً عشق کی تعریف بھی یہی ہے۔ یہ نسبتِ مشترک یقیناً امر و روح کی پیدا کردہ ہے۔ حرکتِ مقید اگر حرکتِ مطلق سے محبت و نسبت قائم رکھے گی تو اس کو تخلقوا باخلاق اللہ کا عامل سمجھا جائے گا۔ ورنہ غلط استعمال پر نتیجہ بھگتنا پڑے گا تا آنکہ نسبتِ صحیح حاصل ہو جائے۔ اور نسبتِ صحیح کے ذریعہ اپنے وجود کی بقا سے لافانی وجود کا مسلسل کلمہ پڑھا جائے۔ اس ذوقِ دید میں خاتمے کا تصور توہینِ خداوندی ہے اور بس۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بہترین کتاب

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کا اردو ترجمہ:۔ اصل کتاب کی اہمیت کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا نام نامی کافی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں قرآن مجید کی تفسیر کے تمام بنیادی اصول پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے یہ کتاب حقیقت میں کلامِ الٰہی کی تفسیر صحیح کے لئے ایک کنجی کا کام دیتی ہے چنانچہ خود شاہ صاحبؒ اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں" جب اس فقیر پر کتاب اللہ کے سمجھنے کا دروازہ کھولا گیا تو میں نے چاہا کہ بعض مفید نکات جو کتاب اللہ کے سمجھنے میں دوستوں کے لئے کار آمد ہو سکتے ہیں انھیں ایک رسالہ میں منضبط کردوں۔ ان قواعد کو سمجھ لینے سے ایک وسیع شاہراہ "کتاب اللہ" کے سمجھنے میں کھل جائے گی"۔ کتاب کا ترجمہ ہماری زبان کے مشہور مترجم رشید احمد صاحب انصاری مرحوم نے کیا ہے۔ قیمت ۱۲/

مکتبہ برہان قرول باغ دہلی

ادبیات

فکرِ روش

از جناب روش صاحب صدیقی

خبر بھی ہے تجھے اے حسنِ روپوش — نگاہیں ہو چلی ہیں خود فراموش
نقابِ زندگانی اُٹھ رہا ہے — مگر انساں ہوا جاتا ہے روپوش
در و دیوار کا کب تک سہارا — مبارک اے حیاتِ خانہ بردوش
حریم غم ہو یا ایوانِ عشرت — چراغِ صبح کو ہونا ہے خاموش
بہ قیدِ ظرف کب تک بادۂ غم — خداوندا! بہ قدرِ ذوقِ مینوش
شکستِ نغمۂ دل کو، زمانہ — بہت سمجھا تو سمجھا جنتِ گوش
خرابِ جستجو ہیں، جام و مینا — کہاں پہنچا ترا آوارۂ ہوش
کسے اب فرصتِ تعبیرِ ہستی — مری آنکھیں، ترا خوابِ فراموش

روشؔ کیا شکوۂ جادو نگاہاں
یہ دل کچھ کم نہیں غارتگرِ ہوش

عصرِ حاضر

از جناب ناصر صاحب مالیگانوی

نہ پوچھ! مجھ سے حقیقت "نو عصرِ حاضر" کی	یہ ایک "عہدِ زبوں" کے سوا کچھ اور نہیں
وہ علم جس سے نہ ہو "دولتِ یقیں" حاصل	متاعِ جہل وجنوں کے سوا کچھ اور نہیں
مرے عزیز! اب اس دور میں سکوں کی تلاش	بس اک سرابِ سکوں کے سوا کچھ اور نہیں
نظر فریبیٔ "تہذیبِ نو" معاذ اللہ!	فرنگیوں کے فسوں کے سوا کچھ اور نہیں
خدا گواہ! کہ ذہن و ضمیرِ انساں میں	ہوائے حرص و جنوں کے سوا کچھ اور نہیں
حقیقت آج بس اتنی ہے ناتوانوں کی	کہ ایک "صیدِ زبوں" کے سوا کچھ اور نہیں
یہ انقلابِ مسلسل کی حشر سامانی	پیامِ آتش و خوں کے سوا کچھ اور نہیں
برائے نام یہ فکر و نظر کی آزادی	فریب و خواب و فسوں کے سوا کچھ اور نہیں

کمالِ دانش و حکمت کا ہر قدم ناصرؔ
حریفِ امن و سکوں کے سوا کچھ اور نہیں

تبصرہ

The Present Crisis in Islam and our future Educational Programme | از جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب ایم۔ اے (علیگ) تقطیع خورد ضخامت ۷۷ صفحات ٹائپ جلی اور روشن

قیمت ۱۲ ر پتہ:۔ علیگڈھ بکس اینڈ نیوز پیپرس ایجنسی نمبر۶ شبلی روڈ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایک مدت سے مفکرین اسلام اور ہندوستان کے مسلمان ماہرین تعلیم اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو ان کی قومی اور اجتماعی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں متعدد تجاویز کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی جو لائق مصنف کی ایک بڑی کتاب کا حصہ ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ ہمیں اپنے الگ نظامِ تعلیم کی کیوں ضرورت ہے اس نظام کے مقاصد کیا ہوں گے۔ اس کے بعد مصنف نے نظام کا ایک خاکہ پیش کیا ہے جس کی تفصیلات میں اگرچہ بحث و نظر کی کافی گنجائش ہے لیکن اس خاکہ کا جو بنیادی تخیل ہے یعنی یہ کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اسلامیات و دینیات کے بڑے فاضل علما بھی ہوں اور جدید نظری اور عملی علوم و فنون کے الگ الگ ماہر بھی۔ ہم اس سے بالکل متفق ہیں مصنف نے دینیات کی دو قسمیں کی ہیں ایک لازمی اور دوسری اختیاری، پھر علوم و فنون کے مختلف گروپ بنا کر ان کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان میں سے ہر گروپ کے لئے انھوں نے دینیات لازمی رکھی ہے اور ہر گروپ کی تشکیل میں انھوں نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ جو طلبا کسی گروپ سے فارغ ہو کر نکلیں وہ اپنے مضامین میں ماہر و فاضل ہونے کے ساتھ فکر و اعتقاد کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان بھی ہوں۔ اس کے بعد یہ نظام کیونکر عمل میں لایا جا سکتا ہے؟ اس میں بظاہر کیا کیا دشواریاں اور دقتیں ہیں؟ کورس کی کتابوں کا فقدان۔ اچھے اور قابل اساتذہ کا دستیاب ہونا، مالیہ کا انتظام۔ سرمایہ کی فراہمی وغیرہ ان امور پر بحث کی گئی ہر مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ انھیں اس میں غور و خوض کے لئے ایک متعین اور مشخص پروگرام ملے گا جس میں بحث و گفتگو کے بعد مناسب ترمیم و تبدیل بھی ہو سکتی ہے اور خود مصنف نے بھی اس کو اسی مقصد سے شائع کیا ہے۔

بُرہان

جلد ہفتدہم　　　　شمارہ (۵)

نومبر ۱۹۴۶ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبرآبادی	۲۵۸
۲۔ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۲۶۱
۳۔ اسلام میں رسول کا تصور	جناب مولانا محمد بدرعالم صاحب میرٹھی	۲۷۸
۴۔ علم النفسیات کا ایک افادی پہلو	جناب لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ ایم ایس	۲۹۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں آج کل فرقہ وارانہ کشیدگی کا ظہور جس شرمناک طریقہ پر ہو رہا ہے اس پر کن لفظوں میں اظہارِ افسوس کیا جائے۔ ہندوستان کی پیشانی پر غلامی کا کلنگ کا ٹیکہ ہی کیا کچھ کم تھا کہ اب اس طرح آپس میں لڑ جھگڑ کر اقوامِ عالم میں اپنے لئے ذلت و رسوائی کا ایک نیا سامان بہم پہنچایا جا رہا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ انگریز اعلان پہ اعلان کر رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرنا چاہتا ہے اور اپنے اس ارادہ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اس نے آزادی کی پہلی قسط دے بھی دی ہے چنانچہ اب مرکز میں مختلف اقوامِ ہند کے مسلمہ نمایندوں کی گورنمنٹ قائم ہے، صوبوں میں حکومت کا کام خود عوام کے منتخب کئے ہوئے افراد چلا رہے ہیں دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں سے ہندوستان خود اپنی صوابدید کے مطابق سیاسی رشتہ جوڑ رہا ہے اور یہ سب طاقتیں بھی اس کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں اقوامِ متحدہ کی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو برابر کی نمائندگی کا حق حاصل ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کے لوگوں نے آزادی کی اس پہلی قسط کا خیر مقدم کس طرح کیا؟ اس کا جواب لینا ہو تو کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، الہ آباد، مشرقی بنگال، بہار اور میرٹھ کے دردانگیز اور انتہائی شرمناک واقعات پر ایک نظر ڈالئے۔ جہاں انسانی خون پانی کے قطروں سے زیادہ بے دردی اور بے رحمی سے بہایا گیا ہے اور جہاں کے ہزاروں مردوں اور عورتوں کی خانہ خرابی نے انسانیت و شرافت کے نام کو بھی بٹہ لگا دیا ہے۔ آہ! کتنا بدنصیب ہے وہ طائر زیرِ دام جس کے قید و بند کی بندشیں صیاد ڈھیلی کرنی چاہتا ہے تاکہ اس کے بال و پر میں طاقت آ جائے تو وہ قفس سے پرواز کر سکے لیکن عرصہ دراز کی خوئے گرفتاری و اسارت کے باعث وہ بدنصیب قفس کو ہی اپنا آشیاں سمجھنے لگا ہے اور اس بنا پر صیاد جال کا ایک حلقہ ڈھیلا کرتا ہے تو وہ اپنی منقار سے اسے پھر کس دیتا ہے۔

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا بن رہے ہیں اپنی منقاروں سے حلقہ جال کا

اس وقت تک کی عام اطلاعات یہ ہیں کہ ایک مشرقی بنگال کو چھوڑکر باقی ہر جگہ کے فسادات میں جانی اور مالی نقصان زیادہ تر مسلمانوں کا ہی ہوا ہے اور قرین قیاس بھی یہی ہے کیونکہ مسلمان بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آبادی کا کل ۱/۴ حصہ ہیں اور الکفر ملۃ واحدہ کے ارشاد کے مطابق باقی سب قومیں ان کی مخالفت میں ایک ہیں گنتی میں اس قدر کم ہونے کے باوجود وہ اقتصادی تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے بھی اپنی ہمسایہ قوموں سے بہت پیچھے ہیں، لے دیکر ایک فن حرب وضرب تھا جس میں مسلمان سب پر فوقیت رکھتے تھے لیکن اب اس میں بھی ان کو وہ امتیاز باقی نہیں رہا۔ کیونکہ دوسری قوموں نے باقاعدہ ورزش اور حرب وضرب کی تعلیم کو اپنی زندگی کے معمولات میں شامل کرلیا ہے اور وہ اس پر سختی کے ساتھ عامل ہیں۔

یہ نقصانات تو وہ ہیں جو غریب مسلمانوں کو اب پہنچ رہے ہیں اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ان کی تلافی کس طرح ہوسکے گی اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ اگر ان فسادات کا خاتمہ نہیں ہوا اور موجودہ المناک صورت حال یونہی قائم رہی تو ان کے باعث ملک میں جو سیاسی انقلاب پیدا ہوگا مسلمانوں پر اُس کے اثرات کیا ہوں گے؟ بہت ممکن ہے مرکز میں جو قومی حکومت قائم ہے وہ ٹوٹ جائے اور بعید نہیں کہ صوبہ کی حکومتیں بھی ختم ہوجائیں لیکن کیا اس کے بعد ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں پھر سخت ہوجائیں گی؟ اور ملک اس وقت آزادی کی جس منزل تک پہنچ چکا ہے اس کے قدم اس سے پھر پیچھے لوٹ جائیں گے ظاہر ہے کہ کوئی ہوشمند انسان جس کی نظر دنیا کے موجودہ حالات اور بین الاقوامی سیاسی انقلابات پر ہے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے، سادہ لوح مسلمان اُس وقت بھی اسی طرح "یوم نجات" منائیں اور جشن چراغاں کریں جیسا کہ انھوں نے گذشتہ جنگ کے آغاز میں کانگرسی وزارتوں کے استعفا دینے پر کیا تھا لیکن جن حالات نے احمد نگر جیل کے قیدیوں کو (جن کے متعلق سزائے موت تک کی تیاریاں کی جارہی تھیں) آج ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی کرسیوں پر لا بٹھایا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل وہ حالات بدل جائیں گے اور کوئی طاقت برطانوی ملوکیت کے دست وبازو میں جس کو جنگ نے بالکل مفلوج اور شل کردیا ہے اسے پھر ایسی روح توانائی پھونک سکے گی کہ وہ ہندوستان کی چڑیا کو جس میں اب شاہین کے سے بال و پر پیدا ہوگئے ہیں پہلے کی سی طرح مضبوطی سے پکڑ سکے گی۔ ایک طرف مسٹر چرچل ایسے بطلِ اعظم انگلستان کا قعرِ گمنامی میں جا پڑنا اس بات کی دلیل ہے کہ برطانوی شہنشاہیت

اب عالمِ سکرات طاری ہے اور وہ کسی طرح اس سے جانبر نہیں ہو سکتی اور دوسری جانب ہندوستان میں غالب اکثریت رکھنے والی قوم جو ۶۵ سال سے حکومت سے برابر ٹکر لیتی چلی آرہی ہے اس کی ہمت و عزم کا یہ عالم ہے کہ ہر روز جب آفتاب طلوع ہوتا ہے وہ اپنے دل میں نئی امنگوں اور ولولوں اور پہلے سے زائد جوش و خروش کی دنیا آباد پاتی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان پھر بھی غلام ہی رہے گا اور اس کے لئے آزادی کا جو اعلان بار بار ہو چکا ہے وہ حرفِ غلط کی طرح منسوخ کر دیا جائے گا۔

اب خدا کے لئے ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمائیے کہ اگر مسلمانوں کی منفی سیاسی پالیسی کا یہی عالم رہا تو اُس وقت ہندوستان کے دس کروڑ فرزندانِ توحید کا کیا حشر ہوگا! اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں گذشتا اپریل یعنی جبکہ برطانوی مشن ہندوستان آیا تھا اُس وقت سے لیکر اواخر اکتوبر تک جبکہ مسلمانوں نے بحیثیت جماعت حکومت میں شرکت کی ہے۔ ان چند مہینوں کی مسلم سیاست کی روداد پر ایک نظر ڈال جائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دعاوی کیا تھے؟ نعرے کیا لگائے جاتے تھے؟ مسلم عوام کے دل و دماغ میں تصور کیا پیدا کیا گیا تھا؟ تنقیدات کس قدر سخت تھیں؟ لیکن بایں ہمہ اپنے آپ کو مجبور و بے بس پا کر اسی ایک لقمۂ خشک پر قناعت کر لی گئی جس کو انگریز نے "بکمالِ فیاضی" پیش کیا تھا! پس اگر ہمارے قول و عمل کی عدم مطابقت اور افسردہ دلی و پست ہمتی کا عالم کل بھی یہی رہا تو کون بتا سکتا ہے کہ کل اس سرزمین میں غریب مسلمان کی سیاسی زندگی کا انجام کس درجہ عبرتناک ہوگا!

اے کاش! ہم سمجھ سکتے کہ قومیں صرف نعرہ لگانے اور کسی کے خلاف جذباتِ نفرت و عداوت کے اظہار کرنے سے نہیں بنتیں بلکہ قوم بنتی ہے اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بلند پایہ ہونے سے تعلیمی اور اقتصادی حیثیت میں مضبوط اور طاقتور ہونے سے۔ ایک بلند مقصد کے ساتھ والہانہ گرویدگی کے رکھنے اور اس کے لئے بے پناہ دولت عزم و ہمت، ثبات و استقلال، عمل پیہم اور سعی مسلسل پر کاربند رہنے سے۔ جو قوم ان صفات کی حامل ہو اسے کبھی کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور اس کے حقوق کو کوئی طاقت غصب نہیں کر سکتی۔ مفکر اسلام اقبال مرحوم نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے،

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

(۳)

ٹھیک اسی طرح عالم روحانی کا حال ہے یعنی گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ "عقل" انسانی ہدایت کی وہ شمع روشن ہے جس کو قدرتِ حق نے انسان کے باطن میں ودیعت رکھدیا ہے اور یہی قوتِ عقل حق و باطل، نور و ظلمت، ہدایت و ضلالت، نیک و بد میں امتیاز کرتی اور کھوٹے کو کھرے سے جدا کرتی ہے گویا وہ ایک روشنی کا مینارہ ہے جو عالم صغیر کے اندر ہر وقت اپنے نور سے اچھے برے راستہ کا امتیاز ظاہر کرتا رہتا ہے لیکن ہر ذی عقل اس حقیقت کا بھی معترف ہے کہ عقلِ انسانی کا داخلی ماحول، خیالات و افکار اور اوہام و شبہات سے اور خارجی ماحول ظلماتِ کفر و شرک اور رسوم و عوائد جاہلیہ سے گھرا ہوا ہے اس لئے عقل کی روشنی اور درخشانی کے باوجود وہ ماوراء مادیات اور الٰہیات کی راہِ مستقیم پر گامزن ہونے سے عاجز ہے اور یہ ظلمتیں اور تاریکیاں عقل پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ باطن کی یہ روشنی اپنی مفوضہ خدمت کے لئے مجبور نظر آتی ہے پس وہی قانونِ فطرت جس نے مادی ظلمتوں میں نورِ بصارت کو عاجز ظاہر کر کے خارجی روشنی کا محتاج قرار دیا تھا روحانی ظلمتوں میں نورِ عقل کو درماندہ ظاہر کرتے ہوئے معرفتِ حق اور ادراکِ حقیقت کے لئے خارج سے کسی روشنی کی اعانت و امداد کو ضروری قرار دیتا ہے خواہ وہ روشنی اپنی اقدار کے لحاظ سے تنگ بداماں ہو یا کسی درجہ وسعتِ آغوش کی حامل اور خواہ اپنی لامحدود وسعتوں کے لحاظ سے تمام کائنات ہست و بود پر حاوی و محیط ہو۔

پس قرآنِ عزیز نے اسی طویل حقیقتِ حال کو اس معجزانہ طرزِ استدلال میں بیان کیا ہے:۔

قد جاءکم من اللّٰہ نورٌ   بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی جانب سے روشنی آگئی"

یعنی جس طرح آنکھ کی اندرونی روشنی تاریکیوں میں بغیر باہر کی روشنی کے نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح انسان کے باطن کی روشنی (عقل) بھی ماورائے محسوسات کو "ظلمات بعضہا فوق بعض" کی بنا پر خارجی روشنی کی اعانت کے بغیر حقیقت کا نظارہ نہیں کر سکتی۔ اور خارج کے اس نورِ تاباں ہی کا نام مذہب کی اصطلاح میں "وحی" ہے جو بلاشبہ صراطِ مستقیم کے لئے نور الانوار ہے۔ پس اگر وحی الٰہی کی یہ روشنی انسانی مدرکات کے لئے معاون و مددگار نہ بنتی تو انسان کبھی حقیقتِ کبریٰ کو عریاں نہ دیکھ سکتا، یہی وجہ ہے کہ رسول و نبی کی بعثت کی ضرورت ایک حقیقی اور فطری ضرورت و حاجت ہے تاکہ وہ اس نورِ خارجی کو ہم تک پہنچائے اور راہِ ہدایت دکھلائے۔

اور یہی وجہ ہے کہ مادی دنیا کے دورِ اولین میں جبکہ اس کا دامن تنگ تھا یہ روشنی بھی مختصر حدود کو روشن کرتی رہی لیکن جب دنیا رمادی سنِ شعور کو پہنچی اور اس کی نشو و نما نے حدِ بلوغ حاصل کر لیا تو اس نسبت سے آہستہ آہستہ یہ خارجی نور بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوتے سنِ شعور اور حدِ بلوغ کو پہنچ کر اور قرآن کی شکل میں "نورِ مبین" بن کر جلوہ گر ہوا اور اپنی تابانی و درخشانی سے کل معمورۂ عالم کو روشن و منور کر دیا۔ اس لئے یقیناً قرآن کا یہ دعویٰ حق ہے کہ اگر اس سے وابستہ مقدس ہستی آفتابِ رسالت اور سراجِ منیر ہے تو وہ بلاشبہ کائناتِ انسانی کے لئے "نورِ مبین" ہے۔

وانزلنا الیکم نوراً مبیناً (نساء)   اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ   وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے
بافواھِھم واللّٰہ مُتِمّ نورہ   بجھادیں اور اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے
ولو کرہ الکافرون (صف)   اگرچہ کافروں کو بُرا لگے۔

یریدون ان یطفؤا نور اللہ   وہ ارادہ کرتے ہیں کہ اپنے منہ سے خدا کی روشنی کو
بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم   بجھادیں اور اللہ اپنی روشنی پورا کئے بغیر نہیں
نورہ ولو کرہ الکافرون۔ (توبہ)   رہے گا اگرچہ کافر برا مانیں۔

قدجاءکم من اللہ نورٌ و کتاب مبین (مائدہ) — بیشک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب واضح۔

واتبعوا النور الذی انزل معہ (اعراف) — اور تابع ہوئے اس روشنی کے جو اس کے ساتھ اتری۔

فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا۔ (تغابن) — پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور (قرآن) پر جو ہم نے اتارا۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" تو لاریب یہ بھی درست ہے کہ قرآن نور ہے اس لئے کہ وہ خود اپنے الفاظ و معانی کے حقایق میں واضح اور روشن ہے اور تمام کتبِ سماویہ اور ادیان حقّہ قدیمہ کے حقائق کو بھی تاریکی سے روشنی میں لانے والا ہے اس لئے جو شخص بھی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور واضح اسالیبِ بیان کو فکر و نظر سے دیکھتا اور تدبر و تعقل کی راہ سے جانچتا ہے تو اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ "حقیقت" مستور نہیں رہ سکتی۔ اور جس طرح بجلی کا قمقمہ روشن ہو کر گرد و پیش کو منور کر دیتا ہے اور جحود و انکار کے باوجود کسی کو اس کے رخِ روشن کا انکار کئے نہیں بن پڑتا اسی طرح جب وہ اپنے اعجازِ بیان کے ساتھ کائنات کو مخاطب کرتا ہے تو عقلِ سلیم کو قبول کئے اور قلبِ فہیم کو متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا اور گو زبان اس اقرار سے منکر ہی رہے لیکن باطنِ قلب اس کے روشن دلائل و براہین کے سامنے اعتراف و قبول پر مجبور ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر مسئلہ توحید ہی کو لے لیجئے کہ خدا کی الوہیت و ربوبیت کاملہ کا اعتقاد وجودِ انسانی کے مقاصدِ عظمیٰ اور معارفِ علیا میں سے ہے کیونکہ اس اساس پر پہنچ کر وہ حقایق و معارف سے آگاہی پاتا، تزکیۂ نفس کے نتیجہ و ثمرہ سے حقیقی استفادہ کرتا، اور عقل کو منور و درخشاں بناتا ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جس کے پیشِ نظر وہ اپنی ہستی کو تمام کائناتِ ہست و بود کا خلاصہ اور ثمرہ سمجھ کر خدا کا خلیفہ اور نائب کہلاتا ہے۔ چنانچہ ہر دور اور ہر زمانہ میں انبیاء و رسل اس مقصدِ عظمیٰ کی دعوت دیتے اور امم سابقہ کو پیغامِ حق سناتے رہے ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ امم ماضیہ نے اول تو اس حقیقت پر زیادہ دھیان ہی نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو زیادہ عرصہ نہیں گذرتا تھا کہ پھر قعرِ مذلت میں گر جاتی اور شرک و بت پرستی کو

شعار بنا کر فطرت کو مسخ کر لیتی اور عقل و خرد کو برباد کر ڈالتی تھی اور بلندی و سرفرازی سے گر کر خدا کے سوا کائنات کی ہر چیز کے سامنے سربسجود نظر آتی تھی تو ایسا کیوں ہوتا تھا اس لئے کہ ابھی اُن کے عقول و ادراکات نے سن شعور کی سی پختگی حاصل نہیں کی تھی اور اس لئے بھی کہ عقل و خرد کی خامی اور نشو و ارتقار کی کمزوری ان کو اس دقیق مسئلہ پر مستقیم نہیں رہنے دیتی تھی وہ بلاشبہ ایک خدا کے قائل رہتے تھے مگر ساتھ ہی ایذار رساں اور مضرت کناں اشیار کے خوف یا اُن میں کسی ندرت کے وجود یا ان کی افادیت کے تاثر سے اپنی خادم اشیار کو مخدوم بنا کر خدا کی طرح پوجنے لگتے اور خدا کا سہیم و شریک مان لیتے۔ نیز یہ یقین کر بیٹھتے تھے کہ عالمِ سفلی و علوی کی یہ مخلوقات ہمارے اور خدا کے درمیان ایسا واسطہ ہیں کہ جب تک ان کی پرستش اور پوجا کر کے ان کو خوش اور راضی نہ کر لیں گے خدا کی رضا کا حصول ناممکن ہے " ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ "

لیکن مسطورہ بالا وجوہ کے علاوہ توحیدِ خالص پر ان کی عدم استقامت کی ایک نمایاں علت یہ بھی تھی کہ ان کی مذکورہ بالا خام کاریوں کی وجہ سے اس مسئلہ کے افہام و تفہیم میں استعارات و تشبیہات کو روا رکھا گیا تاکہ یہ سادہ مگر دقیق مسئلہ ان کے عقل و ذہن سے قریب تر ہو سکے۔ مگر ان کی خام کاری زیادہ دیر تک اس کے اصلی خد و خال سے متاثر نہیں رہنے دیتی تھی۔ اگر وہ اصنام پرستی، کواکب پرستی اور مظاہر پرستی سے اجتناب کرتے بھی تو استعارات و تشبیہات کو اصل مان کر کبھی انبیا و رسل کو خدا کا بیٹا کہتے اور کبھی بزرگوں اور مقدس انسانوں کو اوتار بنا کر خالص توحید سے منہ موڑ لیتے تھے پس جبکہ ادیان و ملل کی تاریخ کا کوئی صفحہ بھی شرک سے خالی نہ رہا اور تمام کائنات میں خدا پرستی کی جگہ اصنام پرستی، مظاہر پرستی اور انسان پرستی نے لے لی تو یہ تمام عالم ظلماتِ شرک و کفر سے یکسر تاریک ہو کر رہ گیا۔ اُس وقت ظلمتوں اور تاریکیوں کے ان تمام پردوں کو چاک کر کے اس مسئلہ کے ہر گوشہ اور ہر پہلو کو اگر کسی نے روشن و منور کر دکھایا اور کسی گوشہ کو بھی تاریکی میں تشنہ نہ رہنے دیا تو وہ صرف یہی " نورِ مبین " ہے۔ جس کا دوسرا نام قرآن ہے۔

بُرہان | قرآن عزیز، "الکتاب" "الہدیٰ" اور "نورمبین" ہے یہ حقائق، دلائل کی ترازو میں کہاں تک پورے اترے اور تاریخِ ادیان وملل کی شہادت نے اُن کو کس حد تک حق ثابت کیا گذشتہ سطور سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے لیکن قرآن اس سے آگے کچھ اور بھی دعویٰ رکھتا اور کہنا چاہتا ہے کہ وہ "برہانِ رب" ہے۔

یا ایھا النّاس قد جاءکم برھانٌ من ربّکم۔ (النساء)	لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی "دلیل" آپہنچی۔

اکثر علماء اسلام کا قول ہے کہ اس مقام پر "برہان سے مراد" ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے یا اُن کے معجزاتِ باہرات مراد ہیں اور بعض علماء کہتے ہیں جن میں زمخشری نمایاں ہیں کہ اس سے مراد قرآن ہے ہمارے نزدیک ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ لغت میں برہان کے معنی "حجت و دلیل" کے ہیں یعنی وہ شے جو کسی دعوے کے ثبوت کا کام دے برہان کہلانے کی مستحق ہے تو اس لحاظ سے اس کا اطلاق ذاتِ اقدس پر بھی ہوتا ہے کہ وجودِ با جود سر تا سر دعویٰ رسالت کی صداقت کے لئے روشن ثبوت ہے اس لئے کہ وہ "نبی امی" ہے جو انسانی آغوشِ تربیت سے محروم، کالج و اسکول یا شخصی استاذ و ماہرینِ فن کی شاگردی سے ناآشنا، تمدنی تعلیمی سوسائٹی سے بیگانہ، ماحول اور گرد و پیش ہر قسم کے تعلیمی اداروں اور علمی مذاکروں سے خالی، دین وملت کی تعلیم اور دنیاوی تمدن وحضارت دونوں معدوم غرض ابتدائی عمر یتیمی و بیسری کی آئینہ دار اور عمر کا کوئی حصہ بھی کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے سے بے نیاز ملک ایسا کہ جہاں آبشار، مرغزار، گل وگلزار کی جگہ جھلسے ہوئے پہاڑ اور تپتی ہوئی ریت۔ بادِ سموم چل جائے تو دماغ ہانڈی کی طرح جوش مارنے لگے گویا ہر قسم کے دماغی نشو و نما کے لئے ناموزوں "بوادٍ غیر ذی زرع عند بیتک المحرم" پس ان تمام ناسازگار حالات میں پچیس برس تک امیوں اور ان پڑھوں کے درمیان سادگی سے گذار کر یک بیک غارِ حرا سے ایک ایسا کلام پیش کر دیتا ہے جو نظم و ترتیب، انسجام وارتباط معانی ومطالب، حقائق و معارف اور نکات ولطائف غرض ہر علمی اور عملی پہلو کے پیش نظر سر تا سر اعجاز ہی اعجاز ہے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یقیناً یہ مقدس ہستی براہِ راست خدائے برتر

کی آغوشِ رحمت سے فیض حاصل کرکے کائناتِ انسانی اور تاریخ ادیان وملل کے سامنے ایک ایسی "حجت" اور ایسا "برہان" ہے جس کی صداقت کا انکار بداہت وحقیقت کے انکار کے مرادف ہے۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست

کتبخانہ چند ملت بہ شست

لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اگر ذات قدسی صفات بہ نفسِ نفیس "برہان" ہے تو اسی لئے کہ مسطورہ بالا شئون وحالات کی موجودگی میں اس نے ایک ایسا اعجاز پیش کردیا جس کے سامنے ساری کائناتِ علمی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئی اور جس کے معارضہ سے عاجز ودرماندہ ہوکر یہ کہنا پڑا

واللہ ماھذا کلام البشر۔ قسم بخدا یہ بشر کا کلام نہیں ہے

اور اسی اعجاز کا نام "قرآن حکیم" ہے

اور اگر معجزات النبی مراد ہوں تو اس اعتبار سے بھی یہ اطلاق اس لئے صحیح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے انبیاء ورسل علیہم الصلوٰة والسلام کا سلسلہ جاری فرمایا تو ان کو پیغامِ صداقت اور دعوتِ حق کے لئے دو قسم کے سامان عنایت فرمائے ایک علمی دلائل اور شواہد ونظائر تاکہ اہل علم ونظر کے لئے تعلیماتِ حق وصداقت کی جانچ اور پرکھ کا موقع میسر آئے اور دوسرے ایسے معجزانہ امور کہ جن کے مقابلہ سے حیران وعاجز ہوکر حق وصداقت کے سامنے وہ ہستیاں بھی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوجائیں جو علمی کاوشوں اور فکری وعقلی دلائل وبراہین سے اس درجہ متاثر نہیں ہوتیں جس قدر کہ خرقِ عادت اور اعجازِ قدرت سے اثر پذیر ہوجایا کرتی ہیں چنانچہ انسانی نفسیات کا یہ قدیم نقشہ ہے جو ہر زمانہ میں ان دونوں قسم کے موثرات کے درمیان تقسیم رہا ہے۔

پس اگر حضرت موسیٰؑ کو ید بیضا اور عصا عطا ہوا اور حضرت عیسیٰؑ کو دمِ عیسیٰ بخشا گیا تو اس قسم کے عملی معجزات کثیر تعداد میں ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عنایت ہوئے لیکن ان تمام عملی معجزات سے بلند وبالا معجزہ جو حجت وبرہان اور دلیلِ محکم ویقین مبرم کا شاہکار ثابت ہو، قرآن کے علاوہ دوسرا کون ہوسکتا ہے، اس لئے "برہان من ربکم" کی توجیہ اگر معجزات سے بھی کی جائے تب بھی اس کا

اطلاقِ اولین قرآن سے زیادہ اور کسی پر نہیں ہو سکتا۔

اور اگر "برہان" کی تفسیر صرف "حجت و دلیل" ہی کے ساتھ کیجئے تو بھی قرآن ہی کو پیش کرنا پڑے گا اس لئے کہ انسانوں کی ہدایت اور ثقلین کے ارشاد و دعوت کے لئے بلکہ انسانی معاد و معاش یعنی حیاتِ اولی و اخروی ــــ دونوں کے لئے نہ اس سے بہتر کوئی دلیل سامنے آسکی اور نہ اس سے بلند کوئی "برہان" روشن و رونما ہو سکا۔

غرض "برہانِ رب" کی کوئی تفسیر بھی کیجئے، قرآن بہرحال درمیان میں آجاتا اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ پس بالواسطہ اطلاق کیجئے یا بلا واسطہ قرآن بلا شبہ حجت ہے، دلیل ہے، برہان ہے بلکہ "برہانِ رب" ہے۔

آپ قرآن کا بغور مطالعہ فرمائیے اور تفکر و تعقل کو واسطہ بنا کر غور فرمائیے تو خود فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اعتقاد و ایمان، اخلاق و عمل، معیشت و معاشرت، غیب و شہود کا کون سا مسئلہ ہے جس کو قرآن نے آنکھ بند کر کے قبول کر لینے کی دعوت دی ہو، نہیں وہ تو ہر مسئلہ پر وجدان، حواس اور عقل سے اپیل کرتا اور ان کی روشنی میں حق و صداقت کا فیصلہ چاہتا ہے اس لئے وہ ہر مسئلہ پر دلائل دیتا، شواہد و نظائر پیش کرتا اور پھر فکر و نظر کو دعوت دے کر حق و باطل میں امتیاز کا طالب ہوتا ہے۔

اور چونکہ وہ انسان کے قلب و دماغ اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو متاثر کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ ان ہی کے تاثر سے اعتقاد و یقین اور اذعان عالمِ وجود میں آتے ہیں اس لئے وہ اپنے دلائل و براہین میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتا کہ منطقی طریق استدلال کی جگہ وجدانی اور خطابی برہان ہی مضراب بن کر سازِ ہستی کے نفسیاتی اور وجدانی تاروں کو چھیڑتا اور انسان کو بن دیکھے خدا کی معرفت عطا کر سکتا ہے۔

پس جب وہ خدا کی مقدس ہستی پر ایمان و اذعان کا طالب ہوتا ہے تو صغریٰ و کبریٰ اور نتیجہ کی ترتیب اور قضایا کے باہمی ارتباط سے بے نیاز ہو کر عالمِ محسوسات کے اُن سادہ نقوش کو پیش کرتا ہے جو خود بخود ایک غیر جانبدار غیر متعصب اور خالی الذہن ذی عقل کے وجدان کو اپیل کرتے اور عقل و شعور

کو بیدار کر کے اپنی صداقت کا خراجِ تحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۔ ہم نے تم کو بنایا پھر کیوں نہیں سچ مانتے بھلا دیکھو
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ تو جو پانی تم ٹپکاتے ہو کیا تم اس کو بناتے ہو یا ہم
اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ بنانے والے ہیں ہم ٹھہرا چکے تم میں مرنا اور ہم عاجز
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نہیں اس بات سے کہ بدلہ میں لے آئیں تمہاری
نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں جہاں
لَا تَعْلَمُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ تم نہیں جانتے اور تم جان چکے ہو پہلی پیدائش پھر
الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا کیوں نہیں یاد کرتے بھلا دیکھو تو تم اس کو کرتے ہو
تَحْرُثُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ کھیتی یا ہم اس کو کھیتی بنانے والے ہیں اگر ہم
الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندی ہوئی گھاس
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے کہ ہم تو
نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ قرضدار رہ گئے) بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے۔ بھلا
تَشْرَبُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو اتارا
اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا بیچ بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے اگر ہم چاہیں
فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تو کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے
تُوْرُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو کیا تم نے پیدا
اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا کیا اس کا درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے ہم نے
تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۔ فَسَبِّحْ ہی تو بنایا وہ درخت نصیحت دینے کو اور برتنے کو
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۔ (الواقعہ) جنگل والوں کیلئے، تو اپنے رب کی پاکی بیان کر جو سب سے بڑا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان اپنی ذات اور اپنے وجود پر نظر ڈالے اور سوچے کہ توالد و تناسل کا یہ سلسلہ جس کا ایک ظہور خود بھی ہے کس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے کیا انسان کو مادہ نے یہ ہیولیٰ

عطا کیا ہے، یہ چشم وابرو، یہ رخِ روشن، یہ بازو اور یہ جسم کا تناسب اس کا بخشا ہوا ہے اور پھر اس جسم خاکی میں زندگی اور حیات کیا ہے اور کس کا عطیہ ہے اور حیاتِ انسانی میں مادی ساخت کے ساتھ عقل و شعور، جذبات واحساسات، ادراکات وخواہشات کا یہ تلاطم کیا اندھے بہرے "مادہ" اور اس کی حرکت کا صدقہ ہیں یا انسان نے انسان کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے اور یا پھر انسان سے کمتر مخلوق اپنے سے اعلیٰ مخلوق کی ایجاد کی ضامن ہے؟ جب مادہ عقل وشعور اور جذبات وادراکات سے خالی ہے تو لطیف سے لطیف شکل میں بھی اس سے ایک ایسی شے کس طرح وجود میں آسکی جو اس کی اپنی بنیاد ہی میں موجود نہیں۔ درخت کی گٹھلی میں جبکہ نطق اور عقل کا وجود ہی نہیں ہے تو درخت یا اس کے برگ وبار میں نطق وعقل کی تلاش ایک عبث فعل ہے البتہ گٹھلی میں گو بالفعل برگ وبار اور درخت کا تنہ موجود نہیں ہے تاہم درخت اور درخت کے پھل پھول لطیف بالطیف تر مادہ ہی ہیں اور بس تو عقل بسہولت فیصلہ کر سکتی ہے کہ گٹھلی میں مستور مادہ نے یہ سب کچھ رنگ وروپ اختیار کر لیا ہے۔

غرض جبکہ عقل، شعور، جذبات، ادراکات "مادہ کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اور کسی دوسرے عالم کی شے نظر آتے ہیں تو ان کو بے جان اور بے کیف مادہ کی پیداوار کیسے کہا جا سکتا ہے؟ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ توالدوتناسل کا یہ سلسلہ گو مسلسل جاری نظر آتا ہے لیکن انسان کو جنسی تقاضا کے پورا کرنے کے علاوہ تخلیقِ انسانی میں مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ عام طور پر وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں "انسان" نشو ونما پا رہا ہے یا کوئی انوکھی قسم کی مخلوق ہے اور یہ تو گمان بھی نہیں ہو سکتا اور عقل اس کو باور کر ہی نہیں سکتی کہ انسان جیسی اشرف مخلوق جو کائنات کا خلاصہ ہے اپنے سے پست مخلوق کی صناعی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے تو اب اس کے سوائے اور کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مکرم ومشرف ہستی کو کسی ایسی بلند تر ہستی نے بنایا ہے جس کا ید قدرت (انرجی) کائنات کی قدرت (انرجی) سے زیادہ قوی اور عقل وشعور اور ادراکات سے بلند قوت کا سرچشمہ ہے۔

پس اگر اس فکر ونظر کے ساتھ اپنی اور کائنات کی خلقت پر غور کروگے تو یہ یقین کرنا ہوگا کہ نظامِ عالم کی یہ تمام کارفرمائیاں ایک صاحبِ ارادہ، صاحبِ قدرت اور صاحبِ حکمت ہستی کے

ارادہ وحکمت اور قدرت واختیار کے بے قید تصرفات کے زیر اثر ہیں اب تم کو اختیار ہے کہ وحی الٰہی کے "برہان" کی روشنی میں اس قادر مطلق ہستی کو خدا کہو اور صاف الفاظ میں اذعان ویقین محکم کے ساتھ ذاتِ واحد پر ایمان لے آؤ یا برہان رب سے منہ موڑ کر اس کا کوئی دوسرا نام تجویز کر لو کیونکہ قانون کی تبدیلی سے حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہتی ہے تبدیل نہیں ہو جاتی۔

پھر غور کرو زندگی اور موت کے فلسفہ پر آخر یہ کیا ہے کہ تم ہمیشہ زندہ رہنے کے ہزار جتن کرو تب بھی تم کو پنجۂ موت سے چھٹکارا نصیب نہیں کیا یہ اس لئے نہیں ہے کہ تمہاری زیست وموت خود تمہارے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور اگر اس کو اسبابِ مادی کے ساتھ وابستہ بھی کیجئے تب بھی اس کا کوئی حل نہیں ہے کہ فلاں سبب کے ساتھ ہی موت کیوں وابستہ ہوئی اور بالآخر اس "کیوں" اور "کیا" کا جواب اس پر جا کر ختم ہو جاتا ہے کہ قدرت کا قانون اسی طرح کام کر رہا ہے لیکن جب "کیوں" کا یہی سوال قانونِ قدرت پر وارد کیا جاتا ہے تو پھر ذہن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں رہتا۔ اور اس مقام پر پہنچ کر تمام فلسفہ پر سکوت، وخاموشی کی موت طاری ہو جاتی ہے تو اس وقت اس جواب کا تسلی بخش جواب "برہان رب" ہی دیتا ہے اور ایک ابدی وسرمدی ذات (وحدہ لاشریک لہ) کا تصور پیدا کر کے "کیوں" کے تمام سوالات کا حل اسی ایک آشکارا حقیقت سے دیکر تمام گتھیاں سلجھا دیتا ہے۔

اپنے نفس کے بعد اب کائنات کی دوسری اشیاء پر غور کرو پانی کس نے پیدا کیا اور مادہ نے پانی کی شکل کیوں اختیار کی اور بدنظمی اور بے کیف عملی زندگی سے ایسا عالم وجود میں کیوں نہ آسکا کہ سمندر کا پانی میٹھا ہو جاتا اور تمام دریاؤں اور کنوؤں کا پانی کھارا بن جاتا یا دونوں شیریں ہو جاتے یا دونوں نمکین ہی نظر آتے۔ آخر اس نظم کی تہ میں کون سی ذی ارادہ وبااختیار صاحبِ حکمت ہستی کارفرما ہے کہ جس نے سمندر کے پانی کو اس لئے نمکین اور تلخ بنا دیا کہ بند رہنے اور حدود میں مقید رہنے کی وجہ سے سڑ نہ جائے اور دریاؤں اور کنوؤں کا پانی اس لئے شیریں بنایا کہ اس سے ذی روح مخلوق کی تشنہ لبی کا سامان میسر آجائے پھر اس پانی سے کھیتوں کو سیراب کر کے مادی زندگی کے کل سامان خور ونوش کا انتظام کس نے کر دکھایا اور یہی نہیں بلکہ سرسبز وشاداب درختوں میں سے آگ پیدا کر کے کس نے زندگی کے

لوازمات کی تکمیل کی یہ سب باتیں سوچنے اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے ہیں کہ کائناتِ ہست وبود کا یہ منظم کارخانہ بے جان وبے شعور مادہ اور اس کی حرکت کا نتیجہ وثمرہ ہیں یا بے اختیار انرجی کا صدقہ ہیں، یا یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور دراصل یہ سب کچھ بااختیار واحد ہستی کے ارادہ واختیار اور قدرتِ کاملہ کا مظہر ہیں۔

غرض انسان کی تخلیق، اس کی حیات وموت، اس کی جانشینی ووراثت کا سلسلہ، نیز آگ پانی، خورونوش کے لئے زراعت وپیداوار اور ان سب میں ترتیبِ نظام وتکمیل کار ایسی بات نہیں ہے کہ فکر ونظر یہ فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتی ہو کہ اس نظم ونظام اور ترتیب وتکمیل کی نسبت کسی بے جان وبے شعور شے کی جانب کرنا عقل وخرد کو ناکارہ ثابت کرنا ہے بلکہ اس کی صحیح نسبت اُس ہستی کے ساتھ منسوب ہونی چاہئے جس کا نام اللہ ہے اور جس نے انسان کی عارضی اور ابدی فلاح کے لئے نظامِ عالم کے ان اصولوں کو محکم ومضبوط اور اٹل بنا کر کارخانۂ عالم کو استواری بخشی اور درہم برہم ہونے سے محفوظ رکھا۔

چنانچہ "برہانٌ من ربکم" کی یہی وہ تفسیر ہے جو قرآن حکیم کے استدلالات کے سلسلہ میں خدا کے وجود اُس کی توحید، الہیات کے مسائل اور معاش ومعاد کے حقائق سب ہی کے اندر روشن وتاباں نظر آتی ہے اور صاحبِ وجدان سلیم کے لئے راہِ حق کی جانب راہنما ہی ہے۔

فرقان | بیشک قرآن عزیز روشن ودرخشاں "برہان" بلکہ "برہانِ رب" ہے۔ تاہم برہان یعنی حجت ودلیل کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معرکۂ حق وباطل کے درمیان امتیاز کے لئے ہی استعمال کی جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایسی شے کے ثبوت پر دلیل وبرہان قائم کیا جائے جس کا نہ کسی نے انکار کیا ہو اور نہ وہاں دو متضاد اعتقادات کارفرما ہوں بلکہ ایک امر کے وجود وثبوت کے لئے صرف اس لئے دلیل وبرہان پیش کیا گیا کہ وہ موجود ہے اور ثابت ہے اس لئے کسی برہان کی قوتِ تاثیر اور قدرتِ نفوذ کا بہترین مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ دو متضاد اور متخالف اعتقادات ونظریات پیشِ نظر ہوں اور برہان ودلیل کی اس لئے ضرورت پڑے کہ وہ فیصلہ کردے کہ حق کس کی جانب ہے اور باطل کا رخ کس طرف ہے۔ برہان کا یہ وظیفہ بہت اہم اور نہایت نازک ہے اور اس لئے جس قدر بھی روشن اور واضح

برہان ہوگا اُسی قدر یہ امتیازی حقیقت صاف اور بے لوث نمایاں ہوکر سامنے آئے گی۔ چنانچہ قرآن عزیز اعلان کرتا ہے کہ میرے "برہانِ رب" ہونے کا صرف یہی منشا نہیں ہے کہ میں کسی شے کے ثبوت و وجود پر دلائل اور شواہد و نظائر پیش کرکے ایک مسلمہ حقیقت کو عریاں کر دیتا ہوں بلکہ اُس نازک سے نازک اور اہم سے اہم مواقع پر جبکہ حق و باطل یا نور و ظلمت کے درمیان معرکۂ رزم بپا ہو تو ان کی آویزشوں کے پردہ ہائے مستور کو چاک کرکے حق و باطل کے درمیان اس طرح فرق و امتیاز پیدا کر دیتا ہوں کہ اگر انسان عقل و خرد سے بیگانہ نہ ہو تو نظر و فکر بسہولت اس کو آفتاب عالمتاب کی طرح دیکھ لیتی اور حقیقت کو دروغ سے جدا پالیتی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ میرے "برہانٌ من ربکم" کا طغرائے امتیازی یہ ہے کہ کائناتِ انسانی جب ورطۂ ظلمت میں گم ہوکر راہ نور کو گم کر دے یا باطل کے بادلوں میں حق کو نہ دیکھ سکے اور حیران و سرگرداں ہوکر برقِ تاباں کی منتظر ہو تو عالمِ روحانیات کا پردہ چاک کرکے میں سامنے آتا اور گم کردہ راہ کو منزلِ مقصود کی راہ دکھاتا ہوں۔ اس لئے میں فقط برہان نہیں ہوں بلکہ "الفرقان" بھی ہوں یعنی وہ مشہور و منتظر دلیلِ راہ اور برہانِ صراط ہوں جس کی راہنمائی کے بعد باطل کی تاریکیاں چھٹ کر حق روشن ہو جاتا اور ظلمت کے پردے پھٹ کر نور برق پاشی کرنے لگتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ	برکت والی ہے وہ (خدا) کی ذات جس نے اپنے بندہ
الْفُرْقَانَ عَلٰى	(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر حق و باطل کے درمیان
عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ	فرق و امتیاز پیدا کرنے والی کتاب نازل کی تاکہ وہ
نَذِيْرًا۔	بندہ تمام جہانوں کے لئے خدا کی جانب سے بُری
(فرقان)	باتوں پر ڈرانے والا (رسول) ہو۔

قرآن "الفرقان" ہے یعنی حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنا اس کا طغرائے امتیاز ہے کیونکہ جب کائناتِ انسانی کے سامنے یہ نازک حقائق آتے ہیں کہ توحید حق ہے یا شرک، ایمان و اسلام صحیح ہے یا کفر و جحود، انبیاء و رسل کی بعثت ایک فطری تقاضا ہے یا جبری انقیاد و تسلیم، ماوراء محسوسات

کچھ نہیں ہے یا بہت کچھ ہے، ہر شے جو حواس و عقل سے بالاتر ہو قابلِ انکار ہے، یا مخبرِ صادق کی خبر مر لائق قبول، وحی الہی رحمت ہے یا زحمت، معاشی مسائل کے حق اور باطل ہونے کا معیار کیا ہے اور معاشرہ کی صحت و سقم کی کسوٹی کا علم کس طرح ہو سکتا ہے، ان تمام حقائق و دقائق کی گرہ کشائی کے لئے قرآن ہی سچا راہنما اور ہادی ہے اور یہی وہ فرقان ہے جو ہر پیچیدہ مسئلہ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتا اور کھرے کو کھوٹے سے ممتاز بنا دیتا ہے۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب قرآن نے توحیدِ خالص کو پیش کیا اور دینِ الہی کے لئے اُس کو اساس و بنیاد ظاہر کیا تو ملت نے اس کے نظریہ کو تعجب سے دیکھا اور کشمکشِ حق و باطل میں الجھکر حق کی روشنی کو نہ پا سکے چنانچہ قدیم ہندوستان کے باشندوں (سناتن دھرم) نے کہا کہ کروروں دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ہم اس لئے نہیں کرتے کہ کسی غیر خدا کو خدا مانتے ہیں بلکہ خدا کو بہ شکل انسان دیوتا مانتے ہیں جس نے اپنی صفاتِ ذاتی کو انسانی شکل عطا کر دی اور گویا خود خدا بشکلِ انسان (اوتار) بن کر آگیا ہے یا انسان ابنِ خدا ہو کر جزء خدا بن گیا ہے اور یا پھر مقدس اور برگزیدہ خدا انسانوں کی مورتیاں ہیں یا اجرامِ ارضی و سماوی ہیں جو نفع و ضرر میں خدا کی صفات کے مالک اور قادرِ مطلق کی طرح کائنات پر متصرف ہیں اور یا اُن کی پرستش خدا کی خوشنودی اور قربت کی کفیل و ضامن ہے تو ان تفصیلات کے بعد اگر ہم ایک قادرِ مطلق ہستی خدا کو واحد تسلیم کرتے ہوئے ان سب کے ساتھ خدا کی طرح کا معاملہ کرتے ہیں تو کیوں ہم کو مشرک کہا جاتا اور توحید کا منکر تسلیم کیا جاتا ہے خصوصاً جبکہ ہم میں ایسی جماعتیں بھی ہیں جو خدا کے علاوہ نہ کسی کو اوتار مانتی ہیں اور نہ خدا کا بیٹا ان کو نہ کائنات پر قادر و متصرف تسلیم کرتی ہیں اور نہ مورتی پوجا پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ البتہ خدا کی طرح مادہ اور روح کو بھی ازلی و قدیم یقین کرتی اور اپنے وجود میں خدا کی طرح دوسرے سے بے نیاز تسلیم کرتی ہیں۔

غرض جب ہم سب خدا کی ایک ہستی کو بالاتر مانتے ہیں تو خدا سے باہر خدائی صفات کا مالک سمجھکر اگر بعض اشیاء کے ساتھ وجود و ہستی میں یا تصرف و اختیار میں خدا کی طرح تسلیم بھی کر لیں تو اس سے توحید کے خلاف شرک کس طرح لازم آجاتا ہے اور قرآن کس لئے مشرک کہہ کر ہم کو "توحیدِ خالص"

کی دعوت دیتا ہے۔

اُس وقت قرآنِ عزیز اُن کے تعجب کو باطل اور امرِ حق کو واشگاف کرنے کے لئے برہان کی اُس نازک، اہم اور وقیع نوع "فرقان" کو تیغِ بے نیام بناتا اور ان کی جانب مخاطب ہو کر یہ کہتا ہے۔

تم نے "توحید" کی حقیقت سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر اس حقیقت کے رخ روشن سے پردہ اُٹھ جائے تو سب ہی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ تم کہتے ہو کہ خدا کی ہستی کو واحد اور بالاتر مان کر اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ خدا بشکلِ انسان ظہور پذیر ہو سکتا اور انسانی جسم لے سکتا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ جو ہستی انسان کا روپ دھارن کر سکتی ہے تو اس میں انسانی صفات بھی ضرور پائے جائیں گے اور بشری صفات میں حاجت اور ضرورت اس کی نمایاں صفت ہے جو قدم قدم پر ظاہر ہوتی اور اس کی بشریت پر احتیاج کا ٹھپہ لگاتی ہے۔ پس اگر اوتار کا عقیدہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا بھی دوسروں کا محتاج اور ضرورتمند ہے حالانکہ خدا تو اس ہستی کا نام ہے جو "صمد" یعنی ہر قسم کی حاجات سے "بے نیاز" ہے اور ہر قسم کے خلاء سے بالاتر ہے کہ اس کے پُر کرنے کی ضرورت پیش آئے لہٰذا فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اگر خدا صمد ہے تو وہ بشری شکل وصورت اور اوتار کے فرضی عقیدہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا اور اگر وہ صمد نہیں ہے تو پھر اس کو خدا کہنا ہی بے معنی اور لغو ہے اس لئے کہ دورخی صفات سے اس کی ذاتِ اقدس اعلیٰ وبالا ہے۔ پھر جب وہ "واحد" اور "لا شریک لہٗ" ہے تو یہ کیسے سمجھ میں آسکتا ہے کہ جو اپنی ذات میں یکتا و بے ہمتا ہو، اُس کے تقرب اور اس کی رضا و خوشنودی کے لئے جب تک ہم اُسی کی طرح دوسری مخلوقات کی پرستش نہ کریں اور ان کو خدا کا درجہ نہ دیں یا اُن کی مضرت اور ان کے نفع کو خدا کی مضرت و نفع کا قائم مقام نہ سمجھیں اُس وقت تک اُس کی پرستش اور تقرب کا حق ادا نہیں ہو سکتا بلکہ عقلِ سلیم تو یہ راہنمائی کرتی ہے کہ اگر یہ سب کارخانۂ ہست و بود اُسی کے قدرت و اختیار کا کرشمہ ہے تو نفع وضرر کا معاملہ بھی براہِ راست اُس کے ہاتھ میں ہے اور پرستش و عبادت کے لائق بھی وہی اور صرف وہی ذاتِ والاصفات ہے اور اس کے علاوہ اُسی کی طرح دوسروں کی پرستش اور دوسروں کے ساتھ خوف ورجا کا اعتقاد درحقیقت اس کی

ذات احدیت کے منافی ہے۔

اسی طرح روح یا مادہ یا دونوں کو اسی کی طرح ازلی و قدیم اور "خود آ" سمجھنا دوسرے الفاظ میں اس کا اقرار کرنا ہے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ ایک سے زائد ہے، اس لئے کہ خدا کی وہ امتیازی صفت کہ جس سے خدا دوسروں سے بے نیاز اور خود موجود ہے اور وہ اپنی ہستی میں کسی کے وجود کا نیاز مند نہیں، صرف خدا کے لئے ہی نہیں رہتی بلکہ مادہ اور روح بھی اس کے ساتھ اس ذاتی صفت میں شریک ہو جاتے ہیں غرض کوئی صاحب عقل یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک ہستی کو "وحدہ لاشریک لہ" بھی تسلیم کیا جائے اور پھر اس کی ذاتی امتیازی صفات میں بھی دوسروں کو شریک و سہیم بتلایا جائے۔

اور یہ دعویٰ تو عالم رنگ و بو کی بوالعجبیوں میں ایک حیرت زا بوالعجبی ہے کہ خدا ایک بھی ہے اور بے نیاز بھی ہے مگر وہ تین بھی ہے اور اولاد کا محتاج بھی ہے اگر ریاضی کے مسلمہ مبادیات میں سے یہ بات غلط ہو چکی ہے کہ "ایک" "تین" نہیں ہو سکتا اور "تین" "ایک" نہیں ہے تو پھر باپ، بیٹا، روح القدس کو اقانیم ثلثہ کہہ کر ایک کو تین اور تین کو ایک کس طرح تسلیم کرایا جا سکتا ہے، کیا جو شے مرکب ہو کر معجون کی طرح ایک مزاج اختیار کر لیتی ہے اسی طرح باپ، بیٹا، روح القدس نے بھی اجزاء ترکیبی ہو کر ایک مزاج اختیار کر لیا ہے اور اسی مرکب کا نام خدا ہو گیا ہے کیا یہ ہے خدا کی وہ مقدس ہستی جو سب سے بالاتر ازلی قدیم ہے ان ھذا لشئ عجاب" خدا تو اسی کو کہہ سکتے ہیں کہ نہ وہ اپنی بقار میں نسل و اولاد کا محتاج ہو اور نہ اپنے وجود میں باپ کا رہین منت۔

اسی طرح عقل یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ خدا کی ہستی کو دو متضاد عناصر میں تقسیم کر کے نیکی اور بدی یا ظلمت اور نور کا جدا جدا خالق و مالک قرار دیا جائے اور اس طرح وحدانیت کو ثنویت میں ڈھال کر دو خدا ہونے کا صاف صاف اقرار کیا جائے۔ کیونکہ خدا اگر رقیب رکھتا اور مخالف طاقت کا معاصر حریف ہے تو پھر ایسے خدا کی کائنات کو حاجت ہی کیا ہے جو دنیا خود ہی متضاد عناصر کا مجموعہ ہو اس میں اگر ایک مزید قوی تر دو حریفوں اور رقیبوں کا اضافہ ہو جائے تو دنیا کو کیا ضرورت ہے کہ ان کو اپنا خالق و مالک اور بے ہمتا خدا تسلیم کرے۔

پس تاریخ ادیان وملل نے اپنی اپنی صحیح تعلیماتِ حق کو فراموش کر کے " توحیدِ خالص" کے مسئلہ میں ٹھوکر کھائی تو قرآن کہتا ہے کہ میں اسی لئے پیغامِ حق بن کر آیا ہوں کہ اس ٹھوکر پر متنبہ کروں، اور قعرِ ضلالت میں گرنے سے بچالوں وہ کہتا ہے کہ خدا کا صحیح تصور یہ ہے کہ " اللہ احد " "خدا اکیلا" ہے یعنی وہ صرف ایک ہی نہیں ہے کہ دوئی کا کوئی تصور بھی اس میں سما سکے بلکہ وہ تو " اکیلا" ہے اردو میں " ایک " اور " اکیلا" کے درمیان یہی فرق ہے کہ دوسرے لفظ کے ساتھ کسی طرح دوئی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ پس غور کرنا چاہیئے ہندوستان کے قدیم مذہب کے تمام اسکولوں کو کہ خدا بے نیاز ہستی کا نام ہے " اللہ الصمد " اس لئے وہ نہ " اوتار" بنتا ہے اور نہ مورتیاں خدا کی جگہ عبادت و پرستش اور حاجات روائی کے لئے محور و مرکز بن سکتی ہیں۔

غرض صمد اسی ذات کو کہتے ہیں جو اجرامِ فلکی ہوں یا اجسامِ ارضی سب سے بالا تنہا خود ہی احدیت احدیت کا محور اور عبادت و پرستش اور حاجات روائی کا مرکز و مرجع ہے۔ اسی طرح یورپ کی پاپائیت اور عیسوئیت کے تمام اسکول اور شام و فلسطین کی یہودیت کے تمام بنیادی مسالک کو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ خدا کا تصور ولد اور والد جیسے انتسابات سے منزہ اور پاک ہے نہ وہ وجود میں کسی کا محتاج ہے اور نہ بقا میں کسی کا رہینِ منت۔ چہ جائیکہ وہ اقانیم ثلثہ یا ثنویہ کا محتاج ہو " لم یلد ولم یولد " نیز مادہ و روح کو ازلی قدیم کہہ کر یا یزداں و اہرمن کو دو متضاد اور رقیب خدا بنا کر خدا کا سہیم و شریک بنانا اور خدائے برتر کی امتیازی اور ذاتی صفت قدامت و ازلیت اور " خود آ " ہونے میں دوسروں کو جگہ دینا بھی خدا کے تصور کی غلط اور گمراہ کن تصویر ہے اور جو اس تصویر کے نقوش میں رنگ بھرتا ہے وہ درحقیقت توحید کا اقرار کرنا تو کجا توحید کے خلاف ثنویت و تثلیث کا دوسرا نقشہ تیار کرتا ہے۔ لہذا ایسے تصوراتِ باطل کو مٹانے کے لئے یہ حقیقی تصور درکار ہے " ولم یکن لہ کفواً احد " یعنی خدا ایک ایسی بلند و بالا ہستی کا نام ہے جس کی ذات میں تو کجا ذاتی و امتیازی صفات میں بھی رقابت و حریفانہ مشارکت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ " ایں خیال است و محال است و جنوں " کا مصداق ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدیجئے اللہ اکیلا ہے،
الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کو جنتا ہے اور نہ کسی سے
يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا جنا جاتا ہے (یعنی نہ باپ ہے نہ بیٹا) اور نہ اُس کا
اَحَدٌ ۝ (اخلاص) کوئی ہمسر وہمتا ہے۔

سورۂ اخلاص کی ان مختصر مگر جامع اور معجز آیات نے کس طرح توحید خالص پیش کرتے ہوئے کائناتِ انسانی کے ادیان وملل کی تاریخ میں انقلابِ عظیم برپا کردیا اور کس طرح اس مسئلہ کی تمام گمراہیوں کو بیان کرتے ہوئے حقیقت کو واضح کردیا اور سمندر کو کوزہ میں بھر دیا یہ ایک طویل روئداد کا طالب ہے یہاں جس کے لئے گنجایش نہیں ہے تاہم بغیر تاویل وتنقیح کے یہ چند آیات تمام ادیان وملل کی اُن ٹھوکروں کا پردہ فاش کرتی ہیں جو انھوں نے توحید کے تصور میں قدم قدم پر کھائی ہیں اور اسی لئے اس کا یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ وہ صرف "برہان" ہی نہیں ہے بلکہ "الفرقان" بھی ہے۔ توحید اور اس کے علاوہ الہیات کے مسائل ہیں نیز ان تمام مسائل میں جو انسان کی معاشرت ومعاشیات سے گہرا تعلق رکھتے اور انسانی سماج کے بقاء وتحفظ کی روحِ رواں سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن نے دنیا انسانی کی گمراہیوں اور لغزشوں کو واضح کرکے حق وباطل کے درمیان امتیاز پیدا کردیا ہے اور جگہ جگہ اُن کو دہرا کر موعظت ونصیحت کا حق ادا کیا ہے اور یہی اس کا وہ طغرائے نیاز ہے جو خدائے برتر کے سماوی پیغامات کی طرح اور پھر اُن پر ممتاز وفائق ہوکر اُس کو "الفرقان" کے لقب سے ملقب ومفتخر کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

اسلام میں رسول کا تصور

(از جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی)

اسلام میں خدا کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب سے جداگانہ اور بالاتر تصور ہے یہاں انسانِ کامل کی آخری سرحد اور لاہوت و جبروت کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں نکلتا۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تصور کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول و اتحاد، ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنی سے اُس کو احد و صمد کہا جاتا ہے ؎

دور بینانِ بارگاہِ الست　　بیش ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست

رسول، اوتار اور بروز

اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکلِ انسانی میں جلوہ نما ہو۔ رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق ناممکن اور محال ہیں۔ عام حیوانات کو دیکھئے قدرت نے اُن میں بھی ہر ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور صورتیں بنائی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے ان ہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ — نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے
الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ — آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک چیز ایک چکر میں
كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ — پڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے، سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ ارتقار (Evolution.) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کی کسی کڑی کا عالمِ قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبہ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسانِ کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتبِ قرب کے باوجود الوہیت کے شائبہ سے یکسر بری ہوتا ہے۔

انسانیت رسول کا ایک کمال ہے

رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ الخ یہاں امتنان واحسان کے موقع میں منجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے۔ بعثت رسول اس انعام کے لئے سرزمینِ عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔

حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کے لئے دعا فرمائی تو انھوں نے بھی اس اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ اے ہمارے رب ان میں رسول بھیج جو انھیں میں سے ہو

پھر جب اس دعاء مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاء خلیل میں لفظ "منہم" کی استجابت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ "من انفسہم" سے ذکر کیا گیا ہے "لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولا من انفسہم" یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جن سے انھیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے، انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریشی میں ہاشمی بنایا مگر ان چندر چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتدا میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتلا دیا گیا تھا۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں کے رسول
يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ آئیں کہ تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر
اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ سنائیں تو جو تقوی کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ تو ان پر نہ کوئی خوف و ہراس اور نہ کوئی غم۔

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثتِ رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی وعدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوت کے لئے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا، اس کے بعد جب خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس درمیان میں دنیا کی مقررہ عمر آخر ہونے لگی، ادھر رسولوں کی مقررہ تعداد بھی پوری ہوگئی، اس لئے آخری رسول کو بھیج کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور بساطِ عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا گیا

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَ اللہ تعالی نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور
آلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان پر

ذریۃ بعضھا من بعض   جو ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔

اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے کوئی رسول ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہوتا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ نصاریٰ کی نظروں میں کچھ مشتبہ تھا اسی کو ذریۃ بعضہا من بعض کہکر صاف کر دیا گیا ہے یعنی جب وہ بھی انسانوں ہی کی اولاد تھے تو یقیناً ان کو بھی انسان ہونا چاہیئے۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے نسلِ انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے اس لئے خود رسول اور نوعِ انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہو

لفظ رسول کی تشریح رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لئے خود لفظِ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرتِ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خطِ فاصل ہیں۔ اسی لئے خدائے تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظِ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآنِ کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ سے پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ ــــ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) وما محمد الا رسول ــــ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کئے ہیں۔ وجود کا نقطۂ اول۔ حقیقۃ الحقائق۔ برزخیۃ کبریٰ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے تکرار سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہو گئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا دریافت نہ ہو سکا جتنا کہ لفظِ رسول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا، اس کے لوازم

سب کے ذہن نشین ستھے، اس کے فرائض وخدمات سب کو معلوم تھے، اس کی شخصیت واحترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش وکرم کے سوا، برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اس لئے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہدیتا کہ میں احکم الحاکمین، ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں۔ بس اسی ایک نقطہ سے سامعین کے دلوں میں ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں، محبت وتوقیر، اطاعت وحکمبرداری کے وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لئے امنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنا چاہئیں۔ اس لئے محبت واطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر وشرک کے گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا۔

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے

درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوا رسول کی محبت واطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبتِ رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے اس کی اطاعت ومحبت خدا ہی کی محبت واطاعت ہوجاتی ہے اسی لئے فرمایا

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا

یعنی اصل حکمبرداری تو خدا کی چاہئے۔ ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکمبرداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت ومحبت کے بغیر، خدا کی محبت واطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں۔ اور اس طرح یہ اطاعت ومحبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول ووکیل

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوگیا کہ رسول خدا نہیں، اس کا اوتار و بروز نہیں اور اس کا بیٹا بھی نہیں۔ اب یہ سنئے کہ وہ اس کا وکیل ومختار بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام

دینے کے لئے دو لفظ ہیں۔ (۱) رسول (۲) وکیل — ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لئے ہوتا ہے اپنے لئے نہیں ہوتا، مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے۔ اسی لئے خصومت و جوابدہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اُس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو قوانین میں ترمیم و تنسیخ بھی کر ڈالے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گو بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے قرآنِ کریم نے بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنھیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اُس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔

اب آیاتِ ذیل کو پڑھیے:۔

اللہ خالق کل شیٔ وھو علیٰ کل شیٔ وکیل۔	اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی سب کا وکیل و کارساز ہے۔
وللہِ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکفیٰ باللہِ وکیلا۔	آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے اور سب کے لئے خدا کی ذات کارساز کافی ہے۔
الا تتخذوا من دونی وکیلا	"میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل و کارساز مت بناؤ"
قُل لستُ علیکم بوکیل۔	"آپ کہد یجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، رسول مقرر ہوا ہوں۔

من اهتدى فانما يهتدى لنفسه "جوراہ یاب ہوا اپنے فائدہ کے لئے اور جس نے
ومن ضل فانما يضل عليها وما انا گمراہی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر
عليكم بوكيل۔ وکیل ومختار مقرر نہیں ہوا کہ جوابدہی میرے سر ہو۔"

بلغ ما انزل اليك "جو آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے
من ربك۔ وہ آپ پہنچا دیجئے۔"

ان عليك الا البلاغ۔ آپ کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔

أبلغكم رسالات ربي "میں اپنے پروردگار کے پیغامات تمہارے پاس
پہنچائے دیتا ہوں۔

قل ما يكون لي ان ابدله آپ کہدیجئے کہ یہ میری طاقت نہیں ہے کہ میں قرآن کریم
من تلقاء نفسي ان اتبع کو اپنی طرف سے بدل ڈالوں، میرے پاس تو جو حکم
الا ما يوحى الي۔ آئے اس کا تابعدار ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ پہنچا دے اور بس۔ شریعت کے ایک شعشہ اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں۔ کسی کی ہدایت وگمرہی کا بار اس پر نہیں اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جواب دہ ہے جہاں تک کارخانۂ عالم کی ذمہ داری وکارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت ووکالت خدا تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت وضلالت کی جوابدہی اُسے خود براہ راست کرنی ہے، جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدا تعالیٰ کا باتیں کرنا طورِ خالقیت کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح

دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے بلا واسطہ کلام نہیں کیا کرتے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہِ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا بلکہ اس کے لئے کچھ ہستیاں منتخب کرلی ہیں جو اس کی نظر میں اس کے لئے اہل بنائی گئی تھیں پھر اُن میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اُس سے باتیں کرلیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنی ہمکلامی کی صورتیں مقرر کردی ہیں۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا	کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس سے
وحیًا او من وراء حجاب	باتیں کرسکے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی
او یرسل رسولا فیوحی باذنہ	فرشتہ بھیجے پھر وہ خدا کے حکم سے جو اُس کو منظور ہو
ما یشاء (الشوری — ۶)	اس کا پیغام پہنچا دے۔
وما کان اللہ لیطلعکم علی	یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو براہِ راست
الغیب ولکن اللہ یجتبی من	غیب کی خبر دیدیا کرے لیکن اس کے لئے اللہ تعالیٰ
رسلہ من یشاء (آل عمران — ۹)	اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔
عالم الغیب فلا یظہر علی	"وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی باتیں
غیبہ احدًا الا من ارتضی من	کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر ہاں جس رسول کو چاہے
رسول۔	پسند کرلیتا ہے"۔ (اور انھیں جو بات بتلانا چاہے بتلا دیتا ہے)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لئے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لئے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدا تعالیٰ سے جس طرح چاہیں مشافہۃً کلام کرسکیں اس لئے اُن سے کلام کرنے کی بھی صرف چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ متکلم خود ذات پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پسِ پردہ ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے اس کی

دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نبی خود بشریتہ سے ملکیتہ کے قریب آجائے۔ دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریتہ کے قریب آجائے۔ ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لئے کلامِ الٰہی کی شوکت و طاقت رسول کے لئے قابلِ برداشت ہو جاتی ہے اگر کہیں آمنے سامنے آکر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر برباد ہو جائے۔

رسول اور مصلح ریفارمر

جس طرح کہ رسول وکیل و مختار نہیں ہوتا اسی طرح وہ صرف ایک مصلح و ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے۔ ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت و دلسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم و فراست، ہمدردی اور نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح و ریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتبا و اصطفا کے ماتحت ہوتی ہے، ان کی ہر نشست و برخاست ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفتِ عصمت حاصل ہو جاتی ہے ایک مناسب عمر پر وہ خود انہیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے — ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے نہ عام انسانوں کے عقائد و اعمال سے کوئی ذمہ دارانہ سروکار رکھتا ہے۔ اس کی دعوت میں کوئی تدریج، کوئی تمہید نہیں ہوتی، وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اسے کیا کہنا ہے۔ وہ بالکل خاموش خاموش نظر آتا ہے اور جونہی کہ منصب رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس طرح ہوتا ہے کہ کسی کا خوف و خطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر نظر ہے یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر

بھاگ رہے تھے، یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اُسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آر ہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لئے؟ اُس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کہ یا عزلت نشینی تھی کہ غار حرا میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں، کوئی مجمع نہیں، کوئی محفل نہیں، جہاں دنیا کی اصلاح و خبر گیری کے لئے آپ چیخ نہ رہے ہوں، خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسب و اکتساب تکلف و تصنع کی تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دستِ قدرت کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں

رسالت ایک قسم کی سفارت ہے، ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے مگر ہر قابل انسان کے لئے سفیر ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔

خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر جائیے ان کی زندگیوں کا ورق ورق لوٹ جائیے مگر قرآن و حدیث سے کہیں ثابت نہیں ہو گا کہ کسی کو منصب رسالت کسی رسول کی اتباع و اطاعت کے صلہ میں ملا ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہو گا کہ بوقت ضرورت براہِ راست ان کو اس منصب سے نواز دیا گیا ہے بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتلاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطہ سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما، جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح اور کافروں میں اول مسلم بن کر آتے ہیں۔ رسالت سے پہلے بھی ان کا دامن شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکات ادیان سماویہ میں ناقابلِ برداشت ہیں وہ نبوت و رسالت سے پہلے بھی

ان سے دور ہی دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک وصاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ریاضت وعبادت اس لئے نہیں ہوتی کہ انھیں رسول بننا ہے بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک وصاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لئے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی یہی زندگی اس کی تصدیق کا بڑا سامان ہو جائے۔ اگر بالفرض رسالت کسب واکتساب کا ثمرہ ہوتی ہے تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سرد مہری پر ہوتا۔ حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی وضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہو گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اس کی زیر قیادت عبادت کرکے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو اور نسخ کا تعلق تھا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت وریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ "یاتینکم رسل منکم" میں بھی اسی طرف اشارہ نکلتا ہے یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کرکے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حکم مقررہ ہو کر آیا کرتا ہے۔

ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جا سکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت واستعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظرِ حکومت اگر اُسے انتخاب کرنا چاہے تو کر لے۔ اسی طرح رسالت ونبوت کی کیفیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے، نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال، ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اُس منصب پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لوکان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر بلحاظ کمال دیکھا جائے تو عمر میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصبِ نبوت پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لئے نبی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔

لوعاش ابراھیم لکان	ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے
صدیقاً نبیاً۔	تو صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہر استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا، انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آ گیا تھا وہ یہ کہ ان کی عمر وفا نہ کر سکی امت میں ان دو شخصیتوں کے متعلق تو خود زبانِ نبوۃ سے تصریح آ گئی کہ بلحاظ لیاقت و کمال یہ دونوں منصبِ نبوۃ کے قابل تھے جن میں سے حضرتِ ابراہیمؑ کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقررِ نبوت کا زمانہ نہ رہا تھا۔ ان کے علاوہ خدا تعالیٰ ہی کو معلوم کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالم تقدیر میں چونکہ نبوت ہی کا ختم کر دینا ٹھیر چکا تھا اس لئے کوئی اس منصب پر نوازا نہیں گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا مچا کر رسولوں کی آمد آمد پکار رہی تھی اب یہ کہکر خاموش ہو گئی کہ دنیا کا آخری راہنما آ چکا اب اس کے بعد کوئی رسول نہیں ہے۔

بہرحال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصبِ رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریک کار ہو جائیں تو شاید خدماتِ نبوت کی ادائیگی میں میرے لئے سہولت رہے لیکن منصبِ نبوت چونکہ براہِ راست خدا تعالیٰ کے اصطفاء پر موقوف ہے اس لئے ان کو اسی ایک بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرنا پڑی۔

واجعل لی وزیرا من اھلی	میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنا دے
ھارون اخی اشدد بہ ازری	اور ان کے ذریعہ میری کمر مضبوط کر اور میرا انیس

واشرکہ فی امری۔ شریک کار بنادے۔

اگر نبوت اکتسابی ہوتی تو یہاں سفارش کے موقعہ پر اُن کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

واخی ھارون افصح لسانا منی میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اُسی میری

فاجعلہ معی رداً یصدقنی انی مدد کے لئے میرے ساتھ کردے وہ میری تصدیق کریگا

اخاف ان یکذبون۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو منظور کرلیا گیا اور ان کو بھی نبی بنا دیا گیا۔ سوچیئے کہ فصاحت وبیان کو نبوت میں کیا دخل ہے۔ اس کے برخلاف جب کوہِ طور جاتے ہوئے انھیں ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہاں کوئی درخواست بارگاہ رب العزت میں پیش نہیں فرمائی اور براہِ راست خود فرما دیا۔ واخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خلافت ونبوت میں کتنا فرق ہے خلیفہ نبی خود بھی بنا سکتا ہے مگر نبی کسی کو نہیں بنا سکتا ہاں اس کے لئے دعا کرسکتا ہے چونکہ حضرت علیؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی اس لئے گمان ہوسکتا تھا کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں نبوت کی دعا کی اور قبول ہوگئی اسی طرح اگر آپ بھی ان کے لئے دعا فرمائیں تو قبول ہوجائے اسی بنا پر جیسا کہ علمائے حدیث کو معلوم ہے اس سے قبل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں یہ خیال گذرے اور آپ کے دستِ مبارک دعا کے لئے اٹھ جائیں آپ سے کہدیا گیا کہ تم اپنے داماد علیؓ کے لئے جو دعا چاہو مانگ لو مگر ایک نبوت کی دعا مت کرنا۔ کیونکہ عالمِ تقدیر میں یہ طے ہوچکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو بات یہاں طے ہوجاتی ہے وہ پلٹا نہیں کرتی۔

یہی صورت شبِ معراج میں پیش آئی ہے جب تقدیر کو یہ منظور ہوا کہ اب آئندہ سلسلہ تخفیف ختم کیا جائے اور پانچ نمازیں امت کے لئے ایک واجب العمل دستور ہوجائے تو پہلے ہی آپ سے کہدیا گیا لا یبدل القول لدی تاکہ بعد میں لا یبدل القول کا آئین آپ کے استجابتِ دعا میں حائل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصرار کے باوجود آپ پھر سفارش کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔

خلاصہ یہ کہ نبوت نہ پہلی امتوں میں کسب کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا اس لئے دعا و سفارش کا موقعہ بھی تھا اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لئے نبوت کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی ہاں اس کے بجائے خلافت باقی ہے اور وہ تا قیامت جاری رہے گی۔

پھر رسول جس طرح کہ خود بنتے نہیں اسی طرح خود بولتے بھی نہیں وہ خدا تعالیٰ کے ترجمان ہوتے ہیں جو اُن کو حکم ہوتا ہے وہی بولتے ہیں اور اسی لئے ان کا ہر حکم واجب التعمیل مفترض الطاعۃ ہوتا ہے۔ ہر امر میں ان کو حکم و فیصل بنانا، ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہو جانا اور اس طرح راضی ہو جانا کہ اس میں تنگ دلی بھی محسوس نہ ہو، مومن کا اولین فرض ہوتا ہے۔ ریفارمر میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں وہ اپنے قومی خدمات کے صلہ میں ریفارمر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا حکم صرف اخلاقی حد تک واجب العمل ہوتا ہے اس کے ساتھ نزاع کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے، اس کو خدائی ترجمانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی معاش جسمانی مبدأ و معاد سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ رسول کا تعلق ہمارے ہر گوشۂ حیات سے ہوتا ہے، ریفارمر کا کوئی حکم مذہب نہیں کہلاتا۔ رسول کا ہر حکم مذہب کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کسی قوم کا ریفارمر و مصلح بننے کے لئے اس کا ہم زبان ہونا شرط نہیں ہے۔ رسول کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس قوم کا رسول ہو اس کا ہم زبان بھی ہو۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا بلسان قومه۔

رسول کا ہر علم قطعی ہوتا ہے شک و تردد کا اس میں کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ ریفارمر کی ہر ہدایت زیر احتمال رہ سکتی ہے اسی لئے رسول فلاح و کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ریفارمر کامیابی کی ضمانت نہیں لے سکتا۔

رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدتِ ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے اسی لئے اس کی ذات ایمان و کفر کا محور ہوتی ہے۔ یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ ہزاروں اختلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت و اخوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی جمعیتیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفت وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں اسی لئے

تو یہ مغالطے پیش نہ آتے اور واضح ہو جاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بعید نہیں ہوتا جیسا کہ عام انسان، اور اتنا قریب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ اوتار وابن۔ وہ بعید ہو کر اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہوتا ہے اور انتہا درجہ قرب کے باوجود پھر احد وصمد سے حلول واتحاد کا کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس کا نام قرب ولایت نہیں یہ قربِ رسالت ہے۔ یہ انسان کے لئے مدارجِ قرب کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں اگر ان دونوں میں فرق سمجھ لیا جاتا تو ایک محب کی زبان سے جو کبھی اضطراب میں عاشقانہ کلمات نکل جاتے ہیں نہ نکلتے اور وہ اپنی تمام لن ترانیوں کی بجائے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ؎

زلاف حمد ونعت اولیٰ است برخاکِ ادب خفتن

سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اسی لئے آسمانی مذاہب نے رسول کی اس درمیانی ہستی کے لئے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظِ رسول تھا اور اسی لئے اذانوں میں خطبوں میں نمازوں میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظِ رسول ہے۔ آج دنیا رسول کی معرفت کے لئے خود لفظِ رسول ناکافی سمجھتی ہے اور اپنی طفل تسلی کے لئے دوسرے عنوانات تراش تراش کر اپنے ذہن میں رسول کی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ رسول کی معرفت تم کو لفظِ رسول سے زیادہ صحیح کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

علم النفسیات کا ایک آفادی پہلو

معرفتِ نفس معرفتِ رب کا کیونکر ذریعہ بنتی ہے

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ کیجئے برہان بابت اگست ۴۶ء)

از جناب لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ ایم ایس

علم النفسیات کے افادی پہلو کا مقتضا اور منتہا یہی یہ ہے کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کے فلسفہ کی حقیقت کو پہچانا جائے۔ اسی ایک حقیقت میں انسانی نفسیات کے تمام ظلمت کدے پنہاں ہیں۔ ہم اس مقالے میں اسی حقیقت سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جس نے اس حقیقت کا شعور پیدا کرلیا، اس نے اپنے تمام حجابات سے یک قلم پردہ اٹھا دیا۔ ہم نے آئندہ صفحات میں جا بجا (Complexes.) کے لئے حجابات کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس لفظ کو اردو زبان میں کسی اور لفظ سے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں کیونکہ Complexes. انسان کے اندر ایک .Inhibition یعنی حجاب پیدا کردیتے ہیں اس لئے حجاب Complex ہی ہوا سرکاوٹ یا الجھاؤ ذہنی انتشار ظاہر کرتے ہیں اور یہ علامتیں Complex کی بنا پر بہت بعد میں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی زندگی کا دارومدار انہی حجابات کے سمجھنے پر ہے تاکہ اس کے قلب و ذہن پر جو مُہر ثبت ہوتی ہے وہ دور ہو جائے۔ یہ تمام حجابات انسان کے ماحول کے مطابق پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کا ذکر پچھلے مقالے میں کر آئے ہیں۔ یہی وہ مشکل مقام ہے جس میں انسان گھرا ہوا ہے۔ ولقد خلقنا الانسان فی کبد۔

انہی حجابات کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم رہ جاتا ہے اور وہ رابطہ قائم نہیں کرسکتا چنانچہ قرآن مجید کی آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ الآیہ میں

انھیں حجابات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان تمام حجابات اور نقائص کا سرچشمہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں علم النفسیات کی اصطلاح کے مطابق وہی احساس کمتری ہے جس کے باعث انسان خود اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو نہیں پہچان سکتا اور جب اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تو پھر خدا کو بھی نہیں پہچانتا۔

یہ شعور پہلے بھی تھا | اول ہم مختصر طور پر اسی حقیقت کے شعور کی تاریخ لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی دنیا میں یہ شعور بہت قدیم ہے چنانچہ مینا کس (.Mencius) اعلان کرتا ہے۔

"Who Knows his own nature Knows Heaven."

یعنی جو اپنی فطرت سے آگاہ ہے وہ اپنے خدا کو جانتا ہے۔

غور کیجئے وہ کیا بات تھی جس نے مینکیس کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے۔ پھر اس سے کئی صدیاں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ سینٹ آگسٹائن (.St. Augustine) بھی اس حقیقت کا معترف ہے اس کا مشہور اعتراف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"I, Lord, went wandering like a strayed sheep, seeking thee with anxious reasoning without, whilst thou wast within me.... I went round the street and squares of the City of this world seeking thee, And I found thee not because invain I sought without for Him who was within myself.

یعنی میں اے میرا خدا، ایک گمشدہ بھیڑ کی طرح اپنے سے دور تیری تلاش و جستجو میں بصد دلائل آوارہ گردی کرتا رہا حالانکہ تو خود میرے اندر موجود تھا۔۔۔ میں نے اس دنیا کے شہر کی تمام گلی کوچوں میں تجھے ڈھونڈا، مگر تو نہ ملا۔ میں نے ناحق تیری تلاش اپنے گرد و نواح میں کی جبکہ تو ہمہ وقت میرے اندر ہی موجود تھا۔"

عارف رومی اور اقبال یہی وہ حجاب تھا کہ جب عارف رومی کی روح اپنے اولین منازل پر اپنے خالق کی متلاشی تھی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا" خدایا! ایں چہ بوالعجبیست کہ بادوستان خودمی کنی؟ وقتیکہ ترامی جوئیم خودرامی یابیم۔ ووقتیکہ خودرامی جوئیم ترامی یابیم!"

علامہ اقبال مرحوم بھی یہی طلسم توڑنے کے درپے تھے اور انھیں بھی اپنی خودی کی تعلیم اس کے بغیر ناممکن نظر آتی تھی جب تک کہ وہ یہ حجاب نہ دور کرلیں، احساسِ کمتری کا طلسم توانھوں نے بھانپ لیا تھا مگر اس طلسم کو وہ بھی اس طرح توڑ سکتے تھے کہ اس حجاب کو آشکارا کردیں۔ چنانچہ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں۔

تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی　　　تلاش خود کنی جز او نہ یابی

اور یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچکر سرمد کی آنکھیں بھی حق الیقین سے چکا چوندہو گئی تھیں اور وہ پکار اٹھا تھا۔

سرمد اگر او خداست خودمی آید　　　بیہودہ چرا درپے او می گردی

"چرا درپے اومی گردی" کے اندر ایک شعور اور اعتراف موجود ہے جس کی وضاحت سینٹ آگسٹائن والے بیان سے بخوبی ہوگئی ہے اور "خودمی آید" کے اندر ایک حقیقت پنہاں ہے کہ وہ یہیں ہے باہر اور کہیں نہیں اور یہاں ہی ملے گا۔

توگویا یہ احساسات جو ہم نے اوپر درج کئے ہیں ان سب میں ایک ہی حقیقت جاری وساری نظر آتی ہے۔ عبارا تنا شتیٰ وحسنك واحد۔ اب سوال یہ ہے کہ آخراس حجاب کا شعور کیوں اس قدر مستور ہے؟ اس کی محض ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ جب انسان نے اپنے رب تک پہنچنے میں دقت محسوس کی تو کچھ تو اس میدان کو ہی چھوڑ بھاگے اور کچھ جن میں صبروتحمل تھا وہ اور آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے حجابوں کو پالیا۔ اور انھوں نے یہ تمام طلسم توڑ ڈالے۔ جدید علم النفسیات کی اصطلاح میں گویا انھوں نے تحلیلِ نفسی کا عمل خود اپنے اوپر آزمایا اور وہ کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے حجابات اور الجھنوں کو دور کرلیا اور زندگی کا مقصد اور مدعا پالیا۔ یہ لوگ معدودے چند تھے چونکہ یہ علم مخصوص تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنھیں

ہم صوفیائے کرام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں جدید تعلیم نے علم النفسیات کو عام کر دیا ہے اور ہر ایک اس سے مستفیذ ہو سکتا ہے۔ پہلے جو افکار و خیالات صوفیائے کرام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے اب ان کا مذاق عام ہو رہا ہے اور لوگوں میں خدا کی وحدانیت و یکتائی کا علم و یقین بڑھ رہا ہے۔ اس بنا پر شرک کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ عنقریب یہ حجاب دنیا سے بالکل ناپید ہو جائے گا اور دنیا دیکھ لیگی کہ "یاران دیگرے رامی پرستند"

اب ہم جدید نفسیاتی رنگ میں اس امر کی تفصیل کرنا چاہتے ہیں کہ فقد عرف ربہٗ کی تکمیل من عرف نفسہٗ پر کس طرح مبنی ہے اور صوفیائے کرام اس حقیقت سے کس طرح فائدہ اٹھاتے تھے اور ان میں مجذوبوں کا فرقہ کس طرح پیدا ہوتا تھا۔ ہمارے نزدیک صوفیائے کرام کا طریقہ کار اس افادی پہلو کے سمجھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

ذہنی ترکیب کے تین حصے

ڈاکٹر فرائڈ (.Sigmund Freud) کا نظریہ ذہنی ترکیب کے تین حصے کرتا ہے جسے ہم ایک دائرے کی شکل میں یوں باسانی واضح کر سکتے ہیں۔

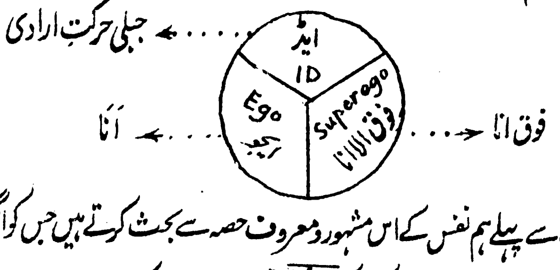

سب سے پہلے ہم نفس کے اس مشہور و معروف حصہ سے بحث کرتے ہیں جس کو انگریزی میں .Ego یا انا کہا جاتا ہے۔ دوسرے حصہ کو ڈاکٹر فرائڈ نے ID (ایڈ) کہا ہے یعنی وہ حصہ جو فرد کی جبلی حرکتِ ارادی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تیسرے کو Super Ego یا فوق انا کہتے ہیں۔ ان تمام کا باہمی تعلق وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایجو، فطرت اصلی کے متعلق اطلاعات بہم پہنچاتی ہے۔ ایڈ یعنی جبلی حرکتِ ارادی کو وہ ایک حس تصور کرتے ہیں جس سے عام خواہشاتِ انسانی پیدا ہوتی ہیں اور سب سے آخر میں وہ فوق انا کو انسانی اخلاق کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی تربیت کی ذمہ دار ہے اور اس کی روحانی رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ حرکت علم النفسیات میں خواہش کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے اور حرکت

یعنی سیرت بھی ہوسکتی ہے۔ ہر حالت میں حرکت ہی زندگی کی ایک علامت ہے۔ مختصر یہ کہ حرکت زندگی ہے یہ حرکت اول ایڈ یعنی فرد کی جبلی قوتِ ارادی میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ خواہشات کا تمام سرمایہ اسی جگہ ہوتا ہے اور یہیں سے ایجو یا انا کے توسط سے وہ فوق انا تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ گویا اوّل حرکت ارادی انا سے واقفیت حاصل کرتی ہے یعنی من عرف نفسہٗ اور بعد ازاں وہ فوق انا کو پہچانتی ہے یعنی فقد عرف ربہٗ۔

ڈاکٹر فرائڈ کے نزدیک یہ طریقہ کار ذہنی بندوبست کا معمول ہے اور اگر اس میں ذرا سا ترتیب کا فرق پڑ جائے تو ذہنی توام و ترتیب میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہی سلسلۂ حرکت بجائے مندرجہ بالا راہ اختیار کرنے کے ایجو یا انا کا توسط رد کر دے اور براہِ راست ایڈ یا جبلی حرکت ارادی Super Ego یعنی فوق انا کے دروازے پر دستک دے تو نتیجہ لازماً ذہنی انتشار ہوگا۔ "راہِ راست برو گرچہ دور است" زبان زد عام ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر حقیقت یہاں اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

مجذوب ہونے کی حقیقت اور اس کی وجہ روحانی دنیا میں ہمیں اس قسم کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، سب سے بڑی مثال صوفیوں کے درمیان مجذوبوں کی ہے۔ مجذوب وہ صوفی ہیں جو راہِ راست پر نہیں۔ وہ ایڈ یعنی جبلی حرکتِ ارادی سے کود کر سیدھے فوق انا تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں گویا وہ "راہِ راست" اختیار نہیں کرتے اور اپنے مقصد میں ایک Short Cut یعنی چھوٹا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے مقصد پر جلد پہنچ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی انا یا خودی پر تو حجاب رہتا ہے مگر وہ فوق انا پر ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ اس بنا پر ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے اور ان کی عقل اور ان کا ادراک سلب کر لیا جاتا ہے یا یوں کہئے ہو جاتا ہے۔ مجذوب توسطِ انا کا سلسلہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا من عرف نفسہٗ کے قائل نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو فقد عرف ربہٗ کے!! وہ سرے سے خدا کو پکڑنا چاہتے ہیں بالآخر وہ مجذوبانہ افعال کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔ اس کی محض وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایڈ یعنی جبلی حرکت ارادی انا کی طرف بوجوہ حجاب نہیں بڑھتی، حجاب احساسِ کمتری کا ہوتا ہے اس سے ان کی خودی آشکارا نہیں ہوتی اور وہ حرکتِ ارادی براہِ راست فوق انا کی طرف بڑھتی ہے۔ اس Short Cut یعنی مختصر راہ کی وجہ

زندگی کے گذشتہ ناموافق اثرات ہوتے ہیں۔ ایجو یعنی انا بیدار نہیں ہوتی اور وہ یہ بار برداشت نہیں کر سکتی اور وہ حرکات یا ارادات جو ایڈ پیدا کرتی ہے، پورے نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی الجھاؤ پیدا کرتی ہیں۔ یعنی خرد کا ذہنی توازن نہ تو قائم رہتا ہے اور نہ ہی برقرار رہتا ہے اور وہ اس حجاب کی وجہ سے اپنے قصد سے بہت دور بھٹک جاتا ہے۔ اگر یہی حرکت جبلی انا کی طرف بڑھ کر اسی میں قیام کر جائے اور مقصد حاصل کرنے کے باوجود آگے فوق انا کی طرف نہ بڑھے تو اس قیام کا نتیجہ بھی برعکس ہوتا ہے یعنی منزل مقصود تک تو پہنچ جاتا ہے مگر عجیب ڈھنگ سے۔ خرد کی انا مستحکم ہوتی جاتی ہے اور اس کا اعتماد اس پر اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ فوق انا کو بھی بسا اوقات نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کا دراصل منتہائے نظر ہوتا ہے۔ پیش از وقت اس کے حجابات دور ہونے لگتے ہیں۔ اور اس کی خودی ایک آن میں آشکارا ہو جاتی ہے مگر وہ آگے بڑھنے میں دقت محسوس کرتی ہے، اسے اپنی ہی خودی سے محبت وعشق ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو جدید نفسیات میں (Narcissism.) یعنی خود پرستی کہتے ہیں۔ یعنی انسان خود اپنے آپ کو اپنا محبوب تصور کرتا ہے اور انا الحق کا نعرہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے اِن عقائد و افعال کی جو عوام کو بدظن کر دیتے ہیں حالانکہ اس میں نفسیاتی وروحانی نقطۂ نگاہ سے کچھ غلطی نہیں ہوتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ عوام اس بات کے اہل نہ تھے کہ وہ اس دقیق نکتہ کو سمجھتے۔ ان کا مذاق پست تھا اور مطالعہ کم مشاہدہ غیر معلوم اور ناپید تھا۔ درحقیقت مجذوب اپنے افعال کے ذمہ دار نہیں ہوتے، ان کی عقل ان سے سلب ہو چکی ہوتی ہے اس لئے وہ معذور ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بات نہیں کہ وہ روحانیات میں کچھ کم درجہ رکھتے ہیں، ان کا مقام بدستور قائم رہتا ہے البتہ جہاں تک ان کا تعلق مادی دنیا سے ہوتا ہے وہ اس سے رابطہ نہیں رکھتے۔ اگرچہ یہ حالت خود پیدا کردہ ہوتی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ ایسی حالت میں افعال کا جائزہ نہیں لیتے۔ یہ ہے مختصر طور پر تفصیل اُن ذہنی انتشارات کی جو روحانیات میں مداخلت کرتے ہیں اور جنھیں ہم نے یہاں Complexes. یعنی حجابات کی وضاحت کے لئے بیان کرد ینا ضروری سمجھا۔

ہم روزمرہ اسی قسم کے اور بھی واقعات رکھتے ہیں جنھیں ہم دماغی خلل کہتے ہیں اور جو مجذوبیت سے

بہت متفاوت ہیں۔ خلل اور انتشار کی نوعیت بہت ملتی جلتی ہے اور عوام کے لئے ایک پاگل اور ایک مجذوب میں امتیاز کرنا بڑا مشکل ہے مگر ان دونوں کا آپس میں دور کا بھی تعلق نہیں۔ پاگل میں جو حجاب ہوتا ہے وہ مادی ہوتا ہے اور مجذوب کا حجاب روحانی ہوتا ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق مادی حجابات یعنی Material Complexes. جو ہمارے ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن سے ہے، اور اب ہم ان سے متعلق کچھ عرض کریں گے۔ روحانی حجابات کا ذکر ہم نے اس لئے کر دیا ہے کہ سمجھنے میں آسانی رہے اور ڈاکٹر فرائڈ کے نظریے کے مطابق اس کی تطبیق ہو جائے۔

ذہنی ترکیب سے متعلق فرائڈ کا نظریہ کوئی انوکھا نہیں ہے۔ قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائڈ سے صدیوں پہلے انسان اور اس کے عوارض کو اس طرح کے ایک نقشہ سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے۔

عن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال خط النبی	حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت
صلی اللہ علیہ وسلم خطا مربعا وخط خطا	ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط کھینچا
فی الوسط خارجا منہ وخط خططا	اور اس کے درمیان میں ایک باہر نکلا ہوا خط کھینچا
صغارا الی ہذا الذی فی الوسط	اور اس خط پر دونوں طرف نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے
من جانبہ الذی فی الوسط وقال	خط بنائے اور فرمایا یہ درمیانی خط انسان ہے اور
ہذا الانسان وہذا اجلہ محیط بہ	یہ مربع خط اس کی اجل ہے جو اس کو گھیرے ہوئے
وہذا الذی ہو خارج املہ وہذہ	ہے یا جس نے اس کو گھیر لیا ہے اور یہ خط جو باہر
الخطط الصغار الاعراض فان اخطاہ	نکلا ہوا ہے یہ اس کی امید ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے
ہذا نہسہ ہذا وان اخطاہ ہذا نہسہ	خط آفات اور اعراض ہیں اگر اس سے بچا تو اس میں
رواہ البخاری (مشکوٰۃ باب الامل والحرص)	پھنس گیا اور جو اس سے بچا تو اس میں مبتلا ہو گیا۔

نقشہ

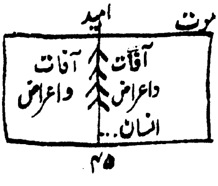

۴۵

اب اس نقشے کو نظرِ تعمق سے ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہری ساخت میں اختلاف ہے ہم نے ڈاکٹر فرائڈ کے نظریہ کو بیان کرنے کے لئے ایک گول دائرہ بنایا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق آپ نے ایک مربع خط کھینچا۔ ہم بجائے دائرے کے ایک تکونا یا مستطیل بھی بنا سکتے تھے۔ ہر حالت میں ظاہری ساخت ایک خول کا کام دیتا۔ آپ تصور کر لیجئے کہ دائرہ اور مربع دونوں خط اجل ہیں حدیث میں مربع کے درمیان انسان ہے وہاں دائرے کے درمیان نفسِ انسانی کی ترکیب ہے، یا یوں کہہ لیجئے روح ہے۔ حدیث میں انسان امید اور آفات کے درمیان گھرا ہوا ہے جو اس کی خواہشات ہیں۔ فرائڈ ان کو ایڈ یا فرد کی جبلی حرکتِ ارادی سے تشبیہ دیتا ہے اور یہ جو ایگو یا انا ہے اُسے ہم امید کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انا ہی امید کی بانی ہوتی ہے۔ اگر انا نہیں تو امید بھی مفقود ہے۔ اجل فوق انا ہے اور یہی اس کا منتہائے آرزو ہے یعنی فنا، اور یہی اس کا مقصد ہے یعنی ایک حقیقتِ بالا میں جذب ہو جانا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اگر انسان آفات واعراض یعنی ایڈ سے بچا تو امید یعنی انا میں پھنس گیا اور اگر انا سے بچا تو ایڈ یعنی آفات واعراض میں پھنس گیا۔ ہر حالت میں اعتدال لازم ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے کہ ان کے مابین راہ اختیار کی جائے تاکہ ذہنی توازن قائم رہے اور انسان احسن تقویم کا مصداق بنا رہے۔

مادی حجابات اب ہم مادی حجابات (Material Complexes.) کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔ ہم نے بار بار اس بات کی تفصیل کی ہے کہ حجابات احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ احساس انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ دماغی و جسمانی، مالی و معاشرتی کمزوریاں اس کی بانی ہوتی ہیں۔ جب یہ پہلو انسانی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں تو غیر شعوری طور پر وہ انسان کے شعور میں آ کر حرکت پیدا کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی کو وہ اپنی قوت اور کھنچاؤ کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ انسان اکثر حالات میں نہ تو اس بات کو محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اقرار کرتا ہے۔ جس طرح حافظہ میں کوئی بات جا کر محفوظ رہتی ہے اسی طرح یہ اثرات وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ ان اثرات کا طریقِ کار بہت تفصیل چاہتا ہے۔ یہاں مختصر

طور پر ایک مثال سے اسے واضح کر دینا نامناسب نہ ہوگا

فرض کیجئے ایک شخص ہر روز بائیسکل پر سوار ہو کر اپنے دفتر یا کام کاج پر جاتا ہے۔ اول دو تین روز اسے راستہ تلاش کرنے میں دقت ہوگی، مگر بعد ازاں وہ خود بخود بائیسکل پر سوار ہو کر اپنے کام پر پہنچ جائے گا۔ راستے میں وہ ہرگز یہ کہتا ہوا نہیں جاتا کہ میں وہاں جا رہا ہوں اور وہاں جا رہا ہوں بلکہ خود بخود وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے آخر یہ کیوں ایسا ہوتا ہے۔ کونسی وہ طاقت ہے جو اُسے وہاں لے جاتی ہے وہ محض بائیسکل پر سوار ہوتے وقت دل میں کہتا ہے کہ اب مجھے دفتر چلنا چاہئے پھر وہ سگرٹ سلگا کر اپنے خیالات میں مگن چلا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ مقام پر پہنچ محسوس کرتا ہے کہ اب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہے اور اسے بائیسکل پر سے اتر جانا چاہئے۔ راستہ میں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

غیر شعوری اثرات یہ ہے نتیجہ ان اثرات و تجربات کا جو غیر شعوری حصہ میں محفوظ رہتے ہیں اور یہ ہے طریقہ جس سے وہ غیر شعوری طور پر شعور میں آ کر کام کرتے ہیں کہ انسان انھیں محسوس تک نہیں کرتا اور وہ بغیر ظاہری سعی و کوشش کے حرکات پیدا کر لیتا ہے۔ جس قدر پختگی سے یہ تجربات یا اثرات قائم ہوں گے، اسی قدر تیزی اور سرعت سے شعور پر اثر پذیر ہونگے اور ان سے افعال سرزد ہوں گے۔ زندگی کے واقعات و حادثات کا یہی ایک خزانہ ہے جہاں تجربات محفوظ رہتے ہیں اور بوقتِ ضرورت یہ غیر شعوری طور پر کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جسے قوتِ ارادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں اختیار اور ارادہ بے معنی لفظ ہیں۔ اختیار اور ارادہ اللہ ہی کے لئے ہیں۔ انسان کو ان کا بہت قلیل حصہ دیا گیا ہے جو چیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہے وہ محض یہ ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کر سکے اور اپنی راہ تجویز کر سکے راہ کا اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اگر اس کی خواہشات میں قوت ہے تو وہ دیکھے گا کہ ایک ایک کر کے وہ تمام پوری ہوتی رہتی ہیں۔

ہمارا یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ عجیب بات ہے جو کچھ سوچو ویسے ہی ہو جاتا ہے یا بعض کہتے ہیں کہ جو کچھ کبھی اللہ سے مانگا ہے اس نے دیا ہے یہ بات لازمی ہے کہ جب کبھی بھی انسان کچھ

خواہش کرتا ہے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے۔ چنانچہ خواہش کرنا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے مدد مانگنا ایک ہی چیز ہے اور یہ بھی واقعی امر ہے کہ وہ پوری ہوتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کس طرح ہوتا ہے کیا وہ لوگ جو یہ بات کہتے ہیں ارادہ نہیں رکھتے؟ آخر وہ بھی تو مدعی ہیں اس بات کے کہ جو کچھ سوچتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ ان کا ارادہ تو پھر بہت زبردست ہوگا، اگر وہ یہ دعوےٰ کردیں کہ ہم یوں کردیں گے اور وہ کردیں گے؟ یہ بات نہیں ہے۔ انسان کا ارادہ کچھ چیز نہیں اور نہ ہی اس کا اختیار۔ یہ اصطلاحات ہماری زبان میں محض شاعرانہ حسنِ ظن ہے۔ اختیار اور ارادہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ انسان کو جو اختیار دیا گیا ہے وہ محض سوچ بچار کا ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرسکے اور پھر اس اختیار میں اس کا کچھ اختیار نہیں، کیونکہ وہ اپنے ماحول کے مطابق سوچتا ہے جیسا ماحول ہوا ویسے ہی خیالات پیدا ہوئے اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم ماحول اپنے خیالات کے مطابق پیدا کرسکتے ہیں تو یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ اگر آپ کرسکتے ہوں گے تو وہ محض یہاں تک ہی محدود ہوگا کہ آپ اپنے کمرے یا مکان کا رنگ و روپ اور فرنیچر ملا جلا کر اپنی طبیعت کے مطابق کرلیں مگر اس کو ماحول کی مطابقت نہ کہا جائے گا۔ رہ گئی خواہشات کی قوت تو اس سے ہماری یہ مراد ہے کہ آپ کو ایک چیز پسند ہے تو اب یا تو بہت ہی پسند ہوگی یا بہت پسند ہوگی اور یا فقط پسند ہوگی اس طرح اس خواہش کے تین درجے ہیں اور یہی اس خواہش کی قوت کی بنا ہوگی۔ اسی طرح جب آپ کو ایک بات کا یقین ہوگا تو اس کے بھی تین ہی درجے ہوں گے یا تو بہت ہی یقین ہوگا یا بہت یقین ہوگا اور یا پھر محض یقین ہوگا۔

پس انسان نیک و بد میں تمیز کرکے ایک آرزو باندھتا ہے تو اس کی قوت اس کی مانگ کے مطابق ہوتی ہے اور وہ فوراً شعور میں آتی ہے اور پھر وہاں سے ذہن کے غیر شعوری حصہ میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ صرف شعور کی سطح پر اسی وقت آتی ہے جب انسان اس کے متعلق سوچتا ہو ورنہ پھر اس کے شعور میں نہیں ہوتی۔ اور اوجھل رہتے ہوئے وہ غیر شعوری طور پر اپنا کام کرتی رہتی ہے یعنی ایک حقیقی شکل اختیار کرتی رہتی ہے جس طرح ہم نے ابھی بائیسکل والی مثال سے واضح کیا ہے یہ شعور کا ایک غیر شعوری فعل ہے۔ ایک بات کے متعلق متعدد بار سوچنا اس بات کی دلیل نہیں کہ باتیں مختلف ہیں بلکہ یہ تکرار محض

تقویت کی بنا پر ہے اور اس سے تعدد مقاصد لازم نہیں آتا۔ یہ تمام خواہشات اور آرزوئیں محفوظ رہتی ہیں اور خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ ان فرائض سے اکچو یعنی انا بیدار رہتی، وہ بار بار اس کی طرف توجہ دیتی رہتی ہے اور اپنے فرائض کو نہیں بھولتی۔ اور وہ خواہش پوری ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ ہے انسان کا ارادہ اور اس کا اختیار۔

مختصر طور پر انسان کے اختیار میں جو بات ہے وہ محض اتنی ہی ہے کہ وہ اپنی بہتری کو شناخت کرسکے اور اس کے متعلق ایک پختہ خیال جما سکے اور اسے بار بار یاد کرے تو پھر یہ خیال شعور میں آکر غیر شعوری طور پر مکمل ہونا شروع ہوتا ہے تاوقتیکہ انسان اپنا مدعا نہ پالے۔ یہی طاقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جبر و اختیار بھی اسی غیر شعوری ذہن میں پنہاں ہیں۔ اسے اگرچہ انسان نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ضرور جانتا ہے کیونکہ "وہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا ہے"۔ انسان کو اختیار محض ایک خواہش کی شکل قائم کرنے کا ملا ہے اس کو حقیقت کا جامہ پہنانا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ نیک و بد کی تمیز کرسکتا ہے مگر اپنے مفاد کے لئے کسی ایک کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ یہ اس کے اختیار کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ تمام تاثرات اور تشخیصیں اس کے غیر شعوری ذہن میں جاکر اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے علم کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ انسان ان پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ خود بخود قانونِ بالا کے مطابق عمل میں آتی رہتی ہیں اور انسان کی زندگی ڈھالتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات انسان ان پر قابو پاسکتا ہے اور اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ اپنے ماحول کے پیدا کردہ تجربات اور اثرات کو سمجھ کر انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ انھیں مناسب طور پر ڈھال کر استعمال کرے وہ یقیناً اپنی زندگی کو بدل سکتا ہے مگر ان اثرات کے خلاف نہیں، اگر انسان کی زندگی ایک ایسے سانچے میں ڈھل جائے جس کے اثرات اس کے ذہن میں موجود نہ تھے تو یہ انسان کے لئے ایک بعید از عقل کام ہے۔ ایسا کام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو سکتا ہے

انسان فقط اس طرح اپنی تقدیر بدل سکتا ہے کہ وہ ان اثرات کو سمجھے اور جہاں جہاں بُرے اثرات ہوں اُن پر قابو پائے اور انھیں ظاہر ہونے سے روکے۔ مختصراً جدید نفسیاتی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ انسان اپنے Complexes کو سمجھ کر اپنے اوپر .Psychoanalysis یعنی

تحلیل نفسی کا عمل کرے اور اپنا علاج کرے اور بس! لیکن یہ آسان بات نہیں ہے اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اس شعر کا نفسیاتی پہلو وہی ہے جس کی ہم نے ابھی تفصیل کردی ہے یعنی انسان اپنی اَنا کو اس قدر پختہ کرے کہ تمام حجابات اٹھ جائیں تب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی زندگی کے حجابات کو مفید کام میں لگا سکے گا۔

تو گویا گذشتہ صفحات کا لب لباب یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے تاکہ اپنے رب کو سمجھ سکے اور جب وہ دونوں کو سمجھ گیا تو دونوں کا منظورِ نظر بن گیا پھر جو چاہے کر ڈالے۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے اور دھوکہ نہ دے۔ یقیناً نہ تو وہ کسی اور کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو جو محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو دھوکہ نہ دے تو اس میں اسی کی بہتری ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے تمام حجابات دور ہو جائیں گے۔ انسان کو چھوڑ کر اقوام کا سیاسی اقتدار اور ان کی معاشرتی مدوجزر انہی حجابات پر منحصر ہے اور یہی وہ مشکلات ہیں جنھیں وہ قدم قدم پر مسکراتے دیکھتا ہے اور ٹھٹھر جاتا ہے۔

خاندانی اثرات اب ہم انہی مادی حجابات کا ایک اور نفسیاتی پہلو لیتے ہیں۔ گذشتہ مقالے میں ہم نے خاندانی اثرات کا ذکر کیا تھا۔ بچپن میں جو اثرات انسان کے ذہن میں گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑتے ہیں اس کے مطابق بچے کی آئندہ زندگی نشوونما پاتی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے ان اثرات میں بھی بدستور ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ یعنی ان کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً اگر بچپن میں مار پڑتی ہے تو جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو یہ بند کردی جاتی ہے اور دھمکیاں دی جاتی ہیں پھر محض تنبیہ پر اکتفا کر لیا جاتا ہے گویا یہ اثرات یا تجربات ہیں ایک ہی قسم کے مگر ان کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اب جب بچہ جوان ہوتا ہے انھیں اثرات کے زیرِ اثر تو وہ انہی کے مطابق عمل کرتا ہے اور اب اس کے اعمال کا اثر اس کے گردونواح

میں ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر اس کا گرد و پیش انہی نئے اثرات کے مطابق عمل کرتا ہے۔

مثال کے طور پر بیٹے کی شادی بڑی چاہت سے والدین کرتے ہیں مگر جونہی دلہن گھر میں قدم رکھتی ہے ساس بہو کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان جھگڑوں کا باعث نفسیاتی ہے اور ان کی تحلیل کی جا سکتی ہے جو بہت تفصیل چاہتی ہے۔ ہم انشاء اللہ پھر کسی صحبت میں قارئینِ کرام کے سامنے یہ چیز پیش کریں گے اور ان کی وجوہات بیان کر کے اس کا علاج بھی انشاء اللہ تعالیٰ درج کریں گے تاکہ خاندانی معاملات میں یہ چیز کارآمد ثابت ہو اور اس کا افادی پہلو عملی طور پر ثابت ہو جائے۔

غصہ کی نفسیاتی وجہ

اسی طرح ہم نے گذشتہ مقالے میں ایک مقام پر انسانی جذبات کا بھی ذکر کیا تھا جس میں غصہ قابلِ ذکر ہے۔ اب ہم آئندہ صفحات میں جماعت یا سوسائٹی کی نفسیاتی تحلیل کرنا چاہتے ہیں تاکہ جو جو نقائص جن جن وجوہات کے باعث پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کر کے نفسیات کا افادی پہلو ثابت کر دیا جائے۔ ہم جہاں جہاں جماعت کا ذکر کریں گے اس سے مراد مسلمانوں کی ہی جماعت ہوگی کیونکہ آج کل ہمیں سب سے دگرگوں حالت یہیں نظر آتی ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ غصہ (Anger.) احساس کمتری کی علامت ہے۔ دلیر انسان غصہ میں نہیں آتا کیونکہ اسے اپنے حوصلہ اور مردانگی کا یقین ہوتا ہے۔ غصہ وہی شخص کرتا ہے جو کمزور اور ناتواں ہو اور وہ اپنی طاقت پر اعتماد نہ رکھتا ہو۔ یہاں طاقت سے جسمانی اور دماغی دونوں طاقتیں مراد ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جہاں لڑائی جھگڑا ہوگا وہاں بزدل انسانوں کا ایک انبوہ نظر آئے گا۔ اس میں دلیر انسان ہرگز شامل نہیں ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو صلح کروانے والوں میں ہوں گے۔ علمی مناظروں میں ہمیشہ جن کا علم کوتاہ ہے وہی جھگڑتے ہیں۔ صاحب علم اور دانا کا یہ شیوہ ہے کہ بحث و مناظرہ میں خاموشی اختیار کریں گے۔ گویا علمی جھگڑوں میں بھی اکثریت جاہلوں کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ نفسیات کے افادی پہلو کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور وہ ہی ہمارا موضوع ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبردست وہ نہیں ہے جو اپنے مقابل کو پٹخ دے بلکہ زبردست وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قبضے میں رکھے

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہو گئیں ایک یہ کہ پٹخ دینے والا زبردست نہیں ہوتا اور دوسرے زبردست وہ نہیں ہے جو غصہ میں آجائے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ احادیثِ نبوی علم النفسیات کے حقائق سے پُر ہیں اور ان کا افادی پہلو ثابت ہے۔ اب ہم جدید علم النفسیات کی رو سے اس حدیث کی تفصیل کریں گے اور ثابت کریں گے کہ غصہ اور دیگر جذباتی اظہار جماعت کے لئے کس طرح زہرِ قاتل ثابت ہوتے ہیں اور ان میں کس طرح احساسِ کمتری کام کرتا رہتا ہے عوام سمجھتے ہیں کہ یہ احساس برتری ہے یعنی . . . Superiority Complex

ماہرینِ علم النفسیات نے اس ضمن میں ایک باب باندھا ہے جسے وہ Mental Protest یا . Transference of Emotion کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں انھیں ذہنی احتجاج یا نقلِ جوش کہا جا سکتا ہے اس کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ چونکہ غصہ (Anger) نقلِ جذبات ہے اس لئے ہم ان وجوہات کو اپنے انداز میں یہاں درج کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

غصہ کی بھی سب سے پہلی وجہ احساسِ کمتری ہے جو مسلسل کھٹکتا رہتا ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا حادثہ یا واقعہ پیش آجائے جہاں انسان کسی ڈر کی وجہ سے اظہار نہ کر سکے تو یہ جذبات یا کیفیت منتقل ہو کر کسی دوسری جگہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر اپنے سے طاقتور سے جھگڑا ہو گیا ہو اور اس نے پچھاڑ دیا ہو تو کسی کمزور پر یہ غصہ نکل جائے گا۔ ضروری نہیں کہ یہ طاقت جسمانی ہی ہو۔ دماغی بھی ہو سکتی ہے اور بعض دفعہ تو دماغی شکست جسمانی شکل میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ جب ماسٹر گھر میں بیوی سے لڑ کر آیا ہو تو سکول میں لڑکوں کو پیٹتا ہے ہمارے نزدیک یہ خیال درست ہے اور ایک حقیقت ہے بچوں کو مار پڑھائی کی وجہ سے بہت کم پڑتی ہے

استاد اگر مارے تو اس کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ اول یہ جو ہم نے بیان کی ہے یعنی یہ اس کی گھر پر بیوی سے ناچاقی ہوئی، یا اس کو ہیڈ ماسٹر نے ڈانٹا ہو، اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر پر تو غصہ نکال نہیں سکتا ورنہ برخاست ہو جائے گا۔ اس لئے وہاں وہ پی جاتا ہے لیکن اس کا اثر اس کے غیر شعوری ذہن میں محفوظ رہتا ہے اگر شاگردوں پر نہ نکلے گا تو گھر آ کر بیوی بچوں کو مارے گا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ماسٹر شادی شدہ نہیں تو پھر اس کی ناراضگی کی وجہ گھر کے رشتہ داروں یا باہر دوستوں میں تلاش کرنا پڑے گی۔ بیوی اگر گھر میں خاوند سے لڑتی ہے تو بچوں کو پیٹ کر غصہ نکال لیتی ہے۔ گویا یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جوش یا جذبات منتقل ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا بے جا تصرف جماعت کے لئے زہر قاتل ہے۔ کم از کم وہ لوگ جو سمجھ رکھتے ہیں ان کو اس کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے۔

خاموشی کے فوائد خاموشی کے فوائد میں کئی باب باندھے جا چکے ہیں، متعدد احادیث اس موضوع پر ملتی ہیں طوالتِ تحریر کے ڈر سے انھیں یہاں درج نہیں کیا جاتا، تاہم خاموشی کا تعلق چونکہ جذبات سے ہے، یہاں اختصاراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ آپ نے جا بجا مدرسوں اور لائبریریوں میں یہ نوٹس لگا ہوا دیکھا ہو گا

Talk Less and Think More

یعنی "بات کم کرو اور سوچو زیادہ" یا "Silence is Gold" یعنی خاموشی سونا ہے

ان فقرات پر ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کے اندر کس قدر حقیقتیں پنہاں ہیں جنھیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کتب خانوں ہی میں عمل کرنے کے لئے ہیں روزمرہ زندگی سے اس کا تعلق نہیں۔ عقلمند آدمی دوسرے کی گفتگو سے اس کو بھانپ جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے نفس شناس چہرہ دیکھ کر انسان کے متعلق بتا دیتا ہے کہ یہ کس قسم کا انسان ہے، یا چال ڈھال دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کس قسم کا ہو گا۔ یہ محض اس لئے ہے کہ انسان کی ہر حرکت کے اندر معانی پنہاں ہوتے ہیں اور ہر حرکت کا ایک مقصد اور مطلب ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی انسان کے پاس بھی اس قدر علم نہیں کہ ہر وقت باتیں کرتا رہے۔ علم کا حال تو یہ ہے کہ جس قدر بھی پڑھتے جاؤ دماغ خالی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ جو باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں

وہ بیہودہ باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کی بہت کم! ان باتوں میں یا تو وہ کسی کی برائی یا چغلی کرتے ہوں گے یا پھر قطعی طور پر غیبت کے مرتکب ہوتے ہوں گے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے ایک مسلمان کے لئے غیبت گناہ کبیرہ ہے۔ اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی جھوٹی بات کہی جائے تو وہی غیبت ہوگی، حالانکہ غیبت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہی جائے جسے سن کر وہ برا مانے۔ خواہ ایسی بات سچی ہی ہو۔ دنیا کے آدھے جھگڑے محض غیبت کی وجہ سے ہوتے ہیں انسان اپنی فطرت سے باز نہیں آتا۔ وہ باتیں کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی کمزوریاں اس کے اندر Complex پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے حجابات کا اعتراف نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور پھر جب اس کی کمزوریوں کا علم اس کے لواحقین میں ہونا شروع ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان کھولتا ہے تاکہ ان کی تردید کرے اس تردید میں وہ بہتوں کی برائیاں کر جاتا ہے تاکہ اپنی بھلائیوں کا ثبوت دے۔ یہ سب کچھ احساس کمتری ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ محسوس نہیں کرتا مگر اندر ہی اندر سے جماعت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ والد صاحب مرحوم بچپن میں ایک نصیحت کرتے تھے کہ جو کچھ تم سنو اس پر مت اعتبار کرو اور جو کچھ تم دیکھو اس پر صرف آدھا یقین کرو۔

ہماری جماعت کا نظام اس قدر بکھر گیا ہے کہ اس کا ایک فرد بھی قابل اعتماد نظر نہیں آتا۔ کسی کی بات کا یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس کی محض یہی وجہ ہے کہ انسان کا عمل خیالی بن گیا ہے۔ اسے جو کرنا ہوتا ہے وہ شاعروں کی طرح بیٹھ کر اپنی خیالی دنیا میں پرواز کر لیتا ہے اور سب قصے تمام کر دیتا ہے مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ زبان کھولنے سے بھی عمل مفقود ہو جاتا ہے۔ خواہش تو زبان کھول کر پوری کر لی پھر عمل کس طرح ہو؟ ایک شخص دیکھتا ہے کہ وہ ایک کام کا اہل نہیں اور نہیں کر سکتا۔ اسے احساس ہوتا ہے اس کمزوری کا۔ مگر اس میں اس قدر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر تھوپنے لگتا ہے۔ اب اس کے نزدیک سب نکمے اور بیکار ہیں اور دنیا میں صرف وہی ایک کام کا ہے۔ یہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔

پس جب کسی شخص کو کسی کی غیبت یا برائی کرتے دیکھا جائے تو فوراً بلا تامل یہ سمجھ لیجئے کہ یہ شخص احساسِ کمتری کا شکار ہے اور سوسائٹی میں رخنہ ڈالنے کے درپے ہے۔ نقص خود اس کے اندر ہے یہ محض بنتا ہے۔ جس کی بُرائی کرتا ہے وہ اس سے اچھا ہے۔ اگر ایک شخص واقعی برا ہے تو اس کو تو سب برا کہیں گے ایک آدھ کے کہنے سے کوئی برا نہیں بن جاتا۔ پس خاموشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے جس کا تعلق ہمارے اس موضوع سے ہے کہ وہ غصہ کو دبا جاتی ہے اور غیبت سے روکتی ہے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو علم النفسیات کی رو سے زندگی کے افادی پہلو کے لئے بہت ضروری ہیں۔ خاموشی کے اور بہت سے فائدے ہیں لیکن ہمارے موضوع سے ان کا تعلق کم ہے لہذا ہم انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ایک مسلمان کے لئے ایسے حجابات اور حرکات کا مرتکب ہونا بعید از عقل ہے۔ مسلمانوں کے لئے تمام وہ ہدایات موجود ہیں جو ایک اچھی منظم سوسائٹی کے لئے ضروری ہیں، ان ہدایات سے وہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے بہت کچھ روشنی اور نورِ یقین حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن کریم اور احادیث میں ہدایات موجود نہ ہوں۔ لباس، طعام گفتگو، نشست و برخاست، ہمسایوں سے تعلق، والدین کا ادب، بہن بھائیوں سے تعلقات، طہارت، نکاح، طلاق اور دیگر فرائض ان سب کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ کسی بڑی سے بڑی علم النفسیات کی کتاب میں بھی یہ باتیں موجود نہ ہوں گی۔

حیرت کا مقام ہے کہ ان تمام کے ہوتے ہوئے بھی اس قوم کا شیرازہ دگرگوں ہے۔ اس کی سوسائٹی اخلاقی سطح سے گری ہوئی ہے۔ کوئی شخص اعتبار کے قابل نظر نہیں آتا۔ ہر ایک میں خود غرضی اور نفسا نفسی موجود ہے۔ سچ کا نام ناپید ہے باوجودیکہ ہمیں اپنی مذہبی کتابوں میں قدم قدم پر ایسی باتیں ملتی ہیں جنھیں وہ جدید علوم پڑھ کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی نگاہ سے یہ سب کچھ اوجھل ہے وہ خود فریبی اور احساسِ کمتری میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے حجابات بجائے گھٹنے کے روز بروز ترقی پر ہیں۔ اس میں تفکر و تدبر کا مادہ مفقود ہو چکا ہے۔ ہمارے موضوع کے مطابق وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں اس کی فطرت میں جمود یعنی Fixation. پیدا ہوگیا ہے اور

یہ مرض لاعلاج سا نظر آتا ہے وہ اپنے گذشتہ تجربات پر بھی نظر دوڑا کر نہیں دیکھتا کہ وہاں ہی سے عبرت حاصل ہو۔ جذبات کے ہنگاموں میں مخمور ہے، جذبات کے بھڑکنے کو وہ مذہب تصور کرتا ہے مسلمان کے لئے ایک قسم کا تجربہ دہرایا نہیں جاتا بس ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔ مشہور حدیث ہے۔

لا یلدغ المومن من جحر واحد مرتین۔ ایک مومن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔

اس حدیث کا مطلب ہماری دانست میں یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنے تجربہ کو ضائع نہیں کرتا۔ لیکن ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف ضائع کر رہا ہے بلکہ اس کے ساتھ بہت بے دردی سے کھیل رہا ہے چہ جائیکہ عبرت حاصل کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سب سے عجیب قسم کی ہیچ مقداری جو آج کل مسلمانوں میں نظر آتی ہے وہ سیاست کے میدان میں اس کا احساسِ کمتری ہے۔ اس حجاب کی وجہ سے نہ تو مسلمان سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی عمل کے قابل رہے ہیں اُن کا عمل جلسوں کے اسٹیجوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو ایک دو اشخاص کے سپرد کر کے خود فرار ہو جاتے ہیں (Political Escape.) نہ صرف سیاسی ذمہ داری سے فرار ہے بلکہ اخلاقی فرار بھی ہے یعنی (Moral Escape.) جب ایک قوم کا تنزل انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں یہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہے پھر اس میں نہ سیاسی برداشت (Political Toleration.) باقی رہتی ہے اور نہ ہی سیاسی شعور (Political Consciousness.) جس کو ہم سیاسی شعور سمجھتے ہیں وہ محض ایک خود فریبی ہے۔ Self Consciousness. سیاسی شعور ہمیشہ انفرادی شعور کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کے مسلمانوں میں نہ تو انفرادی شعور موجود ہے اور نہ ہی ان کی خودی بیدار ہے جو تھوڑی بہت جھلک نظر پڑتی ہے وہ محض مذہبی احساس کمتری ہے۔ مسلمان مسلمان بننا چاہتا ہے، اسے احساس ہے کہ وہ اپنے مذہب سے غافل ہے گذشتہ تاریخ اور مسلمانوں کے کارنامے اس کے پیش نظر ہیں۔ انھیں یاد کر کے وہ اپنے جذبات عارضی طور پر بھڑکا لیتا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے

یہ سب کچھ نتائج ہیں غلامی کے۔ جب غلامی انسان کے رگ و ریشہ میں سرائیت کر جاتی ہے تو اس کے حجابات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایک قیام گاہ بنا لیتا ہے جس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس قیام کے متعلق علامہ اقبال کی ایک مشہور رباعی ہے۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

مگر جب خودی پر ہی حجاب کا پردہ پڑ گیا ہو تو ضربِ کلیم کہاں سے پیدا ہو؟ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو مسلمان کا یہ جمود ایک اور قدم آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس مرض کی علامتیں بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ ماہرین علم النفسیات اس کو Wish Fulfil ment. یعنی تکمیلِ تمنا کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ آرزو یا تمنا اصلی زندگی میں تو عملی جامہ نہیں پہن سکتی البتہ تخیلی دنیا میں اسے رنگا رنگ کے لباس سے ملبوس کروایا جا سکتا ہے۔ یہ شاعرانہ تخیل عملی زندگی کی موت ہے اور یہ جو رنگا رنگ کا لباس تخیل میں نظر آتا ہے تو یہ درحقیقت عملیات کا جنازہ ہے یہ مرض نہ صرف ایک قوم کی موت کی علامت ہے بلکہ کفر و الحاد کا پیش خیمہ ہے۔ جب ایمان و یقین دل سے نکل جائیں تو یہ تخیلات کی دنیا میں آوارہ گردی کرتے ہیں۔

آج مسلمان ان علامتوں کا اقرار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آج وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک مضبوط جماعت کے ہمراہ ہے اور محفوظ ہے مگر بے چارہ جماعت کے مفہوم سے بھی بے بہرہ ہے۔ قوم و ملت کے نام پر وہ بھڑک اٹھتا ہے مگر ناداں یہ نہیں سمجھتا کہ جسے وہ قوم و ملت کہہ کر پکارتا ہے وہ قبرستان سے لاشیں بطور نمائش نکالی ہوئی ہیں جن میں نہ تو شعور ہے اور نہ ہی حس۔ جو نہ تو سمجھتی ہیں اور نہ ہی سنتی ہیں۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم۔ وہ سب حجابات کی قیام گاہ میں استراحت کر رہی ہیں، انھیں کسی بڑے ہی تازیانے کی ضرورت ہے جو بڑے دھماکے سے انھیں اٹھا دے۔ مسلمان سمجھتا ہے کہ وہ نمائشِ دلاوری کر کے حریف کو پچھاڑ لے گا مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ حریف زمانہ شناس ہے اور اس کے احساسِ کمتری کو سمجھتا ہے۔ عقل وہ کام کرتی ہے جو طاقت نہیں کر سکتی۔ ایک انسان کی عقل ہزاروں انسان

کو پچھاڑ سکتی ہے مگر انسان یہ بھی نہیں سمجھتا۔ بدستور اپنے احساس کمتری کے زیر اثر نقلِ جوش کا اظہار کرتا چلا جا رہا ہے مگر حریف کی عقل اسے ہر قدم اور ہر مقام پر پچھاڑ رہی ہے۔ نادان یہ سمجھتا ہے کہ جیت اسی کی ہو رہی ہے۔ اپنی جماعت کی تڑپ پر ڈھارس لگائے بیٹھا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ یہ تڑپ احساسِ کمتری کا نقلِ جوش ہے۔ تڑپ حرکت کی مقتضی ہے پھر حجاب وقیام کے کیا معنی؟ ہم جانتے ہیں کہ اس حجاب کے پیچھے ایک طوفان کی شوکت پنہاں ہے۔ مگر اسے کیا کہئے کہ یہ حجاب خود ساختہ ہے اور حقیقی زندگی کے لئے اس کا اظہار مقصود ہے نہ کہ حجاب اور اس کے اظہار کے لئے دل و نگاہ مسلمان چاہئے

دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!!

ہمارے نزدیک اس کی سب سے اہم وجہ جو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان میں ایمان اور یقین مفقود ہو چکا ہے جب تک ایمان و یقین پیدا نہ ہوگا حجابات دور نہیں ہو سکتے افادی پہلو سے ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان و یقین نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان کے دل میں ڈر یا خوف سما گیا ہے۔ یہ ایک ایسی خُو ہے جو انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اس خوف کی وجوہات جو ماہرین نفسیات بتاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ بچپن میں خاندانی اثرات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بچوں کو وہ بڑوں کا دستِ نگر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر بچہ لاڈلا ہے تو اس کا ہر کام اور اس کی ہر ضرورت پوری کر دی جاتی ہے اور اسے خود زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پیدا ہوتی اسے ہر کام کے لئے مددگار چاہئے۔ چنانچہ بڑا ہو کر بھی وہ زندگی کی جدوجہد کے لئے سہارا ڈھونڈتا ہے اور جہاں کہیں راہ ٹیڑھی آ گئی تو وہ بھاگ نکلتا ہے۔ اسی طرح دوسری وجہ جو خوف کی بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بچپن میں رات کے وقت بچوں کو ڈرانا اور ان کے ذہن پر غلط قسم کا اثر جما دینا اور بچوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا ان میں بہادری کی خُو مفقود کر دیتا ہے۔ علم النفسیات میں اس سے متعلق بہت طویل مباحث موجود ہیں۔ مگر ہمیں جس خوف کا ذکر کرنا ہے اس کی تاویل ماہرین نفسیات کے پاس موجود نہیں۔ ہم خوف یا ڈر سے صرف ایک مطلب سمجھتے ہیں اور وہ موت کا خوف ہے۔ اگر یہ خوف جزا و سزا کے لئے ہے تو ہمارے علم النفسیات میں وہ ڈر نہیں کہلائیگا۔ اور اگر موت کا ڈر اس لئے ہے کہ کوئی دنیاوی مفاد جاتا رہیگا۔

تو پھر وہ حقیقی خوف ہے جس کی وجوہات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں یعنی یہ خوف ماسوا اللہ ہے یا یوں کہئے کہ اللہ کے سوا سب سے ڈر موجود ہے اگر نہیں ہے تو اللہ سے نہیں۔ یہی خوف ہے جس کی ہم تفصیل سے عرض کرتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے یعنی اس پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے دل میں کسی اور کا رعب نہیں پڑ سکتا۔ خوف اسی شخص کو ہوتا ہے جس کا ایمان کمزور ہو، لہذا یہ ایک امر واقعی ہے کہ دنیا میں جس قدر بزدل لوگ ہیں ان سب کا ایمان کمزور ہے اور نہ ہی صرف کمزور ہو بلکہ اکثر ان میں بالکل ہی مفقود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا . . . . جو لوگ ایمان لائے وہ ہوں . . . . . .

وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ) اور ان کیلئے نہ تو کسی قسم کا خوف ہو اور نہ ہی غمگینی۔

اس قسم کی آیات مختلف جگہوں پر ہمیں قرآن کریم میں ملتی ہیں۔ ایمان کا مطلب ہی یہی ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی سب کا خوف دل سے نکل جائے اور یقین کامل کے ساتھ اسی پر ہر بات کے لئے بھروسہ کیا جائے یہ خوف محض لڑائی جھگڑے کا نہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جھگڑالو انسان نہ تو بہادر ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا ایمان پختہ ہوتا ہے بلکہ یہ تو احساسِ کمتری کی نشانیاں ہیں۔ بلکہ ان جھگڑوں سے بھی بلند ایک خصلت ہے جس پر پورا اترنے کے لئے انسان کو ایک بلند حوصلہ اور دل چاہیئے۔ اور اس پر عمل ایمان کی پہلی علامت ہے اور وہ راست گوئی اور اعلانِ حق ہے۔ تو گویا زندگی کے افادی پہلو کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم پہلو یہی ہوا کہ ماسوا اللہ سب کا خوف دل سے نکل جائے اس کی خلاف ورزی احساس کمتری کی موجد ہو گی۔ کیونکہ ایمان باللہ ایک فطری اور وجدانی فعل ہے کسی شخص پر بھروسہ کرنے سے پیشتر یہ یقینی بات ہے کہ پہلے خود اپنے پر بھی بھروسہ ہو جن کا بھروسہ اپنے پر نہیں ہوتا وہ شکی طبیعت کے انسان ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ بھروسے سے ہمارا مطلب مکمل اختیار نہیں ہے بلکہ ایک قابلیت کا شعور ہے جس سے انسان اپنے آپ کو تول لیتا ہے اسی لئے زندگی یا حرکت کا سب سے بڑا اصول اعتماد اور ایمان ہے۔ ہم نے زندگی کو حرکت اس لئے کہا کہ حرکت ہی زندگی کی ایک نشانی ہے اگر حرکت نہیں ہے تو موت ہے۔ اس حرکت کو جہاں انسان کا تعلق ہے ہم جدوجہد کہہ سکتے ہیں اور یہی جدوجہد ایک جہاد ہے تو گویا زندگی ایک مسلسل جہاد ہے اور جہاد بغیر

ایمان کے تکمل کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور اگر جہاد میں ایمان مفقود ہے تو وہ پھر الحرب من اللہ ورسولہ ہوگا جہاد نہ ہوگا۔ بیشتر مسلمان ہمارے ان دلائل کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے، ان کے پاس گھڑے گھڑائے دلائل ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جس میں ہیچ مقداری کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا وجود ہی اس وقت ان کے خلاف حجت ہے،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ — بلکہ انسان کا وجود ہی اس کے خلاف حجت ہے

وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ — اگرچہ وہ کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

مختصراً ہمارے اس نظریے کے مطابق مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت ہے جس پر انھیں عمل کرنا چاہئے تاکہ زندگی کے افادی پہلو کو کامیاب بنایا جاسکے۔ اول یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ جو قرآنِ کریم نے کہدیا ہے وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ تو وہ اسی مسلمان کے لئے کہا گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ یعنی جب غصہ آئے جب بھی معاف کردیتے ہیں تو یہ بھی مسلمان ہی کی خصلت بیان کی گئی ہے۔ غصہ کو وہی دبا سکتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا رعب سمایا ہوا ہو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں اصولوں پر قائم رہ کر مسلمان احساسِ کمتری کے تمام حجابات پر قابو پا سکتا ہے اور وہ اس لئے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ میں اس کا ایمان مضبوط ہوگا۔ اور جب اللہ تعالیٰ میں کامل یقین ہوگیا تو پھر نتیجہ معلوم۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ — اور اللہ ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے

اس کے بعد ہم زندگی کا ایک اور آفادی پہلو لیتے ہیں جو نفسیاتی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے آج کل ازحد ضروری ہے اور جس کی عدم موجودگی فی زمانہ مسلمانوں کی بے بسی کا باعث ہے یہ پہلو تقدیری پہلو ہے اور اس کی جدید تاویلوں نے مسلمان کی زندگی کو مفلوج کردیا ہے۔ مسئلہ قضا و قدر ایک پرانا دردِ سر ہے۔ ہم اس کے متعلق تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ہم اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس کا تعلق خیر و شر کے ساتھ بالکل نہیں ہے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ خیر و شر بھی تقدیری ہے اگرچہ قضا و قدر سے مختلف مسئلہ ہے۔ خیر و شر کے متعلق ایک مستند حدیث ہے۔

لا یومن احدکم حتی یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ — کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس پر ایمان نہ لے آئے کہ خیر وشر کی تخلیق من اللہ ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن ماجہ اور مشکوٰۃ میں موجود ہے۔ ہم اسے یہاں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک واقعی امر ہے اور بعینہ اسی طرح ہے جس طرح حدیث نے بیان کر دیا مگر جب ہم بیان کرتے ہیں تو اس میں ایک عجیب لطیفہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کبھی قضا وقدر سے متعلق دلائل پیش کئے جا رہے ہوں تو عموماً یہ حدیث پیش کر دی جاتی ہے حالانکہ اس کا تعلق خیر وشر سے ہے نہ کہ قضا وقدر سے۔ شر سے مراد شیطنیت ہے نہ کہ ہر وہ حادثہ جو دنیاوی واقعات کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی جدوجہد کے نتائج اگر خاطر خواہ نہیں تو وہ شر نہیں کہلائیں گے اور اگر اچھے ہیں تو خیر نہیں کہلائیں گے۔ اعمال کے نتائج کا دارومدار تقدیری قانون پر ہے نہ کہ خیر وشر پر۔ خیر وشر کا مفہوم انگریزی الفاظ Good and Evil. سے زیادہ بہتر واضح ہو جاتا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انفرادی جدوجہد کا تعلق اس کے نتائج کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح۔ اور اگر ایک مفلوج ہو تو دوسرا بیکار ہے۔ آج کل مسلمانوں میں جدوجہد مفقود ہے وہ بغیر عمل کئے نتائج کے منتظر ہیں اور جب نتائج خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتے وہ اسے اپنی قسمت یا تقدیر پر سونپ کر اپنی ذمہ داری اور اپنے فرائض سے فراری حاصل کر لینا چاہتے ہیں یہ علامت بھی احساسِ کمتری ہی کی ہے۔ انسان ایسے بہانے فقط اس وقت تراشتا ہے جب اسے اپنی بے بسی کا یقین اور احساس ہوتا ہے یہ محض مسلمانوں کی بے بسی ہی تھی جو انھوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ورنہ یہ ایک سیدھا سادھا مسئلہ تھا اور اس میں چنداں اشتباہ کا امکان نہ تھا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (بقرہ) — اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہو جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اُس نے کیا۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ایک ہی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر ہر جگہ اسبابِ نزول مختلف ہیں ہم ان اسباب کو مدنظر نہیں رکھتے اور جو آیت دل کو بھاتی ہے اور حالات کے مطابق ہوتی ہے اٹھا کر اسے اپنے افعال کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے احساسِ کمتری کا! اور سب سے خطرناک فعل ہے انسان کا۔

اپنی تائید میں ہم انسان کا قول پیش نہیں کرتے۔ مگر بوجہ احساس کمتری چاہتے ہیں کہ ایسا قول پیش کیا جائے جس کا رد مشکل ہو۔ پس اپنی صفائی میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو پیش کرتے ہیں کیونکہ عوام اس کا رد بوجہ جاہلیت بمشکل ہی کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو بطور سند پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اول کسی ایسے مسئلے کی صفائی کر دی جائے جس میں شبہات ہوں اور کسی بات کی تصدیق کر کے حقیقت ظاہر کر دی جائے مگر آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خود غرض ہستیاں دنیاوی اغراض اور ذاتی کوتاہیوں کو ترتیب دیکر سلجھانا چاہتی ہیں۔ اس تطابق کی وجہ محض احساسِ کمتری ہے۔ مصیبتیں اور مشکلات خیر و شر کے مسائل نہیں ہیں، ان کا تعلق قضاؤ قدر سے ہے اور ان کا انحصار انسانی جدوجہد پر ہے۔ قسمت کی آڑ لیکر ہم اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ اس کی وجہ سے زندگی کا ایک اہم افادی پہلو مفقود ہو جاتا ہے۔ اپنے افعال کے ناموافق نتائج کے لئے ہم اسباب تلاش کرتے ہیں حالانکہ ہم خوب جان رہے ہوتے ہیں کہ وجوہات کیا ہیں۔

کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ۔ ہر انسان اس کے نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے تو پھر تلاش اسباب چہ معنی دارد؟ اسباب تو خود اس کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اسے خود اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے نہ کہ دوسروں میں یا تقدیر کے لکھے ہوئے پر۔

وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا	اور تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کئے
کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ	ہوئے اعمال کا نتیجہ ہے۔

اور نتائج کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ	یعنی انسان کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا مگر جس چیز
اِلَّا مَا سَعٰی۔	کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

تو گویا ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کن کن آفات میں گرفتار ہو رہا ہے نہ ہی صرف یہ بلکہ اوروں کو بھی غلط راہ روی کی تلقین کرتا ہے۔

علم النفسیات کا ایک اور افادی پہلو جو احساسِ کمتری کی وجہ سے مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے وہ حلیمی اور انکساری ہے۔ غرور و تکبر روز بروز بروئے ترقی ہے باوجودیکہ قرآن کریم کا اعلان ہے۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ   اور اللہ اترانے والوں کو اور بڑائی مارنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

غصہ کی طرح غرور و تکبر بھی علامات احساس کمتری ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو دوسرے کے برابر پیدا کیا ہے تو پھر غرور و تکبر کے کیا معنی؟ دنیاوی جاہ و حشمت کی بنا پر تکبر جاہلوں کا شیوہ ہے۔ انسانیت میں مساوات تب ہی برقرار رہ سکتی ہے جب حلیمی اور انکساری موجود ہو۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ تعصب ادعانیت، رشک، خود بینی، لنترانیاں، حرص، بدظنی اور دوسروں کے مصائب پر خوش ہونا، اختیار کر کے انسان اپنا تحفظ قائم کرنا چاہتا ہے۔ انفرادی تحفظ کا یہ مقصد نہیں کہ معاشرتی نظام کو آلودہ کیا جائے۔ بلکہ انسان کی فطرت جو کہ صالح ہے اس بات کی مقتضی ہے کہ امن قائم ہو۔ اور امن اندریں حالات کہ مندرجہ بالا خصائل جماعت میں موجود ہوں کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ یہ خصائل غیر فطری ہیں اور احساس کمتری کا پیش خیمہ ہیں۔ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ان کے جذبات نے ایک احساسِ برتری پیدا کیا ہے Superiority Complex حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ احساسِ برتری اول ہیچ مقداری ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ہیچ مقداری کا احساس موجود نہ ہو، یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ احساسِ برتری پیدا نہیں ہو سکتا ہم لکھ آئے ہیں کہ افراد کو چھوڑ کر ہمیں یہ علامات اقوام میں بھی ملتی ہیں جنگ، سیاسی گالی گلوچ۔ مختلف قسم کے جرم، خودکشی وغیرہم۔ سب احساس کمتری ہی کی علامتیں ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیاوی نظام کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ احساس کمتری کا ہے۔ جب تک اس علت کی بیخ کنی نہ کی جائے گی انسان انسان کے سامنے اپنے اصل رنگ میں ظاہر نہیں ہو سکتا اور ہر شخص ہر قدم پر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہے گا۔ جب کبھی انسان اکیلا ہوتا ہے تو وہ اس وقت حقیقت کے میدان سے نکل کر تخیلی دنیا میں پرواز کرتا ہے اور یہی وہ دنیا ہے جہاں وہ حقیقت سے بہت دور نکل جاتا ہے اور آپ کو دھوکہ دینا شروع کرتا ہے۔ علم النفسیات کا سب سے اہم افادی پہلو یہی ہے کہ جماعت کو برقرار رکھا جائے۔ جماعت کے ہر فرد کو اس بات کا شعور ہونا چاہیئے کہ اس کے فرائض کیا ہیں، بغض و عناد رشک و حسد، تعصب، نکتہ چینی وغیرہم یہ سب ایسے خصائل ہیں جن سے جماعت میں رخنہ پڑ جاتا ہے ہر فرد کا فرض ہے کہ ان سے پرہیز اور احتراز کرے۔

ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کرتے کہ رائے زنی اور نکتہ چینی بسا اوقات مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر جہاں رائے قائم کرنا ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ رائے صرف اپنی ذات کے ساتھ وابستہ رکھی جائے جب تک کہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے چنانچہ یہ بھی ایک اخلاقی فرض ہے کہ رائے کا اظہار نہ کیا جائے جب تک کہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے یہ اجتماعی اصولوں کے مطابق ہے جب تک ایک رائے دوسری رائے پر پرکھ نہ لی جائے اس کا اعلان کرنا جائز نہیں ہے۔ انفرادی رائے حقیقی معنوں میں رائے نہیں ہوا کرتی وہ محض جذبات کے ماتحت احساسِ کمتری کے ذریعہ نقلِ جوش کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی واسطے یہ قانون قائم کر دیا ہے

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے کرو

یہ مشورہ اسی واسطے طے پایا ہے کہ پیشتر اس کے کہ ایک رائے کا اعلان کیا جائے اس کا دوسری مستند رائے سے پرکھنا ضروری ہے وقال عمر رضی اللہ تعالیٰ لاخلافۃ الا بمشورہ یعنی خلافت بغیر مشورہ کے خلافت نہیں ہے اور پھر خلافت کیا چیز ہے آخر؟ خلافت نام ہے ایک معاشرتی نظام کا جو مسلمانوں کی جماعت قائم کرتی ہے اور سیاسیات میں اس جماعت کی رہنمائی کرتی ہے اور اگر ایسی جماعت میں بغیر مشورہ کوئی بات نہیں ہو سکتی تو پھر انسان کو کیا حق ہے کہ وہ خواہ مخواہ رائے زنی کرتا پھرے۔ قرآن کریم کا مشہور ارشاد ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ ان سے مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ قائم ہو جائے تو پھر صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔

کس قدر صریح اور صاف حکم ہے جسے ہم آج کل سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آخر یہ حکم کیوں دیا گیا تھا؟ محض اس لئے تھا کہ جماعت کا نظام برقرار رہے۔ اگر مشورہ سے کام نہ ہو تو پھر ہزار ہا رائے قائم ہو جائیں گی اور کوئی کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے گا۔ نتیجہ معلوم۔

مضمون بڑھتا جا رہا ہے لیکن موضوع اس قدر وسیع اور دلچسپ ہے کہ "افسانہ از افسانہ می خیزد" کسی آئندہ صحبت میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ اسی موضوع پر کچھ اور عرض کریں گے۔

وآخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا عسی اللہ ان

یتوب علیھم۔ ان اللہ غفور رحیم ہ

بُرہَان

جلد ہفتدہم شمارہ (۶)

دسمبر ۱۹۴۶ء مطابق محرم الحرام ۱۳۶۶ھ

فہرستِ مضامین

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۳۲۲
۲۔ قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟	جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی	۳۲۵
۳۔ اسبابِ کفر و جحود	جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ	۳۳۹
۴۔ بچوں کی تعلیم و تربیت	سعید احمد اکبر آبادی	۳۶۵
۵۔ مصر کا سیاسی پس منظر	جناب مظفر شاہ خاں صاحب، ایم۔ اے	۳۷۴
۶۔ تبصرہ	م ۔ ح	۳۸۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پنجاب اور لکھنؤ کی طرح یوپی میں بھی ایک مدت سے عربی اور فارسی کے سرکاری امتحانات کا نظام ایک بورڈ کے ماتحت قائم ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرح اگرچہ حکومت کا اپنا کوئی مستقل اورینٹل کالج نہیں ہے لیکن صوبہ کی ۵۹ عربی فارسی درسگاہیں ہیں جن کو حکومت کی طرف سے ان امتحانات کے سلسلہ میں کم از کم پچاس اور زیادہ سے زیادہ پانچسو روپیہ ماہانہ کی امداد ملتی ہے اور اس طرح حکومت یوپی ۵۶ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتی ہے۔ پہلے ان امتحانات کے رجسٹرار مولوی ضیاءالدین صاحب ندوی ایم۔ اے تھے۔ اب معلوم نہیں اس جگہ پر کون صاحب کام کر رہے ہیں۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ ان امتحانات کی وجہ سے عربی اور فارسی کے طلباء کو جہاں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ان زبانوں میں سرکاری طور پہ مستند ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان کے سرکاری امتحانات محض زبان میں پاس کر سکتے ہیں اس طرح ان کا خرچ بھی کم ہوتا ہے اور عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی سے بھی ناآشنا نہیں رہتے۔

لیکن اس نظام کے جو نتائج اب تک سامنے آئے ہیں اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظام سے دینی مقاصد تو کیا حاصل ہوتے۔ علمی اعتبار سے بھی وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جن کی ایک ایسے بڑے نظام سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ طلباء یہ امتحانات صرف اس لئے پاس کرتے ہیں کہ اُن کو اسکولوں میں مدرسی کی جگہ ملجائے۔ یا وہ ان کے بعد ایف اے اور بی۔ اے کر لیں ان دونوں صورتوں میں یہ لوگ "ہر چہ در کانِ نمک رفت و نمک شد" بن کر رہ جاتے ہیں اور پھر انھیں نہ علمی کارناموں سے دلچسپی باقی رہتی ہے اور نہ دینی حیثیت سے وہ کسی کے لئے نمونہ کا کام دے سکتے ہیں۔ پھر ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ چونکہ ان لوگوں کو نہ "پوری" عربی آتی ہے اور نہ "پوری" انگریزی،

اس لئے نہ انھیں قدیم تعلیم کے گروہ میں کوئی امتیاز حاصل ہوتا ہے اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اُن کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت ہوتی ہے۔

اس بنا پر ضرورت تھی کہ اس نظام کو بہتر۔ موثر اور مفید تر بنانے کے لئے اس پر نظر ثانی کی جائے اور اسے ایک ایسی بنیاد پر چلایا جائے جس سے علومِ مشرقیہ کی ہر دلعزیزی بڑھے اور ان کی تعلیم اور امتحانات سے جن قومی اور اجتماعی مقاصد کی تکمیل کی توقع ہوسکتی ہے وہ بڑی حد تک پوری ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ پچھلے دنوں اسی ضرورت کے پیشِ نظر یو پی کی حکومت نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو ہمارے رفیقِ ادارہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر زبید احمد الٰہ آباد یونیورسٹی مولانا محمد میاں فاروقی اور چند اور حضرات پر مشتمل ہے یہ کمیٹی عربی کے نصابِ تعلیم، توسیعِ نظامِ تعلیم اور مدتِ تعلیم وغیرہ کے سلسلہ میں اپنی سفارشیں پیش کرے گی اور امید ہے کہ حکومت ان پر عمل بھی کریگی

اگرچہ ہم بنیادی طور پر اس بات کے حامی ہیں کہ مسلمانوں کی قومی تعلیم اور خصوصاً عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہونا چاہئے لیکن آج کل جبکہ ہمارے علمائے مدارس غفلت کی چادر تانے بے حسی کی نیند سو رہے ہیں عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح کی آواز جس کسی گوشہ سے بھی اٹھے اور اس راہ میں جدوجہد کی پکار خواہ کسی بھی جہت سے بلند ہو بہرحال لائقِ توجہ اور باعثِ مسرت ہے۔ کمیٹی جن حضرات پر مشتمل ہے اُن کی بصیرت، وسعتِ نظر۔ اور لیاقت و اصابتِ رائے پر اعتماد کرکے کہا جاسکتا ہے کہ وہ یوپی میں عربی تعلیم کے نظام کو کامیاب اور مفید تر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔

اب سے پچیس سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علیگڈھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے دردمند رفقار مولانا محمد علی مرحوم اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی معیت میں رکھی تھی۔ گذشتہ ماہ میں اس درسگاہ کا جشنِ سیمیں بڑی آب و تاب سے جامعہ نگر اوکھلے میں منایا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جوبلی کے خاص جلسہ میں اپنا خطبہ پڑھتے ہوئے بتایا کہ جامعہ والوں نے متانت اور سنجیدگی حکیم صاحب

سے لی اور قومی اور اجتماعی کاموں میں دیوانہ پن مولانا محمد علی مرحوم سے سیکھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جامعہ انگریزی تعلیم کی اصلاح و ترقی کی ایک پسندیدہ اور خوشنما عملی شکل ہے۔ چنانچہ یہاں کے اساتذہ اور طلباء، دونوں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ منکسر المزاج اور متواضع ہوتے ہیں کفایت شعاری اور قناعت پسندی ان کا خاص جوہر کمال ہے۔ حقائق پر سنجیدگی اور متانت سے غور کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ جذبات کو عقل پر غالب نہ آنے دینے کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں۔ قومی زبان۔ قومی کلچر اور قومی لٹریچر سے انھیں دلچسپی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بقول شیخ الجامعہ کے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اُن کی ذہنیت غلامانہ یا کم ازکم مرعوبانہ نہیں ہوتی، یہ سب وہ بلند پایہ صفات و کمالات ہیں جن سے ہماری تعلیم جدید کی درسگاہیں عموماً تہی مایہ ہیں اور اس حیثیت سے بے شبہ جامعہ ملیہ نے پچیس سال کی مدت میں جو کام کر دکھایا ہے وہ ہر سمجھدار اور بالغ نظر مسلمان کی مبارکباد کا مستحق ہے۔

لیکن بیجا نہ ہوگا اگر ہم اس موقع پر ارباب جامعہ کو یہ یاد دلائیں کہ مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے قلب و دماغ کی انگیٹھی جس آتشِ ایمان و عمل سے فروزاں تھی وہ حضرت شیخ الہند کے قلب تپاں کی حرارتِ اسلامی ہی کی ایک چنگاری تھی۔ اس لئے ان دونوں بزرگوں سے زیادہ ضروری اور مقدم یہ بات ہے کہ اصل سرچشمۂ فیض کو سامنے رکھا جائے اور اپنے ارادوں اور کاموں میں اسی ایک نقشِ قدم پر چلا جائے۔ سادگی، حُسنِ خلق، تواضع، قناعت کیشی، کفایت شعاری۔ حریت طلبی، علمی اور ادبی کام، لٹریچر سے دلچسپی اور اس میں اضافہ و ترقی کی کوشش یہ سب بلند پایہ اور لائق صد تحسین اوصاف و کمالات ہیں، لیکن اگر ان اوصاف کی بنیاد "نیست ممکن جز بقرآن زیستن" کے یقین محکم پر قائم نہیں ہے تو پھر اسلام کی طرف سے ان اوصاف پر کوئی مبارکباد پیش نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جہاں تک ان اوصاف کا تعلق ہے دوسری قوموں میں اس قسم کے نمونے بلکہ شاید زیادہ بلند پیمانہ پر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اسلامی تصورِ زندگی کی اصل روح اسلامیت ہے قومیت نہیں۔

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۳)

حق گذشتہ صفحات میں یہ واضح ہوچکا ہے کہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ وہ "فرقان" ہے دلیل کی روشنی میں بلاشبہ صحیح دعویٰ ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ میں "حق" ہوں یعنی "باطل" نہیں ہوں بلکہ باطل تو میرے قریب بھی نہیں آسکتا "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیلٌ من حکیم حمید۔

کیا یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں نہیں ہے کہ جس کا وصفِ عالی "فرقان" ہو اور جو حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنا اپنا فرض قرار دیتا ہو وہ جب ہی "فرقان" کہے جانے کا مستحق ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی "حق" ہو کیونکہ حق روشن ہے اور باطل ظلمت، روشنی سے ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اچھے برے میں امتیاز پیدا کردے نہ کہ تاریکی سے جو خود ہی گم گردہ راہ ہو، تم شبِ دیجور سے کب یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری دستگیری اور راہنمائی کا فرض انجام دے سکے گی البتہ چراغِ محفل ضرور محفل کے رنگ و بو اور نیک و بد کو آشکارا کرتا نظر آتا ہے۔

تم جب "حق" کہتے ہو تو گویا یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو شے جس طرح ہے جہاں ہے جس کیفیت کے ساتھ ہے اس میں اور تمہاری تعبیر میں کوئی فرق نہیں ہے اور اسی کو عام بول چال میں حقیقتِ نفس الامر کہا جاتا ہے اور جب باطل کا ذکر کرتے ہو تو یہ مطلب لیتے ہو کہ وہ شے جو کچھ ہے جس طرح ہے اور جس شکل و صورت اور کمیت و کیفیت کے ساتھ ہے ہماری تعبیر اس حقیقتِ نفس الامر کا انکار کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری تعبیر اصل حقیقت کا کیوں انکار کرتی ہے؟ تو اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم "حقیقت" سے ناآشنا اور بے خبر ہیں، نادان اور جاہل ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم حقیقت رسی کے باوجود کذب و دروغ سے کام لے رہے ہیں اور یہی مذموم صفت ہماری غلط تعبیر کا منشا و مولد ہے تب ظاہر ہے کہ قرآن "حق" ہی ہو سکتا ہے "باطل" کسی طرح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن نے جبکہ اپنی حقیقت نمائی کے لئے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "الکتاب" اور "الہدیٰ" ہے یعنی عالم الغیب و الشہادہ خدا کی جانب سے منزل اور پیغام ہدایت ہے تو بلاشبہ وہ نادان و ناواقف کا کلام نہیں ہے اور اگر خدا کی ہستی ہے اور بے ریب و شک "ضرور ہے" تو لاریب یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ حقائق اشیار کا خالق و مالک ہے پس جو ذات کسی حقیقت کے لئے خالق ہو اس کے متعلق کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی پیدا کردہ "حقیقت" کے خلاف اظہار و اعلان کرے گی اور اس طرح "حقیقت" کو "بے حقیقت" بنائے گی خصوصاً جبکہ وہ ذات قدسی صفات تمام صفات حسن و کمال کی مالک و حامل ہو۔

پس قرآن جبکہ نہ کذب و دروغ ہے کیونکہ "ہدیٰ" ہے اور نہ نادانی و جہل کا مرقع کیونکہ "کتاب اللہ" اور "الفرقان" ہے لہٰذا اس کا قدرتی اور فطری ثمرہ اور نتیجہ ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن "حق" ہے "باطل" نہیں ہے "نور" ہے "ظلمت" نہیں ہے "صدق" ہے "کذب" نہیں ہے۔

چنانچہ سورۂ قٓ میں قرآن عزیز نے اپنے اس وصف کو اس آیت میں پیش کیا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ — بلکہ ان مشرکین نے حق کو جھٹلایا جبکہ وہ ان کے پاس

فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ۔ — آیا پس وہ بےچین اور مضطرب کر دینے والی بات میں مبتلا ہیں

یعنی جو لوگ قرآن کی اس حقیقت کا انکار کرتے اور تعصب کی راہ سے جحود و کفران کو اسوہ بناتے ہیں وہ اس مسئلہ میں سخت اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہیں کہ نہ ان کو حق و صداقت کی روشنی کا انکار کرتے بن پڑتا ہے اور نہ اس کے پیغام و صداقت کے قبول پر طبیعت کو آمادہ کر پاتے ہیں، جب وہ ڈھیٹ بن کر زبان سے انکار کرتے ہیں تو ضمیر کی آواز نفرت و ملامت کرتی سنائی دیتی ہے اور جب اقرار کرنا چاہتے ہیں تو نفسانی خواہشات اور قومی عصبیت کی ظلمتیں اقرار سے باز رکھنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں

اور یہ بے وقوف وادیٔ حیرت و اضطراب میں سرگرداں رہتے اور گم کردہ راہ انسانوں کی مردم شماری میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔

مفسرین نے اس مقام پر "الحق" کی تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "نبوتِ ثابتہ" اور "معجزات" سے بھی کی ہے مگر ان ہر دو تفاسیر کے پیشِ نظر بھی قرآنِ عزیز کے "الحق" ہونے اور اس آیت کی تفسیر میں اُس کے شامل و داخل رہنے کا مسئلہ اپنی جگہ اُسی طرح قائم ہے اس لئے کہ جس طرح "برہان" کی بحث میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس یا آپ کے معجزات اگر "برہانِ رب" ہیں تب بھی قرآن کا "برہان" ہونا اپنی جگہ مستقیم اور صحیح ہے۔ اسی طرح یہاں بھی یہ کہنا بے محل نہیں ہے کہ "قٓ والقرآن المجید" کے بعد اگر "کذبوا بالحق" کا اعلان کیا گیا ہے تو خواہ اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تامّہ اور آپ کے معجزات ہی کیوں نہ مراد ہوں مگر قرآن پھر بھی اس لئے "الحق" ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کے معجزات کے ثبوت کے لئے قرآن سے بڑھ کر کون "حق" ہو سکتا ہے اور کیا اس "حق" کی تکذیب کے باوجود اقرارِ رسالت اور اعترافِ معجزات کو "ایمان بالحق" کہا جا سکتا ہے؟

غرض بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ آیت "کذبوا بالحق" کا مصداق بلا شبہ قرآنِ حکیم ہے۔

آیئے ہم قرآنِ عزیز کے اس دعویٰ کی صداقت کو ادیان و ملل کی تاریخ کے سامنے پیش کر کے اُس سے فیصلہ حاصل کریں کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ ہندوستان کے مذہبِ قدیم کی یادگار وید کو بتلایا جاتا ہے لیکن چاروں وید کے مطالعہ کے بعد بھی یہ پتہ لگانا ناممکن ہے کہ جس طرح ہندوستان میں خدا کا پیغامِ حق سنایا گیا تھا کیا یہی پیغامِ حق کائنات کے اور گوشوں میں بھی سنایا گیا ہے اور یہ پیغام خدا کے کس برگزیدہ رسول کی معرفت سنایا گیا اور کائناتِ انسانی کے دوسرے حصوں اور خطوں میں بھی اسی طرح خدا کے پیغمبر اور رسول آئے ہیں یا نہیں۔

اسی طرح یہود سے موجودہ عہدِ قدیم (توراۃ) اور نصاریٰ سے عہدِ جدید (انجیل) کو لیجئے اور مطالعہ کے بعد بتلایئے کہ بنی اسرائیل کے خانوادہ کے علاوہ کیا خدا نے کسی اور قوم و نسل سے پیار کیا اور دوسرا کوئی

ملک بھی پاک نبیوں اور رسولوں کا مہبط رہا ہے یا نہیں تو سکوت یا نفی کے ماسوا دوسرا جواب نہیں ملے گا۔

نیز آج اوستا اور ژند سے یہ توقع بیکار ہے کہ وہ فارس اور آذر بیجان کی طرح یہ بھی بتلائے کہ ہندوسندھ چین وماچین یورپ والیشیا افریقہ وامریکہ کے کسی گوشہ میں بھی زردشت کی طرح کوئی خدا کا پیغامبر اور رسول آیا ہے اور کب آیا ہے اور اس کی پیغامِ رشد وہدایت کے اصول کیا رہے اور کیا تھے۔

غرض موجودہ ادیان وملل کی تاریخ اس حقیقت کے اعلان سے قاصر ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور یہ تمام کائناتِ ہست وبود اُسی ایک خدا کی مخلوق ہے تو بلاشبہ اُس کا پیغامِ حق بھی ہمیشہ سے ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہی پیغامِ حق تخلیقِ آدمؑ سے آج تک کائنات کے ہر گوشہ میں سنایا جاتا رہا ہے اور اپنے آغاز سے انجام تک ایک ہی حقیقت کا داعی ومنادر رہا ہے۔

لیکن جب جھلسے ہوئے پہاڑوں اور تپتی ہوئی ریت کے درمیان "وادی غیر ذی زرع" میں سب سے پہلے خدا کی آواز گونجی تو فاران کی چوٹیوں اور حجاز کے میدانوں نے وہ سب کچھ سنا جس کے سننے کی ہر ایک انسان کو جستجو تھی اور جس کے اعلان کی ہر ملتِ حقہ سے توقع کی جاسکتی تھی۔

یہ قرآن ہی کی آواز تھی جس نے بار بار پکارا۔ "وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر" کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی جانب سے خوف دلانے والا نہ گذرا ہو" "ولکل قوم ھاد۔ اور ہر قوم میں ہادی آئے"۔ "ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک منھم من قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک۔ اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے) پہلے بعض ان میں وہ ہیں کہ جن کا احوال ہم نے تجھ کو سنایا اور بعض وہ ہیں کہ ان کا حال نہیں سنایا"۔ "لا نفرق بین احد من رسلہ۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ہم کسی رسول کے رسول ہونے میں کوئی فرق نہیں کرتے" یعنی جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا رسول جانتے ہیں اُسی طرح کائنات کے ہر گوشہ میں خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانا فرض سمجھتے ہیں۔

غور کیجئے مذکورہ بالا حقیقت پر اور فیصلہ حاصل کیجئے تاریخ کے اس روشن صفحہ سے کہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے ببانگِ دہل دنیائے مذہب کے سامنے اس فراموش شدہ حقیقت کو

اجاگر کیا کہ خدا ایک ہے تو اس کی صداقت کا پیغام بھی ایک ہی ہے اور وہی مختلف زبانوں میں خدا کے سچے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت سنایا جاتا رہا ہے اور یہی وہ پیغام حق ہے جس کو آج کامل و مکمل صورت میں " الحق " کے نام سے تم کو سنا رہا ہوں " فهل ثم داعٍ او مجیبُ اذانٍ " پس ہے کوئی جو آج میری طرح یہ صدا لگائے یا کم از کم میری صدائے حق پر کان دھرے "

مُصَدِّق | قرآن جبکہ " حق " ہے اور اُس کے پیغامِ حق وصداقت کا اعلان گویا ہدایت اور مشاہدہ کا اعلان ہے تو حق کی صفاتِ عالیہ میں سے ایک بڑی صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر ایک حق کی تصدیق کرے اور تائیدِ حق سے اس کی صداقت وحقانیت کو زینت بخشے اس لئے قرآن نے اس گوشہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور شوکتِ تعبیر کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ خدائے برحق کے سچے ادیان و ملل اور خدا کی سچی کتابوں اور اس کے پیغاماتِ حق کے لئے " مصدّق " بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج انبیاءِ سابقین کے الہامی صحیفے محرّف ہی کیوں نہ ہوگئے ہوں اور خود اُن کے ماننے اور اُن پر اعتقاد رکھنے والوں نے ان کی حقیقت کو بڑی حد تک مسخ ہی کیوں نہ کر دیا ہو لیکن میں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا بلکہ اپنے ماننے اور قبول کرنے والوں کے ایمان واعتقاد کا جزء بنانا چاہتا ہوں کہ توراۃ، زبور انجیل اور کائناتِ انسانی پر منزل من اللہ دوسرے تمام صحیفے اور الہامی کتابیں سب ہی حق کا پیغام اور رشد وہدایت کا سامان رہی ہیں اور آج بھی تحریف و مسخ کی ظلمتوں کے باوجود ان میں کہیں کہیں روشن خد وخال اور حقیقی شکل وصورت کی جھلک نظر آجاتی اور اپنی صداقت وحقانیت کا جلوہ دکھا کر عبرت وموعظت کا صور پھونکدیتی ہیں۔ " اٰمِنوا بما نزّلنا مصدّقاً لما معکم۔ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے نازل کی جو تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں " " وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدّقاً لما بین یدیہ من الکتاب ومھیمناً علیہ۔ اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی، تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور اُن کے مضامین پر نگہبان "

مُہَیمِن | اس لئے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میرا کام صرف یہی نہیں ہے کہ میں گذشتہ کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کروں اور نبیوں اور رسولوں کے گذر جانے کے بعد اُن کی امتوں نے جو تحریفیں اُن کے اندر کی ہیں

اور اُن پر مسخ کی کند چھری چلائی ہے اُن سے اغماض کر جاؤں۔ کیونکہ اگر ایسا کروں تو اپنے وصف "الحق" کی خلاف ورزی کا مرتکب بنتا ہوں جو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے یہ واضح رہے کہ میں سابقہ کتابوں اور گذشتہ صحیفوں کے مضامین اور تعلیمات پر مہیمن اور نگہبان بھی ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کی تصدیق کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلاؤں کہ خدا کی ان مقدس کتابوں کی حقیقی تعلیم کیا تھی اور اُس کو مسخ یا فراموشی کے نذر کرکے کیا سے کیا بنا دیا گیا

گویا یوں کہہ لیجئے کہ اگر امم سابقہ اور ادیان و ملل سابقہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر فلسفۂ تاریخ کا نقاد تنقیدی نظر سے حق و باطل کے امتیاز کی خواہش رکھتا ہو تو صرف قرآن حکیم ہی اُس کے سامنے "حق" "مصدق" اور "مہیمن" بن کر اس کے نیک مقصد کے لئے مشعل راہ اور اُس کی پاک خواہش کے لئے رہبر و راہنما ہونے کا حق رکھتا ہے اور اسی کی راہنمائی اس کو صراط مستقیم تک پہنچا سکتی ہے۔

قرآن کے "حق" "مصدق" اور "مہیمن" ہونے کی سب سے روشن اور نمایاں دلیل اُس کی وہ دعوتِ حق اور اس کا وہ پیغامِ صداقت ہے جس کو اُس نے تمام اہلِ کتاب کے سامنے اس اعجاز کے ساتھ پیش کیا ہے،

قُلْ یَآ اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی	اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہئے، اے اہلِ کتاب! آؤ
کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	ایک بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ
اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا	ہم بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور کسی کو اس کا شریک
یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ	نہ ٹھیرائیں اور نہ کوئی کسی کو اپنا رب بنائے اللہ کے
دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا	ماسوا پھر اگر وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو کہدیجئے
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران)	گواہ رہو ہم تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔

کیا اس سے بھی زیادہ وسعتِ نظر، فطرتِ حق، تعلیم صداقت، احترامِ مذاہب، وحدتِ کلمہ اور وحدتِ نظام کی دعوت کہیں مل سکتی ہے۔ اور کوئی پیغامِ حق اس سے زیادہ عظمت و حقانیت کا ثبوت فراہم کرسکتا ہے؟ انصاف تو یہ ہے کہ ان تمام مسائل کو اگر یکجا دیکھنا ہو تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ ایسی کتاب بلاشبہ قرآن ہے۔

کون نہیں جانتا کہ سابقہ کتبِ سماوی میں حضرتِ آدم کی تخلیق اور ہبوطِ ارضی سے متعلق کتنے دور از کار قصے اور کتنی داستانیں ہیں جو رنگ آمیزی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن یہ قرآن ہی ہے جس نے رطب ویابس کو جدا کرکے اصل خدوخال کو رونما کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی سفینہ سازی اور طوفانِ نوح سے متعلق عجیب وغریب حکایات عقلِ سلیم کو جب ہمنوا نہ بنا سکیں تب قرآن ہی کی روشنی نے پردہ ہائے ظلمت کو چاک کرکے حق وصداقت کے سپیدۂ سحری کو چار چاند لگادے۔ حضرت لوط (علیہ السلام) پر اپنی بیٹیوں کے ساتھ مباشرت کی افتراپردازی آج تک بائبل کی کذب بیانی کا مرقع پیش کرتی ہے[1]۔ یہ قرآن ہی کی مقدس تعلیم تھی جس نے آگے بڑھ کر اس کذب وافترا کی بابانگِ دہل تردید کرتے ہوئے لوط (علیہ السلام) کے دامنِ پاک کو بے لوث ثابت کردکھایا۔

کذّبت قوم لوط المرسلین۔ اذ	جھٹلایا لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جبکہ ان کے
قال لہم اخوہم لوطٌ الا تتقون	بھائی لوط نے اُن سے کہا بیشک میں تمہاری جانب
انی لکم رسول امین فاتقوا اللہ واطیعون	خدا کا پیغامبر ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو
وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری	اور میری پیروی کرو اور میں تم سے اجرت نہیں
الا علی رب العلمین۔ (الشعراء)	مانگتا میرا اجر اللہ رب العالمین کے پاس ہے۔

اس نے خدا کا پیغمبر کہہ کر سارا معاملہ صاف کردیا اور ایک ذی فہم کو سمجھا دیا کہ جو نبی اور پیغمبرِ خدا بنتا ہے وہ بداخلاقیوں سے کوسوں دور اور معصوم از معاصیات ہوتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) نبی بھی ہوں اور العیاذ باللہ مرتکب معصیت بھی ہوں۔

پھر اسی عہدِ قدیم (توراۃ) کا بیان ہے کہ گوسالہ سامری نے نہیں بلکہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے بنایا تھا[2]۔ مگر قرآن عزیز نے صاف اور صریح الفاظ میں تردید کی کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) جیسے مقدس نبی کا دامن اس آلودگیٔ شرک سے قطعاً بے لوث ہے اور عہدِ جدید انجیل نے گواہی دی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت باسعادت معجزانہ طور پر نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ رخصتی سے قبل

---

[1] پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۲ – ۳۸۔ [2] خروج باب ۳۲۔ آیات ۵ – ۹۔

یوسف نجار کی صلب سے مریم (علیہا السلام) کے رحم میں منتقل ہوکر بن یوسف نجار تھے تب قرآن ہی نے اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ حضرت مریم کا دامنِ عصمت ہر طرح محفوظ رہنے اور کسی مرد کی مقاربت سی ناآشنا ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت بحکم خدا معجزانہ انداز میں ہوئی ہے۔

غرض قرآنِ عزیز کی یہی وہ صفتِ عالی ہے جو "مہیمن" بن کر عقائد و اعمال دونوں شعبوں میں پیدا کردہ آلودگیوں کے زہر کو تریاق سے جدا کرتا اور ادیان و ملل کی حقیقی صداقت کو نکھار کر دنیائے انسانی کی راہنمائی کرتا ہے۔

ذکر۔ ذکری تذکرہ

قرآنِ عزیز سابقہ ادیان و مللِ حقہ کے لئے جبکہ مصدّق اور مہیمن ہے اور جبکہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے دینی و دنیوی رشد و ہدایت کا امام اور کفیل ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ گذشتہ ملتوں اور ان میں بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کے واقعات و حالات کا ذکر کرے اور بتلائے کہ قبول کرنے والوں نے خدا کی جانب سے کیا صلہ پایا اور منکرین و جاحدین نے اپنے انکارِ حق و صداقت کی پاداش کس طرح پائی تاکہ موعظت و نصیحت کا باب کامل و مکمل ہو سکے اور آنے والی قومیں اپنے انجام نیک و بد کو اچھی طرح پہچان سکیں اور اس طرح خدا کی حجت تمام کائنات پر پوری ہو جائے۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ بیشک یہ صحیح ہے اور اسی لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ میری صفاتِ عالیہ میں سے ایک نمایاں صفت "ذکر" بھی ہے۔ اسی لئے خدا رسی اور کائناتِ انسانی کی ہدایت و سعادت کے لئے میں نے گذشتہ اقوام و ملل کی اس تاریخ کو دہرایا جو نیک و بد اور خیر و شر اور اُن کے انجام و نتائج سے گہرا تعلق رکھتی اور صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کرتی ہے۔

میرا وجود اس لئے سرتاسر ذکر ہے کہ میں دین، شریعت اور احکامِ الٰہی اور اُن سے متعلق وعد و وعید کا بیان کرتا ہوں اور اس لئے ذکر ہے کہ انبیاء و رسل کے قصص و اخبار اور امم و اقوام کے قبولِ ہدایت و ضلالت اور اُن کے عواقب و ثمرات کو واضح اور نمایاں رکھتا ہوں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ موعظت ونصیحت کے لئے دلائل وبراہین ہیں سب سے بڑی دلیل اور سب سے بلند برہان گذشتہ واقعات وشہادات ہوتے ہیں اور قلب صادق اور ضمیرِ حق کے لئے سرمایۂ عبرت ونصیحت بنتے ہیں تو پھر انصاف کرو اور بتلاؤ کہ مجھ سے بڑھ کر اس میدان کا مرد کون ہے اور کون سا صحیفہ اور کون سی کتاب ہے جو اس جلالت وفخامت کے ساتھ ان حقائق کو روشنی میں لاکر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فرض انجام دیتی ہو اور نورِ ہدایت سے فیض یاب کرنے اور ظلمتِ ضلالت سے نجات دینے کا باعث بنی ہو۔

میں ذکر ہوں اس لئے نہیں کہ ایک تاریخی کتاب ہوں جو صرف قصص وحکایات کو اپنے حقیقی خدوخال میں پیش کرکے نتائج وعواقب کو اربابِ مطالعہ پر چھوڑ دیتی ہے میں صرف فلسفہ بھی نہیں ہوں کہ تاریخی واقعات کے اسباب وعلل پر بحث کرکے نظری اور علمی کاوشوں کا مخزن ہو کر رہ جاؤں، میں کوئی قصہ کہانی نہیں ہوں کہ "اساطیر اولین" کو بیان کرکے گرمیِ محفل کا باعث بن کر داد حاصل کروں بلکہ میری تعلیم اور میرا پیغام کائناتِ ہست و بود کی سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لئے آبِ حیات ہے، دعوتِ حق کے لئے برق کی چمک اور رعد کی کڑک ہے یا صوتِ ہادی ہے، دنیوی کامگاریوں اور کامرانیوں کے لئے نسخۂ کیمیا ہے اور دینی مسرتوں اور شادکامیوں کے لئے معجزۂ حق وصداقت ہے۔

پس میں تاریخی واقعات اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اُس کے صرف اُن پہلوؤں کو روشنی میں لاؤں جو عبرت وموعظت اور رشد وہدایت کے لئے مفید وموثر ہوں، میرے ذکر وتذکار میں فلسفۂ تاریخ بھی اس لئے ہوتا ہے کہ وہ عواقب وثمرات اور علل واسباب کو بیان کرکے صراطِ مستقیم کی جانب راہنمائی کرے۔ محض قصص وحکایات بیان کرنا نہ میرا منصب ہے نہ میرا مقصد ومنشاء۔ اس لئے میں داستان سرائی نہیں کرتا بلکہ ماضی سے مستقبل اور گذشتہ سے پیوستہ کے لئے سامانِ سعادت اور اسبابِ فلاح ونجاح مہیا کرتا ہوں پس میں "ذکر" بھی ہوں اور "ذکریٰ" بھی "تذکرہ" بھی اور "ذی الذکر" بھی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (ص)	"یہ (قرآن) نہیں ہے مگر جہانوں کے لئے ایک ذکر (نصیحت)"
وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف)	"اور بلا شبہ یہ (قرآن) تیرے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) لئے اور تیری قوم کے لئے ذکر (نصیحت) ہے۔"
صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ	"صٓ اور قسم ہے قرآن، صاحبِ ذکر کی۔"
وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْبَشَرِ (مدثر)	"اور نہیں ہے یہ (قرآن) مگر نصیحت انسان کے لئے"
كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ (عبس)	"آگاہ ہو، یہ (قرآن) تذکرہ ہے پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔"
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِیْنَ۔ (مدثر)	پس اُن کو (مشرکین و منکرین کو) کیا ہوا کہ وہ تذکرہ (نصیحت) سے اعراض کرتے ہیں۔

موعظت قرآن، جب حق و صداقت کا داعی، رشد و ارشاد کا مناد، ہدایت و سعادت کا ہادی، امتیازِ حق و باطل کا امام ہے اور ادائے فرض کی خاطر ذکر و ذکریٰ اور تذکرہ ہے تب اس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہو جاتا ہے کہ کائناتِ عقل و بصیرت کی موعظت و نصیحت کے لئے ذاکر و واعظ بھی ہو کیونکہ اگر اس کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ وہ امم و اقوام اور ملل و ادیان کی تاریخ کو دہرا دیتا اور ست ہو جاتا وہ رشد و ہدایت کا سامان جمع کر دیتا اور فارغ ہو جاتا، وہ حق و باطل کا امتیاز ظاہر کر دیتا اور خاموش ہو جاتا تو پھر قرآن اپنے فرض کا تارک ٹھہرتا وہ تو کہہ چکا ہے کہ حق و صداقت کے یہ تمام سامان اس نے اس لئے مہیا کئے ہیں کہ انسان کو "انسان" بنائے اور "حیاتِ سرمدی اور نجاتِ ابدی" تک پہنچائے تب اس کے لئے یہ گنجائش ہی کب ہے کہ وہ سامان تو مہیا کر دے، اسباب و وسائل اور علل و ذرائع کو تو شمع شبستان بنا دے لیکن اصل مقصد اور حقیقی مطمح نظر کو نظر انداز کر کے غفلت و حق پوشی کی راہ اختیار کرے اس لئے وہ اعلان کرتا ہے کہ میں "موعظت" ہوں یعنی مقامِ وعظ و تذکیر میں میرا مقام اس قدر بلند ہے کہ میرے لئے یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ میں "واعظ" یا "ذاکر" ہوں بلکہ میری اس حقیقی صفت یا میرے اس فرضِ منصبی کا حق پورا پورا جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ کہا جائے

قرآن "ذاکر" ہی نہیں سرتاسر "ذکر" ہے "واعظ" ہی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ "موعظۃ" ہے۔

غور کیجئے کہ عدل و انصاف کسی ایک کی میراث نہیں ہے اس لئے اس عالم رنگ و بو میں خدا معلوم کس قدر "عادل و منصف" گذرے ہیں، موجود ہیں اور آئندہ رہیں گے لیکن جب اِن عادلانِ حق گوش و حق نیوش میں سے عدل و انصاف کا کوئی ہیرو اس صفت میں چار چاند لگا دیتا ہے تو آپ ہیرو در شب (مشاہیر پرستی) کے ذوق و ولولہ میں اس کو فقط عادل نہیں کہتے بلکہ اس کو سرتاسر "عدل" بنا دیتے ہو پس اگر کلام کی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار اس کا متقاضی ہے کہ عدل ہو یا ظلم یا کوئی بھی صفت ہو وہ جب کسی ہستی میں درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے وصف کی تعبیر اسمِ فاعل اور مبالغہ کے صیغوں سے گذر کر عینِ صفت ہی کے ذریعہ بہتر سمجھی جاتی ہے تو تاریخِ ادیان و ملل اور صحفِ سماویہ اور کتبِ الٰہیہ کی تاریخ میں میری روشن رشد و ہدایت اور جلیل و رفیع نصیحت کا ذکر کیوں نہ اس طرح کیا جائے کہ میں صرف واعظ ہی نہیں ہوں بلکہ ادائے فرض میں بھی سب سے آگے، سب سے بلند اور سب سے وقیع ہوں اور اس لئے "موعظۃ" ہوں یعنی میرا سراپا ہی سرتاسر نصیحت و موعظت ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (یونس)	اے لوگو بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے نصیحت آپہنچی۔
فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ۔ (بقرہ)	پس جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آگیا تو اُس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا۔

اس آیت میں ربوا کی حرمت کا ذکر ہے اور قرآن کی آیات موعظت نے اس کو حرام قرار دیتے ہوئے تسکین بھی کر دی کہ جو اس حکم سے قبل یہ معاملہ کر چکے تو گذشتہ پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

ولقد انزلنا الیکم ایات مبینات ومثلاً من الذین خلوا من قبلکم وموعظۃ للمتقین۔ (نور)	اور ہم نے تم پر صاف اور واضح آیات اتاریں اور ان کا حال جو تم سے پہلے گذر چکے اور "نصیحت" ڈرنے والوں کے لئے۔

وجاءك فی هذه الحق وموعظة	اور آئی تیرے پاس اس میں (قرآن کی سورۃ میں)
وذکری للمؤمنین ۔	تحقیقی بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان
(ہود)	والوں کے لئے ۔
هٰذا بیانٌ للنّاس وهدًی و	یہ (قرآن) بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت
موعظة للمتقین (آل عمران)	اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لئے

قرآن عزیز نے دعوتِ حق کے لئے جن اساسی اصولوں کا اعلان اور پیغامِ الٰہی کو جن محکم بنیادوں پر قائم کیا ہے اس میں حکمۃ کو مقدم رکھا ہے اور موعظۃ کو دوسرا درجہ عطا کیا ہے اور آخری منزل مجادلہ اور مذاکرہ کی رکھی ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے پروردگار کی راہ کی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم	جانب دعوت دو حکمت و دانائی کے ساتھ اور اچھی نصیحت
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔	کے ذریعہ اور اُن (منکرین) سے مذاکرہ کرو بہتر اسلوب کے ساتھ ۔

تو اس آیت میں "موعظۃ" کی حقیقت کیا ہے اور اس کو ثانوی درجہ کیوں حاصل ہے اور قرآن کی صفت "موعظۃ" اور آیت مسطورہ بالا میں مذکورہ موعظۃ کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کی تحقیق سے قبل اس تمہید پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ دعوت و پیغام کے یہ سہ گانہ اصول دراصل فطری اور طبعی تقاضا کے پیشِ نظر بیان ہوئے ہیں، کون نہیں جانتا کہ جب کوئی شخص کسی مخاطب سے گفتگو کرتا ہے اور اس کو کسی اہم مقصد کی خاطر افہام و تفہیم کی مہم پیش آتی ہے تو وہ مخاطب کے ذہنی نشوونما اور فکری صلاحیت و استعداد کو صرف تین درجات کے اندر محدود پاتا ہے۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ مخاطب کا ذہنِ ثاقب اور فکرِ رسا بلند و رفیع ہو اور وہ افکارِ ذہنی کو اوہام و وساوس سے یقین و اذعان کو ریب و ظنون سے صحیح و محکم کو فاسد و کاسد سے امتیاز کرنے میں وجدانِ صحیح اور عقلِ سلیم کا حامل ہو تو اس شخص کے سامنے جب خاص عقائد و افکار اور اعمال و افعال کو پیش، اور اُن کی صداقت و حقانیت کو واضح کیا جائے تو از بس ضروری ہے کہ دلائل و براہین اور شواہد

نظائر" حکمت سے مملو" اور دانائی سے لبریز ہوں تاکہ وہ حقیقت اور سراب کے درمیان بآسانی امتیاز کرسکے اور حق و باطل کو حکمت کی ترازو اور دانائی کے پیمانہ سے ناپ تول سکے اس لئے کہ افہام و تفہیم اور تکلم و تخاطب میں" حکمت" سے بڑھ کر نہ کوئی شمع ہدایت ہے اور نہ کوئی آفتاب برہان و دلیل۔

اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اُس کی فکری اور ذہنی نشو و ارتقا نے توسط سے آگے قدم نہ بڑھایا ہو اور وہ حق و باطل کی گوناگوں دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا تحمل نہ رکھتا ہو وہ آفتاب کا مشاہدہ تو کرسکتا ہے لیکن اس کی بنفسجی شعاعوں اور زرد و گلابی کرنوں اور ان کی اجلیلی شکل میں افادی کارفرمائیوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اس کی گرمی اور چمک کا توصحیح اندازہ کرسکتا ہے لیکن اس کے کرۂ ناری اور اس کے نظامِ شمسی کے حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے تو ایسے شخص تک ابلاغِ حق اور پیغامِ دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ" حکمت" کے ساتھ ساتھ" موعظۃ حسنہ" کی تائید بھی شامل کرلی جائے یعنی دعوت و تبلیغ کا فرض صرف" حکمت" ہی تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ گذشتہ اقوام و ادیان کے حالات و واقعات اور مشاہدات کو اچھی نصیحت کے ذریعہ بیان کرکے ماضی سے مستقبل کے لئے اور گذشتہ سے پیوستہ کے لئے سبق حاصل کرنے کی امنگ پیدا کی جائے اور اس کو خوگر بنایا جائے کہ وہ حکمت کی باتوں کو موعظتِ حسنہ کے ذریعہ حاصل کرسکے تاکہ صاحب فہم و ذکا جو اول مرحلہ پر ہی سمجھ گیا ہے یہ اس دوسرے مرحلہ پر پہنچ کر اس کا ادراک کرسکے۔

مگر ان دونوں درجات سے علاوہ ذہنی اور فکری طریق کار کے لئے ایک اور درجہ بھی ہے جو کبھی کج فہمی اور کج روی کی وجہ سے بروئے کار آتا ہے اور کبھی متوازی دلائل و براہین کے غلط دعاوی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ تیسرا درجہ ہے جہاں پہنچ کر ایک انسان کسی حقیقت و صداقت کو سمجھنے اور قبول کرنے سے قبل اپنی جانب سے اُس کے متوازی اور متضاد دلائل پیش کرکے مجادلہ اور مذاکرہ کا ارادہ کرتا اور اسی ترازو اور پیمانہ سے ہر ایک بات کو ناپتا اور تولتا اور اس کے حق و باطل ہونے میں فرق کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ ذہنی اور دماغی طریقِ فکر کے اسی مرحلہ یا درجہ کا اصطلاحی نام" مناظرہ" ہے۔

پس جبکہ قرآنِ عزیز کی تعلیم ایک فطری تعلیم ہے اور دینِ اسلام، دینِ فطرت کا دوسرا نام تو ضروری تھا کہ اس کی دعوت و تبلیغ کے اصول بھی فطرت کے مطابق اور دماغی اور ذہنی نشو و ارتقا کے فطری تقاضہ کے متوازی ہوں تاکہ اسلامی دعوت اور قرآنی پیغام صحیح معنی میں کائنات انسانی کے لئے کامل و مکمل کہلائے جانے کی سند حاصل کر سکے۔ تب اس نے کہا کہ اس پیغامِ حق کا طریق کار بھی ان ہی فطری صلاحیتوں کے ساتھ وابستہ ہے اور جو دماغ جس طریقِ فکر کا عادی ہے بہتر ہے کہ اس طریقِ فکر کے ساتھ اس کی راہنمائی کی جائے اور چونکہ تیسرے درجہ میں کج بحثی اور زیغ کے امکانات موجود تھے جو انسان کو اخلاق سے بداخلاقی اور بلندی سے پستی کی جانب گرا دیتے ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ مجادلہ و مذاکرہ کو "بالتی ہی احسن" کی پاک اور بے لوث شرط کے ساتھ مشروط کر دیا جائے یا یوں کہہ دیجئے کہ اس درجہ کو حُسنِ اخلاق اور مثلِ اعلیٰ کی حبلِ متین سے باندھ دیا جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز جس معنی میں "موعظۃ" ہے وہ اس مقام میں مستعمل موعظت سے عام اور بلند و بالا حقیقت پر مبنی ہے جہاں حکمت، موعظت حسنہ اور جدال بالتی ہی احسن تینوں حقیقتیں ایک ہی حقیقت میں سموئی ہوئی ہیں اور جو "موعظۃ" بن کر ان تینوں نظری درجات پر حاوی اور کارفرما ہے۔ کیونکہ قرآن حکمت بھی ہے اور موعظۃ حسنہ بھی اور فکر و نظر کے لحاظ سے مذاکرہ و مجادلہ حسنہ کا امام بھی، وہ دلائل محکم اور براہین قاطع بھی رکھتا ہے اور انبیا و رسل اور اُن کی امم و ملل کے واقعات عبرت آموز کو بھی بیان کرتا ہے اور توحید و شرک اور خیر و شر اور اصلاح و افساد اور حق و باطل اور صحیح و فاسد کے متضاد افکار پر محاکمہ کرتا اور ناطق فیصلہ بھی دیتا ہے لہٰذا وہ ایسی "موعظۃ" ہے جو بلید الفہم اور ذکی الفکر، عامی اور اہلِ علم، سادہ لوح اور فلسفی سب کے لئے ان کے درجات کے مطابق راہنمائی کرتے ہوئے صراطِ مستقیم تک پہنچاتا اور انسان کو "انسان" بناتا ہے۔

(باقی آئندہ)

اسبابِ کفر و جحود

دوسرا سبب۔ اعراض

از جناب میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان ماہ جولائی ۱۹۴۶ء

کفر و جحود کا پہلا سبب یعنی تقلیدِ آبا و اکابر وغیرہ جیسا کہ بیان ہو چکا اپنے اثر و عمل میں ہمہ گیر ہے دوسرے سبب یعنی اعراض کی کارفرمائیاں اس سے بھی وسیع تر ہیں۔ نوعِ انسانی کا جتنا نقصان اندھا دھند تقلید سے ہوا ہے۔ اس سے زیادہ تباہ کاری اعراض کی وجہ سے ہوئی ہے۔ تقلید و اعراض کی ضرر رسانیوں سے نہ کافر بچے ہیں اور نہ مومن۔ نہ عالم بچے ہیں اور نہ جاہل۔

اعراض کے لغوی معنی ہیں۔ ایک طرف پھر جانا۔ مثلاً دو آدمی روبرو کھڑے باتیں کر رہے ہوں اور اس اثناء میں ایک آدمی ایک طرف پھر جائے اور اس کا ایک پہلو دوسرے آدمی کے سامنے آجائے۔ عام محاورے میں اس لفظ کے معنی ہیں۔ منہ پھیر لینا، منہ موڑ لینا، بے رخی کرنا، توجہ نہ کرنا، غور نہ کرنا، سوچ بچار نہ کرنا، ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا، غفلت شعاری وغیرہ وغیرہ

مجرمیت کے لحاظ سے اعراض گو اتنا بڑا جرم نظر نہیں آتا لیکن اس کے نتائج کفر و جحود کے باقی دونوں اسباب کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں۔ ہم ہر روز بلکہ ہر وقت ہزاروں ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جن پر غور کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن ہم اُن پر قطعاً غور نہیں کرتے۔ گویا ہمارا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہوتا ہے۔ ہم روزانہ سیکڑوں ایسی باتیں سنتے اور پڑھتے ہیں جن پر تدبر کرنا ہمارے لئے اشد ضروری ہے لیکن ہم ان پر توجہ نہیں کرتے، اُن سے بے رُخی کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا سننا اور نہ سننا، پڑھنا اور نہ پڑھنا

بالکل برابر ہوتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔

ان کے دل (یعنی دماغ) ہیں لیکن اُن سے نہیں سوچتے۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن اُن سے نہیں دیکھتے اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے نہیں سنتے یہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ غافل لوگ ہیں۔

کون شخص ہے جس کی آنکھیں ہوں اور دیکھتا نہ ہو۔ اور وہ کون آدمی ہے جس کے کان ہوں اور سنتا نہ ہو۔ بظاہر تو ایسا کوئی آدمی نہیں۔ لیکن حقیقت میں ہم سب چارپایوں کی مانند ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی بدتر۔ الا ماشاء اللہ۔ کیونکہ ہم سب آنکھوں والے ہیں لیکن دیکھتے نہیں۔ ہم سب کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں۔ ہم سب کے دماغ ہیں لیکن سوچتے نہیں۔

قرآن مجید کی یہ آیت ان لوگوں کے لئے ہے جو جہنم کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ لیکن انصاف سے کہئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ دیکھیں، اس پر غور کریں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں اور غور نہیں کرتے، گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ سننے کا حق تو یہ ہے کہ ہم کچھ سنیں اس پر تدبر کریں۔ لیکن ہم سنتے ہیں اور تدبر نہیں کرتے۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ ایسے ہی آنکھوں والے اندھے اور کانوں والے بہرے ہیں جنہیں قرآن نے "کَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ" کا خطاب دیا ہے اور یہی لوگ ہیں جنھیں غافل کہا گیا ہے اور یہی لوگ ہیں اعراض کرنے والے۔

صحیح معنوں میں دیکھنا کہا ہے اور صحیح معنوں میں سنا گیا ہے۔ قرآن مجید نے ایک مقام پر اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ

پس خوشخبری دو میرے ان بندوں کو جو سنتے ہیں بات کو اور پیروی کرتے ہیں اُس کے بہتر (جزو) کی۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی لوگ ہیں خالص عقل والے

یہاں قرآن مجید خوش خبری دے رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو بات سن کر اس پر غور کرتے ہیں اور اس کے حسن و قبح اور نیک و بد پر سوچ بچار کرتے ہیں۔ اور پھر اس کے نیک کو قبول کرتے ہیں اور اس کے بد کو رد کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو عقل مند کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں سنتے ہیں۔ باقی لوگ سنتے ہیں لیکن نہیں سنتے۔ اسی طرح دیکھتے بھی وہی دیکھنے والے ہیں، جو دیکھ کر غور کرتے ہیں۔ باقی دیکھنے والے دیکھتے ہیں لیکن نہیں دیکھتے۔

خدا کے ایسے بندے جنھیں قرآن مجید نے یہاں خوشخبری دی ہے۔ بہت کم ہوتے ہیں لاکھوں کروڑوں میں ایک اور وہ بھی کئی کئی صدیوں کے بعد۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

فی الواقعہ یہی دیدہ ور لوگ ہیں جنھیں ان آیات میں خوشخبری دی گئی ہے۔ ہم سب دیکھتے ہیں۔ سنتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ لیکن ہمارا دیکھنا دیکھنا نہیں اور نہ سننا سننا ہے اور نہ سوچنا سوچنا۔ اگر ہم سب دیکھتے سنتے اور سوچتے تو یقین جانئے کہ آج اولادِ آدم کے پاس علم و ہنر کے جتنے خزانے جمع ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے اس سے صدہا چند بڑے خزانے جمع ہو چکے تھے اور اب تک دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی ہوتی۔ تخلیقِ آدم کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے آدمی کو تمام اسما کی تعلیم دیدی۔ یا بالفاظِ دیگر آدمی کی فطرت میں تمام علوم کے انتہائی مدارج کے حاصل کرنے کی استعداد ودیعت کر دی۔ اور پھر اس کے اندر اور اس کے باہر چاروں طرف زمین پر اور آسمانوں میں بے حد و عدد آیات پھیلا دیں۔ تاکہ وہ انھیں دیکھے اور ان کے حقایق پر غور کرے اور اپنے علم و فن کے خزانوں کو معمور کرے۔ لیکن آدمی ان آیات کو دیکھتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ درختوں کا پتا پتا حقایق و معارف کی ایک ضخیم کتاب ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ علوم و فنون کا ایک معمور خزانہ ہے۔ لیکن آدمی ہے کہ نہ ان کتابوں کے کھولنے کی تکلیف اٹھاتا ہے اور نہ ان خزانوں کی کنجی کو ہی کبھی ہاتھ لگاتا ہے۔ دیکھتا ہے اور ایک طرف مڑ جاتا ہے۔ صرف معدودے چند ایسے ہوشمند اور دیدہ ور آدمی

ہوتے ہیں۔ جوان آیاتِ الٰہی کے مطالعہ میں عمر بھر مصروف رہتے ہیں۔ دنیا علم وفن کے جن مدارج تک بھی اب تک پہنچ سکی وہ ان ہی بزرگوں کے دم قدم کی برکت ہے۔ اور فی الحقیقت یہی معدودے چند آدمی ہوتے ہیں جو خدا کو صحیح معنوں میں پہچان سکتے ہیں۔ ع کہ بے علم نتواں خدارا شناخت۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار　(سعدی)

سعدیؒ کے اس شعر کو نری شاعری نہ سمجھئے۔ اولادِ آدم کی اعراض پسندی اور غفلت شعاری کے باوجود علمائے علمِ نباتات اپنے فن میں جس قدر تحقیقات کر چکے ہیں صرف اسی کی بنا پر درخت کے ایک ایک پتے پر دستِ قدرت نے جتنی محیر العقول کارفرمائیاں کی ہیں اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اگر آدمی آج بھی اعراض اور غفلت کو چھوڑ دے تو نوعِ انسانی کے علوم کی ترقی کی رفتار موجودہ رفتار سے ہزار در ہزار چند زیادہ ہو جائے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

آیاتِ الٰہی کی طرف سے یہی بے رخی، یہی روگردانی، یہی غفلت یعنی یہی اعراض، خدا کے بیشمار بندوں کو خدا کی پہچان سے محروم رکھتا ہے اور کفر وجحود کی لعنت کی گہرائیوں میں گرا دیتا ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کو جو سن کر یا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں اور پیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ بہرے اندھے بلکہ مردے کہا ہے

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ	یقیناً تو نہیں سناتا مردوں کو اور نہیں سناتا
الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ	بہروں کو پکار بحالیکہ وہ پیٹھ پھیر کر پھر جاتے ہیں
وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ	اور تو راہ نہیں دکھاتا اندھوں کو ان کی گمراہی
ضَلٰلَتِهِمْ۔ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ	سے۔ تو صرف اس شخص کو سناتا ہے جو ایمان لاتا
یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔	ہے ہماری نشانیوں پر ایسے لوگ ہی مسلم ہیں۔

غور کیجئے قرآن ان لوگوں کو مسلمان نہیں کہتا جو آیاتِ الٰہی کو دیکھ کر یا سن کر منہ پھیر لیتے ہیں اور ان پر تدبر نہیں کرتے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو اندھے بہرے اور مردے کہا گیا ہے۔ آیاتِ الٰہی پر ایمان لانا

یہی ہے کہ اُن پر غور کیا جائے۔ ان کے حقایق کی معرفت حاصل کی جائے اور اس طرح ان آیات کے خالق و مالک کو پہچانا جائے۔

ہم میں سے کتنے ہیں۔ جو روزانہ ہزارہا آیاتِ الٰہی کو دیکھتے اور سنتے ہیں اور ان سے بے رخی نہیں کرتے۔ ان سے منہ پھیر کر اور پیٹھ پھیر کر چلے نہیں جاتے۔ اور ہم میں سے کتنے ہیں جو مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی کی رو سے مومن یا مسلم کہلانے کے مستحق ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم سب اِلاّ ما شاء اللہ معرضین میں سے ہیں۔ دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ ہزارہا آیاتِ الٰہی میں سے کبھی ایک آیت پر بھی پوری طرح غور نہیں کیا۔ نہ آیاتِ آسمانی پر، نہ آیاتِ زمینی پر اور نہ آیاتِ نفسی پر۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کو جو آیاتِ الٰہی پر غور نہیں کرتے اور انھیں سرسری طور سے دیکھ کر سن کر یا پڑھ کر اِدھر اُدھر مشغول ہو جاتے ہیں۔ ظالم کہا ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر چاروں طرف اللہ تعالیٰ کی نہایت روشن اور بیّن نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔ پھر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ ہم اُن کی طرف سے بے رخی کریں اور منہ پھیر کر چلے جائیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ	اور کون ہے زیادہ ظالم اُس شخص سے جسے اپنے
رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۔ اِنَّا مِنَ	رب کی نشانیوں سے نصیحت دی گئی اور اس نے
الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝	اُن سے منہ پھیر لیا۔ یقیناً ہم مجرموں سے بدلہ لیں گے

اس آیت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) آیاتِ الٰہی پر تدبر نہ کرنے والوں کو ظالم بلکہ سب سے بڑا ظالم کہا گیا ہے۔ کافروں اور مشرکوں کو بھی قرآن مجید نے ظالم کہا ہے۔

(۲) آیاتِ الٰہی بلا واسطہ نصیحت اور تعلیم ہیں۔ یعنی بغیر کسی ناصح اور معلّم کے خدا کی یہ نشانیاں خدا کی طرف رہبری کرتی ہیں۔

(۳) اعراض ایک جرم ہے۔ جس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔

یہ تو خداوند کریم کا مزید فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے رسول اور

ناصح اور مبلغ بھیجے۔ فرض کرو کہ دنیا میں کوئی پیغمبر یا ناصح نہ آتا، یا فرض کرو کہ دنیا کی کسی قوم یا ملک تک کسی پیغمبر کی تعلیم نہ پہنچتی۔ یا فرض کرو کہ کسی ایک فردِ بشر تک کوئی ایسی تعلیم نہ پہنچتی۔ تو پھر اس صورت میں اس قوم یا فرد کی خدا پر ایمان لانے کی ذمہ داری کہاں تک ہوتی۔ قرآن مجید کے صدہا دیگر مقامات سے اور آیتِ بالا سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ ایسی صورت میں بھی ایک صاحبِ عقل آدمی خدا پر ایمان لانے کا اتنا ہی ذمہ دار اور مکلف ہے جتنا بصورتِ دیگر۔

اللہ تعالیٰ نے آدمی کو عقل دی ہے اور علم دیا ہے اور اس کے ساتھ اپنی قدرت کے بے شمار کرشمے یعنی بے تعداد آیاتِ بینات اس کے ساتھ رکھ دی ہیں۔ اب اگر آدمی اعراض نہ کرے اور ان خدائی نشانیوں پر یا اُن میں سے چند ایک پر ہی غور کرے تو یقین ہے کہ اُس کی عقلِ سلیم اس کو خدا تک پہنچا دے گی۔ تدبر کرنے والا آدمی کبھی خدا سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ کفر و جحود کی لعنت انہی لوگوں کے نصیب میں ہے جو خدا کی اُن نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور مُنہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ آیتِ الٰہی ہے لیکن آدمی دیدہ و دانستہ اندھا بن جائے اور بہرا بن جائے تو اس کا کیا علاج۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ	اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جسے اپنے
رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا	رب کی نشانیوں سے نصیحت دی گئی اور اس نے
قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى	ان سے مُنہ پھیر لیا۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے
قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ	آگے بھیجا اسے بھول گیا تحقیق ہم نے ان کے دلوں پر
وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۔ وَاِنْ	پردہ ڈالا ہے اس لئے وہ اسے نہیں سمجھتے۔ اور
تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا	ان کے کانوں میں بوجھ ہے اگر تو انھیں ہدایت کی طرف
اِذًا اَبَدًا ۔	بلائے تو وہ ہرگز ہدایت نہ پائیں گے کبھی بھی۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) یہاں بھی آیاتِ الٰہی سے اعراض کرنے والوں کو سب سے بڑا ظالم کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ آیاتِ الٰہی پر غور نہ کرنا آدمی کو بدترین قسم کا کافر اور منکر بنا دیتا ہے۔

(۲) آیاتِ الٰہی سے بے رخی کرنے والے لوگ اپنے اعمال کے نیک وبد اور اُن کے انجام پر غور نہیں کرتے۔ گویا کہ یہ لوگ اپنے کئے کو بھول جاتے ہیں۔ فی الواقعہ جو آدمی آیاتِ الٰہی کی طرف سے بے توجہی کرنے کا عادی ہے وہ اپنے اعمال پر کب غور کرے گا۔ بڑی چیزوں سے غفلت کرنے والا آدمی چھوٹی چیزوں کو تو بھول ہی جائے گا۔ پس اپنے کردار کا جائزہ نہ لینا اعراض کی عادتِ بد کا نتیجہ ہے۔

(۳) اعراض کرنے والوں کے دلوں پر خدا پردہ ڈال دیتا ہے اس لئے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے اور اُن کے کان بھاری ہوتے ہیں اس لئے وہ کچھ نہیں سُن سکتے۔

اگرچہ کہا گیا ہے کہ اعراض کرنے والوں کے دلوں پر خدا پردہ ڈال دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معرضین کے دلوں پر خود اُن کا اعراض یہ پردہ ڈالتا ہے۔ قانونِ فطرت خدا کا قانون ہے اور اس اٹل قانون کی رو سے کوئی ایسا فعل نہیں جس پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو، اعراض کا نتیجہ ہے۔ قوائے عقلی کا تعطل پس جو شخص اعراض کا عادی ہو گا۔ اس کی سوچنے کی طاقت رفتہ رفتہ بیکار ہو جائے گی۔ یعنی اس کی عقل پر پردہ پڑ جائے گا اور وہ غور وفکر کرنے کے قابل ہی نہ رہے گا۔ چونکہ فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے قانون کے مطابق تمام اعمال وافعال پر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں پردہ ڈالنے کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا ہم کہیں کہ فلاں شخص نے سنکھیا کھایا اور اللہ تعالیٰ نے اُسے ہلاک کر دیا۔ قرآنِ کریم میں اَور بہت سے مقامات پر کافروں کے دلوں پر آنکھوں پر اور کانوں پر پردہ ڈالنے کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہر ایسے مقام پر حقیقتِ حال یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ چونکہ اس موضوع پر ایک علیحدہ مضمون زیرِ نظر ہے۔ اس لئے یہاں صرف اجمالی بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۴) آیاتِ الٰہی پر غور نہ کرنے والوں کے متعلق اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ہر چند پیغمبر اُن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کرے۔ یہ لوگ ہرگز ہرگز سیدھی راہ پر نہ آئیں گے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا اصلی سرچشمہ خود انسان کے اندر ہے۔ آدمی اپنے علم اور عقل سے کام لے گا تو ضرور خدا پر ایمان لے آئے گا۔ اگر اس کی اعراض کی عادت اِس اندرونی چشمۂ ہدایت کو بند

کردے گی۔ تو پھر کوئی بیرونی تعلیم اور تبلیغ اسے مومن نہیں بنا سکتی۔

پیغمبر اور ریفارمر تو قوائے فکری کو تیز کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اگر آدمی ان قویٰ کو قطعاً بے کار کر کے رکھدے تو پھر رسول کی تعلیم اسے کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ راہنما کتنا ہی کامل ہو اگر مسافر قدم اٹھانے سے ہی انکار کردے تو وہ منزلِ مقصود پر کیسے پہنچ سکے گا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ	اور مت ہو ان لوگوں کی مانند جو کہتے ہیں کہ ہم نے
لَا يَسْمَعُونَ۔ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ	سنا اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ نہیں سنتے۔ تحقیق
عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا	اللہ کے نزدیک بدترین جانور ہیں وہ لوگ جو
يَعْقِلُونَ۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ	بہرے اور گونگے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے
خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ۔ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ	اگر اللہ ان لوگوں میں کچھ بھلائی دیکھتا تو البتہ
لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ۔	انھیں سناتا اور اگر سناوے ان کو تو وہ پھر جاویں اور منہ پھیر لیں۔

معرضین کے متعلق اِن آیات میں بھی چند در چند باتیں غور کے قابل ہیں۔

(۱) بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہیں سنتے۔ یہی لوگ معرضین ہیں۔ وہ سنتے ہیں لیکن جو کچھ سنتے ہیں اس پر غور نہیں کرتے۔ دیکھتے ہیں لیکن جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر تدبر نہیں کرتے۔ ان کا سننا نہ سننے کے برابر اور ان کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہوتا ہے۔

(۲) اعراض کرنے والے لوگ جن کا سننا نہ سننے کے برابر ہوتا ہے اور جن کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہوتا ہے۔ انھیں یہاں بدترین چوپایہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے (لا یعقلون) اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم کچھ سنیں اور اس پر غور نہ کریں یا کچھ دیکھیں اور اس پر سوچ بچار نہ کریں تو وہ سننا اور دیکھنا حیوانات کے سننے اور دیکھنے سے بھی بدتر ہے۔

(۳) اِنَّ شَرَّ الدواب کے متعلق یہاں کہا گیا ہے کہ " اگر اللہ ان لوگوں میں کچھ بھلائی دیکھتا۔ تو البتہ انھیں سناتا " اس مقام پر موضح القرآن میں یہ نوٹ لکھا ہے:۔

" یعنی اللہ نے اُن کے دل میں ہدایت کی لیاقت نہیں رکھی جن میں لیاقت رکھی ہے

انھیں کو ہدایت دیتا ہے اور بغیر لیاقت جو سنتے ہیں تو انکار کرتے ہیں"

چھوٹا منہ اور بڑی بات والی بات ہے اور کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے لیکن اس نوٹ کے الفاظ سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ بعض آدمیوں کی فطرت ہی میں اللہ نے ہدایت یاب ہونے کی استعداد نہیں رکھی۔ اگر یوں ہے تو یہ لوگ مکلف کیونکر ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے اُن مرفوع القلم لوگوں کے جنھیں عقل کی دولت سے محروم رکھا گیا ہے باقی سب انسانوں کے دل میں ہدایت کی لیاقت رکھی ہے اور سب کی فطرت میں راہِ راست پر چلنے کی استعداد ودیعت کی ہے۔

یہاں جو کہا ہے کہ "اگر اللہ ان لوگوں کے اندر کچھ بھلائی دیکھتا" تو اس کا مطلب یہ نہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کے اندر خیر کا مادہ رکھا ہی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ خود ان لوگوں نے اپنی اندرونی استعداد اور لیاقت کو اعراض کے زہر سے ہلاک کر دیا ہے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ساتھ ہی فرمایا کہ "اگر اب بھی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو راہِ راست دکھا دے اور انھیں اس پر چلنے کا حکم دے تو وہ سن کر منہ پھیر لیں گے اور پیٹھ پھیر کر چلے جائیں گے"۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ ان معرضین کے اندر خیر کا مادہ تو موجود تھا لیکن ان کے اعراض کی عادت یعنی عقل سے کام نہ لینے کی عادت نے اس مادے کو اتنا بیکار کر دیا گویا وہ معدوم ہو گیا۔

آیاتِ الٰہی (یعنی خدا کی نشانیاں) کئی طرح کی ہیں اور بے شمار و بے حساب ہیں لیکن اکثر آدمی بوجہ اعراض کے ان آیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آیاتِ قرآنی سے اعراض کتنے آدمی ہیں جو آیاتِ قرآنی سے اعراض نہیں کرتے۔ ہزاروں لاکھوں میں شاید کوئی ایک ہو۔ ہم میں سے وہ لوگ بھی جو روزانہ اِن آیات کو سنتے ہیں اور پڑھتے ہیں، ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ اِلّا ماشاء اللہ

حٰمٓ۔ تنزیلٌ منَ الرحمٰن الرّحیمؕ	اتاری ہوئی رحمان الرحیم کی طرف سے یہ کتاب ہے،
کتابٌ فُصِّلتْ اٰیاتہٗ قرآنًا عربیًّا	جس کی آیتیں تفصیل سے بیان ہوئیں۔ یہ قرآن ہے
لقومٍ یعلمون۔ بشیرًا ونذیرًا	عربی زبان میں اُن لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں

فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون۔ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ پس ان میں سے اکثر لوگوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ نہیں سنتے۔

وہ نہیں سنتے یعنی وہ آیاتِ قرآنی پر غور نہیں کرتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بہت لوگ قرآن کی آیات کو سنتے ہیں اور پڑھتے ہیں لیکن ان پر غور کرتے بہت کم ہیں۔ باقی لوگوں کا آیات قرآنی کو سننا نہ سننے کے برابر ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ نہیں سنتے۔ ایک کان سے بات سنی اور دوسرے کان سے نکال دی اور منہ پھیر کر چل دیئے۔ یہ سننا سننا نہیں۔ مسلمان تو اکثر قرآنی آیات کو سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں غیر مسلم بھی گاہ بگاہ ان آیتوں کو سنتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن ان سننے اور پڑھنے والوں کی ایک بڑی اکثریت معرضین کی ہے۔

قرآن صرف عربی زبان میں ہی نہیں۔ بلکہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کی صدہا تفسیریں بھی موجود ہیں۔ لیکن کتنے آدمی ہیں جو آیات قرآنی کو سمجھنے یا ان پر غور کرنے کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ خود مسلمانوں کی اکثریت بھی بس اتنا کچھ ہی کرتی ہے کہ قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھ لیا اور صرف اسی کو وسیلۂ نجات سمجھ لیا۔ لفظوں کے معنی نہیں جانتے، غور کرنا تو در کنار رہا۔ یہ آیاتِ قرآنی سے اعراض نہیں تو اور کیا ہے۔ اکثر اچھے لکھے پڑھے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔

مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو سمجھنا اور ان پر تدبّر کرنا صرف علمائے دین کا فرض ہے اور اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ علمائے دین نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگلے زمانے کے علما قرآن مجید پر کافی تدبّر کر چکے۔ اب مزید غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

از ہدایت بدست کورے چند مصحفے ماند و کہنہ گورے چند
گور با کس سخن نمی گوید سرِّ مصحف کسے نمی جوید

آیاتِ کائنات سے اعراض

قرآنی آیات تو زیادہ تر آیاتِ کائنات کی طرف توجہ دلانے والی ہیں۔ اصلی اور بنیادی آیاتِ الٰہی تو یہی آیاتِ کائنات ہیں جو ہر عالم و جاہل کے سامنے بکھری پڑی ہیں اور جن پر اپنی بساط کے مطابق ہر شخص غور کر کے دولتِ ایمانی سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

اولم یر الذین کفروا ان السّموات	کیا نہیں دیکھتے کافر کہ آسمان اور زمین ملے
والارض کانتا رتقاً ففتقنٰہما	ہوئے تھے پس جدا کیا ہم نے ان کو۔ اور کیا
وجعلنا من السّماء کلّ شیٔ حیّ	ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ۔ کیا یہ لوگ پھر
افلا یؤمنون۔ وجعلنا فی الارض	بھی ایمان نہیں لاتے اور بنائے ہم نے زمین
رواسی ان تمید بھم وجعلنا	میں پہاڑ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہل جائے ان کے
فیہا فجاجاً سبلاً لعلہم یھتدون	ساتھ اور بنائے ہم نے اس میں کشادہ رستے
وجعلنا السّماء سقفاً محفوظاً	تاکہ وہ راہ پائیں۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ
وھم عن آیاتھا معرضون۔	چھت بنایا اور (لوگ اس کی آیات سے منہ
	پھیر لیتے ہیں۔

ان آیات میں چند آیاتِ کائنات کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ لوگ ان پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی طرف سے بے رخی کرتے ہیں۔ آیاتِ کائنات پر غور کرنے کا مطلب کیا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی آیاتِ بالا میں دیا گیا ہے۔ کہا ہے کہ کیا کافر یہ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے ہم نے ان کو جدا کیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ کافر تو خیر کافر ہوئے۔ کس مومن نے یہ دیکھا ہے کہ آسمان اور زمین پہلے ملے ہوئے تھے اور پھر جدا کئے گئے۔ جب تک آدمی ایک فلسفی اور ایک سائنسداں کی آنکھ سے آفرینشِ عالم پر نظر نہیں کرتا وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ پہلے آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے اور بعد میں جدا کئے گئے پس آیاتِ الٰہی پر غور کرنے کا صرف یہ مطلب نہیں کہ ہم آسمان کو دیکھیں اور کہیں کہ واہ واہ! تیری قدرت کے کرشمے۔ کیا عجیب چیز بنائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض آدمیوں سے ہم اس سے زیادہ گہرے غور کی توقع نہیں کرسکتے۔ لیکن ہر ایک شخص سے اس کے علم اور عقل کے مطابق آیاتِ الٰہی پر زیادہ سے زیادہ غور کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے اور کوئی صاحبِ علم آدمی آیاتِ الٰہی سے اعراض کرنے کے جرم سے بری نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ ان آیات میں سے کم از کم چند ایک پر نہایت گہری اور عالمانہ نظر نہ ڈالے۔

علوم فلکیات ونباتات ومعدنیات وحیات وغیرہ کے علما کے علاوہ اور کون شخص یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اس نے آیاتِ کائنات پر کبھی غور کیا ہے۔ ان لوگوں کے سوا باقی تمام لوگ کم وبیش معرضین کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شخص سائنسداں نہیں ہو سکتا۔ نہ فلسفی بن سکتا ہے لیکن اس بات میں بھی کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ہر لکھے پڑھے آدمی کا فرض ہے کہ کم از کم وہ ان علوم کے مبادیات سے واقف ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم ان علوم کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ عام تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تو پھر چند آدمی ان فنون کی تحصیل میں کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے علما تو اس طرف رخ ہی نہیں کرتے۔ ان کے نصاب میں کہیں بھی ان چیزوں کو جگہ نہیں دی گئی۔

اور یہ جو مذہب اور سائنس کے درمیان جنگ کرائی جارہی ہے۔ اس میں نہ مذہب کا قصور ہے نہ سائنس کا۔ ان دونوں کے درمیان آپس میں کوئی دشمنی نہیں اور نہ یہ لڑنا چاہتے ہیں۔ انسان کا بنایا ہوا مذہب سائنس سے لڑ سکتا ہے لیکن خدا کا بنایا ہوا کوئی مذہب سائنس سے قطعاً نہیں لڑ سکتا۔ سائنس نام ہے علم کا۔ پھر کیا علم اور مذہب کبھی آمادۂ جنگ ہو سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علم بعض دفعہ سچ تک نہیں پہنچ سکتا لیکن اس سے بھی تو انکار ممکن نہیں کہ علم ہمیشہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور جتنی حقیقتیں آج تک واضح ہو چکی ہیں وہ اسی سرگردانی کا نتیجہ ہیں۔

آیاتِ بالا میں یہ جو کہا گیا ہے کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے۔ پس جدا کیا ہم نے ان کو۔ اس کے متعلق مختلف قول ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ آسمان اور زمین ابتدا میں شئی واحد تھے۔ ایک چیز تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جدا کیا۔ ایک جزو آسمان بن گیا اور ایک زمین۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ابتدا میں آسمان ایک شئی واحد تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُسے سات آسمانوں میں تقسیم کر دیا اور زمین ایک شئی واحد تھی اللہ تعالیٰ نے اس سے سات زمینیں بنا دیں۔

تیسرا قول ہے کہ آسمان ابتداء میں ایک بند چیز تھی بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس سے سورج، چاند، تارے وغیرہ پیدا کئے اور زمین ایک بند چیز تھی بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس سے چشمے نہریں، دریا

کانیں اور رنگا رنگ نباتات وغیرہ پیدا کئے۔

چوتھا قول ابو مسلم اصفہانی کا ہے کہ رتق سے مراد قبل ایجاد کی حالت ہے اور فتق سے مراد ایجاد یعنی آسمان اور زمین پیدا ہونے سے پہلے حالتِ عدم میں تھے۔ پھر موجود ہو گئے۔ یہ سوال کہ زمین کے موجودہ شکل میں آنے سے پہلے کیا تھا اور آسمان کے موجودہ صورت میں آنے سے پہلے کیا تھا اور کچھ تھا بھی کہ نہیں۔ سائنس اور فلسفے کا ایک مستقل اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

اس بارے میں پانچواں قول یہ ہے کہ زمین اور آسمان پہلے اندھیرے میں تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے انھیں روشن کر دیا۔

ان مختلف اقوال کے متعلق یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کہ یہ قول ایک دوسرے کے منافی یا متضاد ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک قول اپنی اپنی جگہ ایک حد تک درست ہو اور حقیقت کا مظہر آفرینشِ عالم کے متعلق کوئی فلاسوفی کی کتاب اٹھا کر دیکھیے۔ یا سائنس کی کوئی کتاب پڑھیے۔ پھر اس کے بعد قرآن مجید کی اس آیت پر غور کیجئے۔ یقین ہے کہ آپ قرآنی الفاظ کے اعجاز سے مسحور ہو جائیں گے اور بے ساختہ بول اٹھیں گے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ انصاف یہ ہے کہ آیاتِ کائنات اور آیاتِ قرآنی پر کما حقہ غور کرنے کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

پھر فرمایا کہ "کیا ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ" حیوانات اور نباتات تو بجائے خود رہے، جمادات کا وجود بھی پانی سے ہے لیکن آپ اس حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ فنونِ متعلقہ کی کسی کتاب کا مطالعہ نہ کریں۔ کائنات کی انہی دو نشانیوں کا ذکر کر کے کہا "افلا یومنون" اب یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت (نمبر ۳۰) کو صرف پڑھ لینے سے ایمان کی دولت نہیں مل سکتی۔ ایمان صرف اسی صورت میں آتا ہے کہ آپ اس آیت میں بیان کی ہوئی اِن دو آیاتِ کائنات پر پوری طرح سے تدبر کریں۔

آیات (۳۱ و ۳۲) میں پہاڑوں کے پیدا کئے جانے کی غرض، پہاڑوں میں وادیاں اور درے بننے کی وجہ اور آسمان کے سقف محفوظ ہونے کا بیان ہوا ہے اب یہ تمام چیزیں آیاتِ الٰہی صرف اسی صورت میں کہلائی جا سکتی ہیں جب وہ موجب ازدیادِ ایمان بن جائیں اور یہ حالت پیدا نہیں ہو سکتی۔

جب تک آپ کی نظر ان معاملات میں اتنی گہری نہ ہو جائے جتنی ایک سائنسدان کی ہوتی ہے۔

پے علم چوں شمع باید گداخت

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

افسوس ہے کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ آیاتِ قرآنی کے ساتھ ساتھ آیاتِ کائنات کے متعلق سائنس نے جس قدر مکاشفات کئے ہیں وہ بھی بیان کر دیئے جائیں تاکہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے البتہ اتنی گزارش ہے کہ آیاتِ قرآنی کو صرف پڑھ لینا یا آیاتِ کائنات کو صرف دیکھ لینا کافی نہیں متعلقہ علوم وفنون کی روشنی میں ان پر غور کرنا ضروری ہے ورنہ ہم ان آیات سے اعراض کرنے کے مجرم ہوں گے قرآنی آیات زیادہ تر انہیں آیاتِ کائنات کی طرف متوجہ ہونے کی تاکید کرتی ہیں۔ جابجا سورج، چاند ستاروں، ان کے طلوع وغروب۔ بادوباراں اور برق ورعد اور نباتات کے نشو ونما وغیرہ کو آیاتِ الٰہی کہا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں صرف اسی صورت میں آیات بن سکتی ہیں جب ان پر غور کیا جائے۔

آیاتِ کائنات کی طرف سے بے رخی کرنے والے کبھی ایمانِ کامل کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگ بظاہر ایمان لا کر بھی شرک کی لعنت میں پھنسے رہتے ہیں۔

وکاین من اٰیۃٍ فی السموات و	اور کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں
الارض یمرون علیھا وھم عنھا	جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور ان سے منہ پھیر
معرضون وما یؤمن اکثرھم	لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان لائے
باللہ الا وھم مشرکون (۱۲-۱۰۵، ۱۰۶)	ہوئے بھی مشرک ہوتے ہیں۔

ان آیات میں ایک عظیم الشان حقیقت بیان ہوئی ہے۔ دنیا کی قریب قریب تمام قومیں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہیں اور باوجود اس کے مشرک ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف خدا کو مانتے ہیں بلکہ خدا کو ایک بھی مانتے ہیں لیکن با ایں ہمہ وہ شرک سے پاک نہیں۔ آیاتِ بالا میں اس تعجب انگیز حقیقت کی وجہ بیان کی گئی ہے یہ وجہ اعراض ہے۔ یہ لوگ آیاتِ کائنات کو دیکھتے ہیں اور ان پر کچھ سرسری غور بھی کرتے ہیں لیکن کما حقہ غور نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایمان لا کر بھی مشرک ہی رہتے ہیں۔

آسمان اور زمین کی نشانیاں جن کا ان آیاتِ قرآنی میں ذکر ہوا ہے بے حساب اور بے شمار ہیں قرآن مجید میں بہت مقامات پر ان نشانیوں میں سے بعض جو زیادہ اہم ہیں علیحدہ علیحدہ گن کر بتائی گئی ہیں سورج، چاند، ستارے، سیارے، ٹوٹنے والے تارے۔ ان کی مختلف حرکات، ان کا فضائے آسمانی میں معلق رہنا اور نہ گرنا، دن رات اور ان کا تفاوت، موسموں کا تفاوت، بادل، بارش، برف اور اولے۔ رعد اور برق۔ ہوائیں ان کے اثرات اور حرکات۔ پہاڑ، وادیاں، درے۔ اشجار و اثمار، چشمے، نہریں دریا اور سمندر۔ زمینی، ہوائی اور بحری جانور۔ غرضکہ موالید ثلاثہ کا ایک ایک فرد اور کائنات کا ایک ایک ذرہ آیاتِ الٰہی میں شامل ہیں اور قرآن مجید نے ان سب کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کہا ہے۔ یعنی خدا تک پہنچنے کے لئے یہ چیزیں نشانِ راہ کا کام دینے والی ہیں۔

بت پرست قوموں نے کائنات کی ان نشانیوں کو دیکھا۔ ان پر سرسری غور بھی کیا اور ان کی عظمت شان کا کچھ اندازہ بھی کیا۔ لیکن ان چیزوں کی حقیقت پر علمی رنگ میں تدبر نہ کیا اور اعراض کے مرتکب ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے سورج دیوتا کی پرستش شروع کردی، کسی نے دوسرے کواکب کی پوجا کو اپنا مذہب ٹھیرالیا بادل اور رعد و برق کے دیوتاؤں کو بھی خدا مان لیا۔ ہوا کے دیوتا کو پوجنے لگے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی پرستش کی، درختوں کی پوجا کی۔ انسانوں اور حیوانوں کو اپنا معبود بنایا۔ غرضکہ یہی آیاتِ الٰہی ان لوگوں کو شرک میں مبتلا کرنے کا باعث ہوگئیں۔ وجہ صرف یہی تھی کہ انھوں نے ان آیات پر پوری طرح سے تدبر نہ کیا۔ اگر وہ غور و فکر سے کام لے کر ان چیزوں کی حقیقت پہچان لیتے تو اُن کا ایمان مکمل ہوجاتا اور شرک کی نجاست سے آلودہ نہ ہوتے۔

نیچری اور دہریے وغیرہ خدا کو نہ ماننے والی جماعتیں بھی اعراض کی وجہ سے کفر و جحود میں مبتلا ہوئیں۔ ان لوگوں نے بھی آیاتِ کائنات پر کماحقہ غور نہ کیا۔ ان کی نیم توجہی نے انھیں منکر بنا دیا جیسا کہ بت پرست قوموں کو ان کی بے رخی نے مشرک کر دیا۔ آیاتِ کائنات پر علمی رنگ میں غور کرنے والے لوگ جتنا اپنی تحقیقات کو بڑھاتے جاتے ہیں، اتنا ہی خدائے واحد پر ان کا ایمان مکمل ہوتا جاتا ہے۔ یورپ کے ایک سائنسداں کا قول ملاحظہ ہو۔

• یہ خیال کرنا ممکن ہی نہیں کہ زندگی کا آغاز اور اس کی روانی ایک قادرِ مطلق خالق کے بغیر ہی ہمارے چاروں طرف کریانہ اور حکیمانہ تخلیق و تعمیر کے محیّر العقول اور مضبوط ثبوت بکھرے پڑے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ تمام زندہ چیزیں ایک ازلی اور ابدی حاکم اور خالق کے دستِ تصرف میں ہیں۔"

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ۔ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ۔ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ

اور نشانی ہے کہ ان کے لئے زمینِ مردہ کہ زندہ کیا ہم نے اس کو اور نکالا ہم نے اس میں سے اناج۔ جسے وہ کھاتے ہیں اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجوروں کے اور انگوروں کے اور جاری کئے ہم نے اس میں چشمے تاکہ وہ اس کے میوے کھائیں۔ اور ان چیزوں کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا ہیں کیا وہ شکر نہیں کرتے، پاک ہے وہ خدا جس نے زمین سے اُگی ہوئی سب چیزوں کے جوڑے بنائے اور خود ان کے اور ان چیزوں کے جنھیں وہ نہیں جانتے اور نشانی ہے ان کیلئے رات۔ نکالتے ہیں ہم اس سے دن کو۔ پس ناگہاں وہ آنے والے ہیں اندھیروں میں اور سورج چلتا ہے اپنی قرارگاہ میں۔ یہ حکم ہے خدائے غالب و علیم کا اور چاند کے لئے مقرر کردیں ہم نے منزلیں حتیٰ کہ وہ سوکھی کھجور کی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ سورج کے لئے ممکن نہیں کہ وہ چاند کو جالے اور رات دن سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور تمام کواکب آسمان میں چلتے ہیں اور نشانی ہے ان کے لئے یہ کہ اٹھایا۔

فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ وَخَلَقْنَا لَهُمْ	ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں۔ اور پیدا
مِنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ۔ وَاِنْ نَّشَاْ	کیں ہم نے ان کے لئے کشتی کے مانند اور سواریاں
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ	اور اگر ہم چاہیں تو غرق کردیں ہم ان کو پھر کوئی ان کا
يُنْقَذُوْنَ۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا	مددگار نہ ہوگا اور نہ وہ بچ سکیں گے۔ ہاں ہماری
اِلٰى حِيْنٍ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ	رحمت سے اور کچھ مدت جی لینے کے لئے۔ اور جب
اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا	کہا جاتا ہے ان کو کہ ڈرو ان مصائب سے جو تمہارے
خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ وَمَا تَاْتِيْهِمْ	آگے ہیں اور جو پیچھے۔ تاکہ شاید تم پر رحم کیا جائے لو
مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا	جب کبھی خدا کی نشانیوں سے کوئی نشانی ان کے
عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ۔ (۳۶-۳۳ تا ۴۶)	پاس آتی ہے تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں آیاتِ کائنات میں سے بعض نشانیوں کی طرف علیحدہ علیحدہ اور گن گن کر توجہ دلائی گئی ہے اور آخری آیت میں کہا گیا ہے کہ اِن نشانیوں سے ان لوگوں کو کیا حاصل جو انھیں دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں اور ان پر مطلق توجہ ہی نہیں کرتے۔

ان آیات میں زمینِ مردہ کو ایک نشانی کہا گیا ہے۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے یا موسمی تغیرات کے باعث زمین مردہ ہو جاتی ہے اور اس میں پودے اُگانے کی طاقت بالکل باقی نہیں رہتی۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو از سرِ نو زندہ کر دیتا ہے۔ اس سے مختلف قسموں کے اناج پیدا ہوتے ہیں، ثمر دار درخت پیدا ہوتے ہیں اور زمین سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی کریمانہ اور حکیمانہ تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فی الواقعہ یہ سب کچھ انسانی ہاتھوں کی محنت کا نتیجہ نہیں۔ ہر چند انسانی ہاتھ زمین میں بیج ڈالتا ہے لیکن اس بیج سے پودا نکالنا خدا کا کام ہے۔ اس ایک دانے کے بدلے جو آدمی نے زمین میں ڈالا صدہا اور ہزار ہا دانے پیدا کرنا خدا کا کام ہے۔ چند دانوں سے جو زمین میں ڈالے گئے ایک سرسبز اور لہلہاتی ہوئی کھیتی کس طرح تیار ہو جاتی ہے۔ بیج سے پودا کس طرح نکلتا ہے۔ پودے کی پرورش کس طرح ہوتی ہے۔ ٹہنیاں اور پتے کس طرح اور کیوں پیدا ہوتے ہیں اور

نشوونما پاتے ہیں۔ شگوفے غنچے پھل اور پھول کس طرح اور کیوں بنتے ہیں اور دستِ قدرت کی یہ گلکاریاں ایک مکمل ضابطے اور قانون کے مطابق کس طرح سرانجام پاتی ہیں۔ اس کی دلچسپ اور حیرت افزا تشریح آپ علمِ نباتات کی کسی کتاب سے دیکھ سکتے ہیں اور زمینِ مردہ کے ازسرِ نو زندہ ہو جانے کی نشانی سے اپنے ایمان کو تازہ کر سکتے ہیں۔

آگے چل کر ایک اور آیت اللہ کی طرف توجہ دلاتی ہے اور کہا ہے کہ "پاک ہے وہ خدا جس نے زمین سے اُگی ہوئی سب چیزوں کے جوڑے بنائے اور خود اُن کے اور اُن چیزوں کے جنھیں وہ نہیں جانتے"۔

عموماً مفسرین "سب چیزوں کے جوڑے بنائے" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ہر چیز مختلف اقسام و اصناف کی ہوتی ہے۔ مثلاً پھل ہیں تو ہزارہا قسم کے۔ پھول ہیں تو بیشمار قسموں کے۔ پودے ہیں تو ان کا بھی کوئی حدوحساب نہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سائنس بتاتی ہے کہ سب چیزوں کے جوڑے سے مراد ہے سب چیزوں کے نرومادہ۔ سائنس کا دعوٰی ہے کہ سوائے جانوروں کے باقی مخلوق میں نرومادہ کی دریافت اس کی تازہ تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کا ایک دفعہ نہیں بلکہ بارہا بار انکشاف کیا ہے۔ اور اگر کتابِ مجید کی اس آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس بارے میں قرآن مجید کے انکشافات کی وسعت سائنس کے انکشافات سے کہیں زیادہ ہے۔

حیوانات میں نرومادہ کا ہونا تو ظاہر ہے اور تناسل کا انحصار اسی جوڑے پر ہے۔ نباتات کے متعلق اس فن کا طالب العلم آپ کو بتائے گا کہ

"عموماً ایک پھول کے دو حصے ہوتے ہیں۔ نرومادہ۔ جب تک مادہ نر سے حاملہ نہ ہو۔ وہ پھل یا بیج کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ پھول کے نر حصے میں ایک غبار سا ہوتا ہے جسے انگریزی میں پولن اور اردو میں مادۂ منویہ کہتے ہیں اور حصۂ مؤنث پر چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جب مادۂ منویہ کا کوئی ذرہ ان بالوں پر گرتا ہے تو یہ اُسے پھانس لیتے ہیں۔ اور اس طرح مادہ حاملہ ہو جاتی ہے۔

بعض پودوں کے ساتھ نرومادہ کے پھول علیحدہ علیحدہ لیکن ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ نر

نیچے کو جھکا ہوا ہوتا ہے اور مؤنث پھول اوپر کو اٹھا ہوا۔ مقصد یہ کہ اگر نر کا مادہ منویہ گرے تو مادہ محروم نہ رہے۔

بعض ایسے پودے بھی ملتے ہیں جن کے نر و مادہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ نر کا غبار مادہ تک پہنچانے کا کام شہد کی مکھیاں، بھونرے اور تتلیاں سرانجام دیتی ہیں۔ ان پودوں کے ساتھ نہایت حسین پھول لگتے ہیں جن کی خوشبو اور رنگت ان بھونروں اور مکھیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جب یہ نر بیٹھتی ہیں تو ان کی ٹانگوں اور پروں کے ساتھ غبار منویہ چمٹ جاتا ہے اور پھر جب مادۂ پھول پر بیٹھتی ہیں تو اس غبار کا کچھ حصہ وہیں رہ جاتا ہے اور اس طرح یہ پھول حاملہ ہو جاتے ہیں۔

بعض اشجار مثلاً چیل وغیرہ کے پھول نہ تو خوشبودار ہوتے ہیں اور نہ خوبصورت اس لئے وہ تیتریوں اور مکھیوں کو نہیں کھینچ سکتے۔ اس لئے یہاں ہوا سے کام لیا جاتا ہے۔ ہوا نر کا غبار اُڑا کر مادہ تک پہنچا دیتی ہے۔ چونکہ ہواؤں کا رخ بدلتا رہتا ہے اور اس غبار کی ایک کثیر مقدار ضائع ہو جاتی ہے اس لئے ان درختوں پر غبار منویہ بہت زیادہ مقدار میں پیدا کیا جاتا ہے تاکہ ضائع ہونے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہے۔" (دو قرآن۔ برق صفحہ ۶۷ و ۶۸)

نباتات میں ازواج (نر و مادہ) کی موجودگی کے متعلق مندرجہ بالا بیان نہایت ابتدائی اور نہایت مختصر چیز ہے۔ پودوں میں سلسلۂ تناسل کی دلچسپ اور حیرت افزا تفصیلات اس فن کی کسی کتاب میں دیکھئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ "خلق الازواج کلہا" آیاتِ کائنات کی کتنی عظیم الشان اور ایمان پرور آیت ہے۔

یہ تو حیوانات اور نباتات کے متعلق تھا۔ موالیدِ ثلاثہ کے تیسرے مولود یعنی جمادات میں بھی یقیناً نر د مادہ موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی ہماری علمی تحقیقات اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکی۔ سائنس کو ابھی ان چیزوں کی تفتیش میں ہزارہا سال دیدہ ریزی کرنی ہے۔ قرآن کریم نے کتنے واضح لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ جس طرح تم میں ازواج ہیں۔ اسی طرح زمین سے پیدا ہونے والی تمام اشیا میں ازواج ہیں۔ اور ان چیزوں میں بھی ازواج ہیں جنھیں تم ابھی تک نہیں جانتے۔

برقی رو دو قسم کی ہوتی ہے ایک کو مثبت کہتے ہیں ایک کو منفی. مثبت رو مثبت رو سے نہیں ملتی. منفی رو منفی رو کے پاس نہیں جاتی. لیکن مثبت رو منفی رو کے سامنے آجائے تو فوراً اس سے مل جاتی ہے اور اس اجتماع سے روشنی، گرمی اور قوت پیدا ہوتی ہے. بجلی کے لمپ، بجلی کے پنکھے، بجلی کی انگیٹھیاں اور بجلی سے چلنے والی مشینیں اور گاڑیاں نر اور مادہ بجلی کے اتصال کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہیں. ان معاملات میں انسانی تحقیق ابھی اپنے ابتدائی منازل میں ہے جوں جوں اس تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا آیاتِ کائنات کی حقیقت شناسی انسان کے لئے بیش از بیش ایمان کی پختگی کا باعث ہوتی جائے گی۔

دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر   ماہمچناں دراولِ وصفِ تو ماندہ ایم

پھر رات اور دن کو نشانی بتایا. اگر ہم دن رات کے معاملے پر ہی پورا پورا غور کریں تو یہ ایک نشانی ہی ہمارے ایمان کی تکمیل کے لئے کافی ہے. ہر روز سورج چڑھتا ہے اور ڈوبتا ہے، صبح ہوتی ہے اور شام ہوتی ہے. دن ہوتا ہے اور رات ہوتی ہے لیکن ہماری اعراض کی عادت کا بُرا ہو، کبھی ہم نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر تدبر نہیں کیا. کبھی ہم نے سوچا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں ہر روز طلوعِ آفتاب کا وقت علیحدہ ہے اور اسی طرح ہر روز غروب کا وقت علیحدہ ہے اور کبھی ہم نے غور کیا کہ آفتاب کے طلوعِ اول کے دن سے آج تک لاکھوں سال گذرے کبھی ایک دن بھی سورج اپنے مقرر وقت سے نہ ایک سیکنڈ پہلے نکلا اور نہ ایک سیکنڈ پیچھے ڈوبا. سیکنڈ تو بڑی چیز ہے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تقدیم وتاخیر بھی کبھی نہیں ہوئی. کیا یہ سب کچھ کسی تقدیر العزیز العلیم کے بغیر ہو رہا ہے۔

اس کے بعد شمس وقمر کو آیات اللہ کہا گیا. سورج اور چاند اور کواکب کے متعلق اگر آپ علم الافلاک کی کوئی کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ تمام چیزیں ایک نہایت زبردست حکیمانہ قانون کے تحت ہیں اور انھوں نے کبھی اس قانون کے مقرر کردہ ضوابط کی خلاف ورزی نہیں کی. سورج، چاند، زمین اور دوسرے سیارے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کیوں نہیں جاتے یہ اُس عزیز العلیم کے ایک قانون کا کرشمہ ہے ورنہ کائنات کا یہ تمام سلسلہ چشم زدن میں تباہ ہو جاتا۔

سورج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ساکن ہے۔ قرآن مجید میں شمس کے ساتھ لفظ تجری لگا ہوا ہے لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں۔ تجری لمستقر لہا سورج کے ساکن ہونے کے منافی نہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہر چند سورج نظامِ شمسی میں ساکن ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اور نظامِ شمسی کے تمام سیارے یعنی زمین چاند، زہرہ، مریخ، عطارد اور زحل وغیرہ سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام تر نظام شمسی یعنی خود سورج اور اس کے گرد پھرنے والے سیارے کسی اور شمس کے گرد چکر لگا رہے ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کا مرکز ہر جگہ ہے۔ لیکن کائنات کا محیط کہیں نہیں۔ فی الواقعہ کائنات غیر محدود ہے۔ اور اس کی وسعت ہمارے تخیل کی وسعت سے بھی وسیع تر ہے۔ خدا جانے اس بے پایاں اور بے نہایت وسعت میں کتنے نظامِ شمسی ہوں گے اور ہمارا نظامِ شمسی فضا کے اس بحرِ بیکراں میں ایک قطرے کی حیثیت بھی رکھتا ہوگا یا نہ۔ علاوہ ازیں معلوم توں یوں ہوتا ہے کہ کائنات میں کوئی چیز ساکن نہیں اور نہ ساکن ہو سکتی ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک حیثیت سے ساکن ہو اور دوسری حیثیت سے متحرک۔ مثلاً خود ہماری زمین ہر اس چیز کے لحاظ سے جو اس سے وابستہ ہے ساکن ہے لیکن باقی کائنات کے لحاظ سے وہ متحرک ہے اور متحرک بدو حرکت۔ خود کائنات بحیثیتِ مجموعی یقیناً گردش میں ہوگی۔ خود اپنے گرد اگر دہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر کشتی کو آیت اللہ کہا اور دوسری سواریوں کو بھی۔ فی الواقعہ کشتی بھی ایک نشانی ہی بشرطیکہ ہم اس پر غور کریں۔ کشتی بھی تقدیر العزیز الحکیم کی وجہ سے چلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایک قانون کے ماتحت دریاؤں اور سمندروں کو طے کرتی ہے اگر کوئی قانون نہ ہوتا تو کشتیاں یقیناً غرق ہو جاتیں۔ ایک تولہ بھر لوہے کا ٹکڑا پانی کی سطح پر نہیں ٹھیر سکتا تو پھر ہزاروں من لوہا بغیر کسی تقدیر اور قانون کے کس طرح تیر سکتا ہے؟ باقی تمام سواریوں کا بھی یہی حال ہے۔ نئی سواریوں کو دیکھئے، ہوائی جہاز ہیں۔ ریل گاڑیاں ہیں۔ موٹر کاریں ہیں۔ یہ سب خدائی قانونوں کے ماتحت اور ان قوانین کی پابندی کی برکت سے چلتی ہیں۔ یہ قانون انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔ انسانی ہاتھ گاڑیاں بناتے ہیں لیکن یہ گاڑیاں جن قوانین کے ماتحت چلتی ہیں وہ خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ البتہ انسان کی یہ کوشش قابلِ داد ہے کہ اس نے اپنی عقلِ خدا داد سے کام لیکر ان قوانین کو دریافت کر لیا۔ تدبر کرنے والے لوگ دنیا میں کتنا آگے بڑھ گئے اور اعراض کرنے والے لوگ

کتنا پیچھے رہ گئے۔

قرآن نے اِن نشانیوں کو ایک ایک کر کے گنا۔ لیکن آخر میں یہ کہا کہ اِن لوگوں کے سامنے جب کوئی نشانی آتی ہے تو وہ اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ہم سب کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ ہم انہی منہ پھیرنے والے لوگوں میں سے تو نہیں۔

ذکرِ الٰہی سے اعراض | اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی کوئی نصیحت کوئی ہدایت کوئی تعلیم کوئی درس عبرت غرضکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بات ذکرِ الٰہی کہی جاسکتی ہے۔ پس ذکرِ الٰہی بھی آیات اللہ میں سے ہے جس پر غور و فکر لازم ہے لیکن ذکرِ الٰہی کے پے درپے آنے کے باوجود انسان کفر و جحود میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کا باعث باکثر حالات یہی اعراض ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا	اس طرح ہم بیان کرتے ہیں تیرے لئے خبریں اُن
قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا	چیزوں کی جو پہلے گزر چکیں اور تحقیق دیا ہم نے
مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ	تجھے اپنی طرف سے ذکر۔ جس نے اُس سے منہ پھیرا
الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۔ (۲۰ - ۹۹ و ۱۰۰)	وہ قیامت کے دن بوجھ اٹھائے گا۔

قرآن مجید میں جابجا تاریخ کے گزشتہ واقعات عبرت کے لئے بیان ہوئے اور خدا پر اور خدا کی یکتائی پر ایمان لانے کے لئے قطعی اور دلنشین دلیلیں بیان ہوئیں۔ لیکن جو لوگ اُن پر غور نہیں کرتے وہ دولتِ ایمان سے محروم رہتے ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ	نزدیک آگیا لوگوں کے لئے اُن کا حساب اور وہ
غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ	غفلت میں منہ پھیر رہے ہیں جب کبھی اُن کے پاس
مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ	اُن کے رب کی طرف سے کوئی نیا ذکر آیا تو انھوں نے
يَلْعَبُوْنَ ۔ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۔ (۲۱ - ۱ تا ۳)	اُسے کھیلتے ہوئے سنا۔ ان کے دل غفلت میں ہیں۔

ایک معنوں میں تو آدمی کا حساب روزانہ ہوتا رہتا ہے اور دوسرے یہ کہ قیامت بھی چنداں دور نہیں۔ زندگی چند روزہ ہے اور مرنے کے بعد تو حساب کتاب شروع ہو جاتا ہے اور قطعی حساب کا دن بھی آئے گا تو ہم سمجھیں گے کہ مرنے کے فوراً بعد ہی آگیا۔ بایں ہمہ آدمی ہے کہ غفلت کی نیند سو رہا ہے اور جب کبھی اُس کے

پاس اللہ کی کوئی نئی نشانی یاذکر آتا ہے تو وہ اس سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔ اور سنتا بھی ہے تو دیں حال کہ وہ کھیل رہا ہوتا ہے اور اس سُنی ہوئی بات پر قطعاً غور نہیں کرتا۔ اس کے کان سُنتے ہیں لیکن دل خوابِ غفلت میں ہوتا ہے اس لئے وہ آیت اللہ اور ذکرِ الٰہی سے فیض یاب نہیں ہوسکتا۔

قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُم بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ	کہو کون نگہبانی کرتا ہے تمہاری رات اور دن
الرَّحْمٰنِ۔ بَلْ هُمْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّهِم	اللہ سے۔ بلکہ وہ اپنے پروردگار کے ذکر سے
مُعْرِضُوْنَ۔ (۲۱-۴۲)	منہ پھیرنے والے ہیں۔

موت ہر وقت انسان کے سامنے کھڑی ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں زہریلے جراثیم ہر وقت فضا میں موجود رہتے ہیں۔ رنگا رنگ بیماریوں کا مواد خود انسان کے جسم میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ رنج و غم اور آلام و مصائب کے ہزاروں سامان ہمیشہ آدمی کے چاروں طرف موجود رہتے ہیں۔ پھر وہ کون سی طاقت ہے جو ہمیں ان سے ایک مقررہ وقت تک بچائے رکھتی ہے۔ کیا ہم نے کبھی اس پر غور کیا نہیں، بلکہ ہم تو خدا کے ذکر سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْکِرَةِ مُعْرِضِیْنَ	پس کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ نصیحت سے مُنہ
کَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ۔ فَرَّتْ مِنْ	پھیر لیتے ہیں۔ گویا وہ بدکے ہوئے گدھے
قَسْوَرَةٍ۔ (۴)	ہیں کہ شیر سے بھاگتے ہیں۔

یہاں معرضین کو بدکے ہوئے گدھوں سے تشبیہ دی ہے جو شیر کو دیکھ کر ڈر کے مارے بے تحاشا بھاگ جاتے ہیں۔

آیاتِ الٰہی کو دیکھکر اُن سے مُنہ پھیر لینے والوں کے لئے نہایت عمدہ تشبیہ ہے۔

وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّهٖ یَسْلُکْهُ	اور جو کوئی اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرتا ہے
عَذَابًا صَعَدًا۔ (۷۲-۱۷)	داخل کرے گا اللہ اس کو سخت عذاب میں۔

انعامِ الٰہی سے اعراض | اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی آیات اللہ ہیں۔ ہمارے کھانے کے لئے قسم قسم کے اناج اور رنگ رنگ کے پھل پیدا کئے۔ ہم سے زیادہ طاقتور جانوروں کو ہمارا مطیع بنایا۔ جن سے ہم ہزاروں

فائدے اٹھاتے ہیں۔ کائنات کی ہزارہا چیزوں کو ہمارے کام میں لگا رکھا ہے لیکن ہم ہیں کہ کبھی ان نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں آتا۔ اگر ہم خدا کے ان انعاموں پر غور کرتے تو ازدیادِ ایمان کا باعث ہوتا۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا (۱۷-۸۳)

اور جب نعمت بھیجتے ہیں ہم انسان پر تو منہ پھیر لیتا ہے اور اپنی کروٹ دور کر لیتا ہے اور جب اس کو برائی پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔

یہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ روزانہ خدا کی نعمتوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے لیکن کبھی لمحہ بھر اُس نے اس پر غور نہیں کیا اور نہ خدا کا شکر ادا کیا۔ نعمت ملی اور منہ پھیر لیا۔ بلکہ کروٹ بدل کر ایک طرف ہو گیا اور جب اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی غور و فکر کا ایک مقام تھا۔ نہ کہ محض یاس کا۔ لیکن اعراض کی بدعادت انسان کو قطعاً غافل بنا دیتی ہے اور اس کے قوائے فکر و تدبر کو بالکل معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ۔ (۴۱-۵۱)

اور جب نعمت بھیجتے ہیں ہم انسان پر تو وہ مُنہ پھیر لیتا ہے اور اپنی کروٹ کو دور کر لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ نہ سختی میں صبر ہے اور نہ نرمی میں شکر۔ جو شخص حصولِ نعمت پر شکر گزار نہیں ہوتا تکلیف کے وقت اس کی دعائیں بھی چنداں معنی نہیں رکھتیں۔ آیاتِ الٰہی سے منہ پھیر لینا۔ بے توجہی اور بے رخی کرنا۔ انسان کو غفلت کی ایسی گہری نیند سلا دیتا ہے جو موت کے برابر ہوتی ہے۔

فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۹-۷۶)

پس جب دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے تو بخل کیا انھوں نے ساتھ اس کے اور پھر گئے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔

دولت پا کر بخل کرنا یہ بھی اعراض کی وجہ سے ہے۔ اگر آدمی خدا کی دولت بخشی پر غور کرے تو یقین ہے کہ وہ بخل نہ کرے۔ یہاں دولت سے مراد ہر قسم کی دولت ہے، دولتِ دنیا۔ دولتِ علم وغیرہ وغیرہ۔

آیاتِ احکام سے اعراض

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ	اور جب لیا ہم نے قول بنی اسرائیل کا کہ سوائے
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ	اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرو اور احسان کرو
اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ	ماں باپ کے ساتھ قرابت والوں کے ساتھ اور
وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا	یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور لوگوں کو بھلی
الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ	بات کہو اور قائم رکھو نماز کو اور ادا کرو زکوٰۃ۔
اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ	پھر تم سوائے چند ایک کے پھر گئے اور تم منہ پھیرنے
مُّعْرِضُوْنَ (۲-۸۳)	والے ہو۔

جو حکم بنی اسرائیل کو تھا وہی ہم کو بھی ہے لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو مذکورہ بالا احکام سے منہ پھیرنے والے نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ	کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنھیں دیا گیا کتاب کا
الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰهِ	ایک حصہ بلائے جاتے ہیں کتاب اللہ کی طرف تاکہ وہ
لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ	ان کے درمیان حکم کرے۔ پھر ایک فریق ان میں سے
وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (۳-۲۳)	پھر جاتا ہے اور منہ پھیرنے والے ہیں۔

غیر تو رہے درکنار، خود مسلمان کتاب اللہ کو اپنا حکم نہیں بناتے۔ وجہ یہی ہے کہ وہ کتاب اللہ پر کبھی غور نہیں کرتے۔ اور اگر کتاب اللہ کے کچھ احکام سن بھی لیتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں۔

آیاتِ عبرت سے اعراض

تاریخی واقعات بھی آیات اللہ ہیں اگر آدمی ان پر غور کرے تو عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ۔	تیری زندگی کی قسم وہ اپنی مستی میں سرگرداں تھے
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ۔ فَجَعَلْنَا	پس پکڑا ان کو تند آواز نے صبح کے وقت۔ پس
عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً	ہم نے اسے تہ و بالا کر دیا اور ہم نے ان پر کنکر کے
مِّنْ سِجِّیْلٍ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ	پتھر برسائے۔ یقیناً اس میں پہچاننے والے لوگوں کے لئے
وَاِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ	نشانیاں ہیں اور وہ بستی چلتے راستے میں ہے۔ تحقیق

لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ وَاِنْ کَانَ اَصْحٰبُ — اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لئے اور بن کے رہنے
الْاَیْکَۃِ لَظٰلِمِیْنَ۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ — والے البتہ ظالم تھے۔ پس بدلہ لیا ہم نے ان سے اور
وَاِنَّھُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔ وَلَقَدْ کَذَّبَ — وہ دونوں شارع عام پر ہیں اور تحقیق جھٹلایا حجر کے
اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ۔ وَاٰتَیْنٰھُمْ — رہنے والوں نے پیغمبروں کو۔ اور دیں ہم نے ان کو اپنی
فَکَانُوْا عَنْھَا مُعْرِضِیْنَ۔ (۱۵-۷۷تا۸۱) — نشانیاں لیکن وہ اُن سے مُنہ پھیر لیتے تھے۔

ان آیات میں پہلے قومِ لوطؑ کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بستی زلزلے سے تباہ ہوئی۔ تند آوازیں، شہروں کا تہ وبالا ہونا اور پتھر برسنا یہ چیزیں زلزلوں میں واقع ہوتی ہیں۔ بن کے رہنے والوں سے مراد قومِ شعیب ہے۔ ان دونوں قوموں کی اجڑی ہوئی بستیاں عرب سے شام جاتے ہوئے رستے پر پڑتی ہیں۔ اصحاب الحجر سے مراد قومِ ثمود ہے۔

یہاں قرآنِ مجید نے بعض تاریخی واقعات بیان کئے اور ان واقعات کو آیات کہا۔ اگر بعد میں آنے والی قومیں گزشتہ قوموں کے واقعات پر غور کریں تو یقیناً یہ واقعات اُن کے لئے آیات اللہ کا کام دیں۔

معلوم ہوا کہ تاریخ کا مطالعہ اور تاریخی واقعات پر غور کرنا اور اُن سے عبرت حاصل کرنا مومن کے لئے ضروری ہے کیونکہ یہ بھی آیات اللہ ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ آسمانی کتابیں، پیغمبروں کی تعلیم، صحیفۂ کائنات اور تاریخی واقعات یہ سب آیاتِ الٰہی ہیں اور ان پر غور کرنا تکمیلِ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم سب الا ماشاء اللہ ان آیات کو دیکھ اور سُن کر منہ پھیر لیتے ہیں اور اس اعراض کی وجہ سے ایمانِ کامل کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

نگویند از سرِ بازیچہ حرفے — کزاں پندے نہ گیرد صاحبِ ہوش
وگر صد بابِ حکمت پیشِ ناداں — بخوانی آیدش بازیچہ در گوش

(سعدی)

بچوں کی تعلیم و تربیت
اسلامی تعلیمات اور نفسیات کی روشنی میں

سعید احمد

ماں باپ بننے کے بعد والدین کا سب سے اہم اور بڑا فرض بچہ کی عمدہ تعلیم و تربیت ہے۔ ان کا یہ فرض صرف اس لئے نہیں ہے کہ وہ بچہ اُن کا بچہ ہے اور اگر بڑا ہو کر وہ اچھا ثابت ہو گا تو اس سے اُن کا نام روشن ہو گا اور انھیں آرام پہنچے گا۔ بلکہ اُن کا یہ فرض اس لئے ہے کہ بچہ خدا کی طرف سے اُن کے پاس ایک امانت ہے جس کی عمدہ طریقہ پر نگہداشت اور دیکھ بھال ان کا فرض ہے۔ اسی طرح قوم کا اور انسانی سوسائٹی کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے بچہ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت ماں باپ کا ایک قومی اور انسانی فریضہ بھی ہے۔ بچہ کا ذہن اور اس کا دل و دماغ ایک سادہ سپید کاغذ کی طرح ہیں کہ اس پر ابتداءً آپ جو نقش قائم کر دیں گے وہ اس پر مرتسم ہو جائے گا اور آخر وقت تک رہے گا۔ خدا نے انسانی فطرت میں خیر و شر اور نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیت اور قابلیت رکھی ہے۔ یہ صلاحیت ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر سے ابھرتی ہے۔ ماحول اور تعلیم و تربیت اگر دونوں اچھے ہیں تو نیکی اور اچھے کام کرنے کی صلاحیت پروان چڑھے گی اور بار بار کی مشق و تکرار سے ایک دن وہ اس درجہ پختہ اور مضبوط ہو جائیگی کہ اس کے بعد اگر مخالف ماحول بھی ملے تو اس پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ اور وہ چٹان کی طرح اپنے عادات و اطوار پر قائم رہے گا۔ اسی کو عام بول چال میں کیرکٹر کہتے ہیں۔

لیکن اگر بدقسمتی سے بچہ کو ماحول خراب اور تعلیم و تربیت ناقص ملی ہے تو کسب شر اور برے کام کرنے کی استعداد کو نشو و نما پانے کا موقع ملیگا اور پھر نتائج نہایت افسوسناک اور تباہ کن ہوں گے

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا | پھر اللہ نے نفس میں بدی اور نیکی دونوں کی صلاحیت
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ | ودیعت کردی وہ شخص جس نے (اعمال نیک کے ذریعہ) اس کو
خَابَ مَنْ دَسَّاهَا۔ | سنوار لیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اس کو (اعمال بد کر کے)
(شمس) | مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔

تعلیم و تربیت کی اہمیت اس بنا پر جو ماں باپ اولاد کی تعلیم و تربیت سے بے پرواہی اور غفلت کرتے ہیں وہ جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے گناہگار ہیں۔ قوم اور انسانیت کے بھی شدید ترین مجرم ہیں ذرا غور کیجئے اگر آپ کا ایک بیٹا آپ کی غفلت اور کوتاہی کے باعث صالح تعلیم و تربیت سے محروم رہا تو اس کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہی نہیں ہوگا کہ ایک شخص یا سوسائٹی کا فرد واحد بد ہے۔ بلکہ مشہور ہے ایک سڑی مچھلی پورے تالاب کو گندہ کردیتی ہے۔ یہ شخص تو خود بد ہوگا ہی لیکن اس کے اثر سے اس کی اولاد، اس کے ساتھی، اس کے پڑوسی، پھر اولاد کی اولاد ان سب میں بدی اور گناہگاری کے جراثیم سرائیت کر جائیں گے اور چونکہ ان سب کا سرچشمہ آپ کی ذات ہوگی اس بنا پر ان تمام برے اعمال و افعال کی پاداش سے آپ نہیں بچ سکتے۔

خشتِ اول چو نہد معمار کج | تا ثریا می رود دیوار کج

حضرت آدمؑ کے ایک بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرکے اس فعل بد کی رسم جاری کردی تو قرآن نے کہا

كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ | ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم لگا دیا ہے کہ جو شخص کسی
نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ | ایک جان کو بغیر کسی جان کے یا زمین میں فساد کے بغیر
فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ | قتل کرتا ہے اس نے گویا تمام لوگوں کو مار ڈالا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے۔

قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا | تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے اہل وعیال برے اعمال وافعال کی وجہ سے دوزخ میں جارہے ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ تم نے عمدہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ انھیں اعمالِ صالحہ کا خوگر نہیں بنایا اور گویا اس طرح تم نے ان کو دوزخ سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔

پھر چونکہ اولاد ماں باپ کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اولاد بد ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ماں باپ خود بد ہیں اور اگر اولاد نیک ہے تو یہ اس کی نشانی ہے کہ ماں باپ بھی نیک ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَۃٌ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔

فتنہ کے معنی عام طور پر اردو زبان میں فتنہ کا لفظ جس معنی میں بولا جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں بھی فتنہ سے وہی معنی مراد ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں فتن کے معنی آزمانے کے ہیں۔ فتنہ اسی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں وہ چیز جس کے ذریعہ کسی کو آزمایا جائے۔ اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہوئے کہ خدا اموال اور اولاد کے ذریعہ تم کو آزماتا ہے اور یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اموال کے کسب وصرف اور اولاد کی تعلیم وتربیت کے متعلق اس نے تم کو جو احکام بتائے ہیں تم ان کی پابندی کتنی اور کس حد تک کرتے ہو۔ گویا تمہارے اموال اور اولاد ایک آئینہ ہے جس میں خود تمہاری نیکی اور بدی کی شکل نظر آتی ہے۔ ایک ترازو ہے جس میں خود تمہارے اچھے برے اعمال کا وزن کیا جاتا ہے۔

عمدہ تعلیم وتربیت کا مفہوم اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ "عمدہ تعلیم وتربیت" سے مراد کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی جسم اور روح ان دونوں کے اتصال وربط پر موقوف ہے۔ اس بنا پر صحیح معنی میں زندہ وہ شخص ہوگا جس کا جسم اور روح دونوں تندرست ہوں اور ان میں سے کوئی بیمار نہ ہو یعنی جس طرح جسم کو کسی قسم کا کوئی جسمانی اور مادی دکھ اور آزار نہ ہو۔ اسی طرح اس کی روح کو بھی کسی قسم کی کوئی بیماری نہ ہو جو برے اخلاق۔ برے عقائد وافکار، اور برے اعمال وافعال کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرتبہ اس شخص کا ہے جس کا فقط جسم تندرست ہو اور روح بیمار ہو، یا صرف روح تندرست ہو اور جسم مریض ہو۔ لیکن چونکہ روح پائیدار ہے اور جسم فنا ہو کر مٹی میں ملجانیوالا

روح اصل ہے اور جسم فرع اس بنا پر ان دونوں شخصوں میں سے دوسرا شخص جس کی روح تندرست ہے مگر جسم بیمار ہے پہلے کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل ہے۔

پس عمدہ تعلیم و تربیت کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ بچہ کی شروع سے اس طرح پرورش کی جائے کہ ایک طرف وہ جسمانی اعتبار سے مضبوط اور توانا ہو چست اور مستعد ہو۔ کسی مرض کا شکار نہ ہو اور زندگی کی جدوجہد میں پورے طور پر حصہ لینے کا حوصلہ رکھتا ہو اور دوسری جانب اس کی روح بھی صحت مند ہو، اچھے اخلاق، پاکیزہ اعمال و افعال اور نیک عقائد و افکار کی وجہ سے روح پر بیماری کا کوئی اثر نہ ہو، بچہ کی تعلیم و تربیت میں ان دونوں باتوں کا خیال رکھنا نہایت ضروری اور بحکم خداوندی ہمارا فرض ہے اور اس میں کسی ایک چیز سے بھی غفلت برتنا شدید معصیت اور سخت گناہ ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کے علاوہ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک غریب عورت آئی۔ دو چھوٹی بچیاں اس کے ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے پاس اس وقت کوئی اور چیز نہ تھی۔ ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی وہی اٹھا کر عورت کو دیدی۔ عورت نے اس کے برابر برابر دو ٹکڑے کرکے انھیں بچوں میں تقسیم کردیا اتنے میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے آئے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کو پورا واقعہ سنایا تو ارشاد ہوا "جس کو خدا اولاد کی محبت عطا فرمائے اور وہ ان کا حق بھی بجالائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔

ہماری افسوسناک غفلت لیکن نہایت افسوس اور بڑے شرم کی بات ہے کہ یہ فرض جتنا اہم اور ضروری ہے۔ ہم اسی قدر اس سے غافل اور بے پروا ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری نسلیں روز بروز تباہ و برباد ہوتی چلی جارہی ہیں اور ہمارا نیا آنے والا دن گذشتہ روز سے کہیں زیادہ بھیانک اور ڈراونا ہوتا ہے۔ اخلاقی، روحانی، معاشی اور معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی ہر اعتبار سے ہماری حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بہت سے والدین ہیں جو اپنے بچوں کی جسمانی تربیت سے متعلق اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ وہ اُن کو اچھا کھلاتے پلاتے ہیں اُن کے دکھ درد کا خیال رکھتے ہیں۔ انھیں

آرام پہنچانے کے لئے خود تکلیفیں اٹھاتے اور سختیاں جھیلتے ہیں۔ پھر حسب استطاعت جب وہ بڑے ہوجاتے ہیں تو انھیں کوئی کام سکھاکر کسی پیشہ کی تعلیم دیکر یا لکھنے پڑھنے کا سامان مہیا کرکے اُن کے لئے معاش اور روزی پیدا کرنے کا بھی بندوبست کرتے ہیں لیکن جیسا کہ آپ کو ابھی معلوم ہوا، اگر والدین اپنے فرض کو اولاد کی صرف جسمانی تربیت اور پرورش تک ہی محدود سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی اور بھول ہے۔ اور ایک ایسا گناہ ہے جس پر قیامت میں اُن سے شدید بازپرس ہوگی۔

ہر ماں اور باپ کو جو مسلمان ہیں اور خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور قیامت میں اچھے اور برے اعمال کا جو بدلہ ملے گا اور جن کا قرآن مجید میں صاف صاف بارہا تذکرہ آیا ہے۔ اُن پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ ان کو ٹھنڈے دل و دماغ سے ایک لمحہ کے لئے یہ سوچنا چاہئے کہ ان کی اولاد اُن کے دل وجگر کے ٹکڑے ہیں۔ ابوتمام نے کیا خوب کہا ہے۔

وانما اولادنا بیننا اکبادنا تمشی علی الارض

لو ھبت الریح علی بعضہم لامتنعت عینی من الغمض

ترجمہ:۔ ہماری اولاد ہمارے درمیان ہمارے جگر ہیں جو زمین پر چلتے ہیں اگر ان میں سے کسی پر ہوا چل جائے تو میری آنکھ جھپک تک سے محروم ہوجاتی ہے۔

اس بنا پر اگر اُن کے سر میں درد بھی ہوتا ہے یا بخار بھی آتا ہے تو وہ بے چین و بے قرار ہوجاتے ہیں اور ان کے علاج کی سو تدبیریں کرتے ہیں۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اگر ان کی اولاد نماز نہیں پڑھتی روزہ نہیں رکھتی۔ شریعتِ اسلام کے اور دوسرے احکام و اوامر کی پابندی نہیں کرتی۔ اخلاقی جرائم کے ارتکاب میں اس کو پس و پیش نہیں ہوتا۔ فسق و فجور کی زندگی بسر کرتی ہے تو ان سب باتوں کا ان کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو کم از کم اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ اولاد آگ کی ایک جلتی ہوئی چنگاری اپنے ہاتھوں پر اٹھالے، کنوئیں میں گرپڑے، یا بے احتیاطی کے باعث کسی مہلک اور خطرناک بیماری کا شکار ہوجائے۔ پس دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انھیں یوم آخرت کی جزا وسزا کا یقین کامل اور سچا اعتقاد نہیں ہے اور اس بنا پر اگر ان کی اولاد احکام الٰہی سے سرتابی

اختیار کرکے اپنے لئے عذابِ اخروی کا سامان کرتی ہے تو انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی اور وہ اپنی اولاد کو اُن سے باز رکھنے کے لئے ایسی کوشش نہیں کرتے جیسی کہ وہ اپنی اولاد کی جسمانی صحت و تندرستی کی بقا کے لئے کرتے ہیں۔ اور اگر واقعی ایک سچے اور پکے مسلمان کی حیثیت سے ان کو یوم آخرت کی جزا اور سزا کا یقین ہے تو پھر سخت حیرت ہے کہ وہ کس طرح اس کو گوارا کر لیتے ہیں کہ ان کی اولاد روحانی اور اخلاقی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے جہنم کا انگارہ اور دوزخ کا ایندھن بنے۔ اخروی تکلیف اور اذیت دنیوی تکلیف اور اذیت سے کہیں زیادہ شدید ہوگی۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ اولاد اگر کسی دنیوی تکلیف میں مبتلا ہو، یا کوئی ایسا کام کرے جس کا لازمی نتیجہ بیماری، ہلاکت یا کوئی اور جسمانی آزار ہو تو ماں باپ تڑپ اٹھتے ہیں اور ہزار جتن کرتے ہیں کہ اولاد کوئی ایسا کام نہ کرے۔ لیکن یہی اولاد اگر گمراہی کے راستہ پر گامزن ہو جس کا نتیجہ آخرت میں قہرِ خداوندی کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے تو اُن کے دل میں اس کی اتنی چبھن اور تکلیف نہیں ہوتی۔ خدا اور رسول نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حق ہے اور پھر قانونِ مکافاتِ عمل بھی فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ اُس سے اپنے حق میں یا اپنی اولاد کے حق میں تغافل برتنا دین و دنیا میں ایک عظیم خسارہ اور نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب جن کا اسلام قطعی نہیں ہے۔ انھوں نے مکہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ بڑا ظالم و جابر تھا۔ اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے کہا "معلوم ہوتا ہے اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ضرور ہے جہاں انسان کو اپنے اعمال و افعال کا بدلہ ملے گا ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص اتنا بڑا ظالم ہو اور وہ اپنے ظلم کا بدلہ نہ پائے"۔ یہی انسانی فطرت کی وہ پکار ہے جس کو قرآن مجید نے بار بار بیان کرکے انسان میں یوم آخرت کا یقین اور مکافاتِ عمل کا اذعان پیدا کیا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھلائی کرے گا وہ
یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ اس کا بدلہ پائے گا اور جو شخص ایک ذرہ کے

شَرًّا یَّرَہٗ۔ | برابر برا کام کریگا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا | ہر نفس اچھا کرے گا تو اُسے اس کا اجر ملے گا اور

مَا اكْتَسَبَتْ۔ | برا کرے گا تو اُسے اس پر عذاب ہو گا۔

پھر دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص چوری کرے اور سزا سے بچ جائے، کسی کو بے گناہ مار دے اور نہ پکڑا جائے۔ مروجہ قانون وقت کی خلاف ورزی کرے اور اس پر عدالت میں مقدمہ نہ چلے۔ کسی شدید جرم کا ارتکاب کرے اور کسی خاندانی یا ذاتی اثر و رسوخ یا سفارش کے باعث اسے اپنے جرم کی پاداش نہ بھگتنی پڑے۔ لیکن آخرت میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ ہو سکے گی۔ وہاں نہ خدا کے فرشتوں کو جو کتابتِ اعمال پر مقرر ہیں کوئی جل اور فریب دیا جا سکتا ہے اور نہ خدا کی عدالت میں کسی کا حسب و نسب اور اس کے بزرگوں کے اعمال و افعال سفارش کا کام کر سکتے ہیں ارشاد ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ | "کوئی نفس ایسا نہیں ہے جس پر فرشتے تعینات نہ ہوں"

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا | "جب اللہ ان کو جلا اٹھائے گا پھر جیسے جیسے عمل

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰىهُ | یہ لوگ کرتے رہے وہ اُن کو بتا دے گا اللہ نے اس

اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ | عمل کو گن رکھا ہے اور وہ اس کو بھول گئے اور اللہ ہر چیز

شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ | کا نگراں ہے۔"

پھر جب روزِ جزا خدا کی عدالت میں ان کا معاملہ پیش ہو گا تو جس نے جیسا کچھ کیا ہو گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ | جو ہدایت پاتا ہے وہ اپنی ہی جان کے نفع کے

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ | لئے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اس کے

عَلَيْهَا۔ | نقصان کے لئے ہی گمراہ ہوتا ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا | جو شخص گناہ کرتا ہے وہ اپنی جان کو نقصان

يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا پہنچانے کے لئے ہی کماتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے

پس اگر ہم مسلمان ہیں اور واقعی اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سر بسر حق ہے اور اس میں بال برابر تاویل و توجیہ اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے تو پھر ہماری یہ غفلت کس درجہ افسوسناک اور ہماری محبت پدری و مادری کس قدر لائق ماتم ہے کہ ہم اپنی اولاد کی چند روزہ زندگی کو مطمئن اور پُر از عافیت و سکون بنانے کے لئے سب کچھ کرتے ہیں لیکن اُن کی ہمیشہ رہنے والی زندگی کو بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ دنیا داروں کا کیا ذکر ہے۔ آپ کو بہت سے علماء دین۔ مشائخ کرام اور صلحاء و صوفیا ملیں گے جو خود تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرتے ہوں گے لیکن ان کی اولاد ان کی بے توجہی کے باعث خراب وخستہ ہوگی۔ فسق و فجور کی زندگی بسر کرتی ہوگی۔ آوارہ گرد اور دینی اعتبار سے نہایت ابتر اور زبوں حال ہوگی۔ تو کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ محض اپنے ذاتی اعمال سے وہ نجات پا جائیں گے اور اولاد سے متعلق اُن سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ اور اگر بالفرض باز پرس نہیں بھی ہوگی تو ان کی پدرانہ شفقت و محبت اسے کیونکر گوارا کر لیتی ہے کہ ان کی اولاد دوزخ کا کندہ اور جہنم کا انگارہ بنے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا بہ ظاہر ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جسے ہر مسلمان جانتا ہے اور غالباً اس بنا پر اس کے متعلق زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں میں یوم آخرت کا تصور، خدا کا خوف اور جزا و سزا کا اعتقاد اس درجہ مضمحل ہو گیا ہے کہ اب تو یہ الفاظ بھی جلسہائے وعظ کے علاوہ اور کہیں بہت کم سننے میں آتے ہیں۔ ہماری موجودہ تہذیب اور معاشرت ماحول کے گندہ اور بُرے اثرات سے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اس درجہ متاثر ہو گئی ہے کہ مسلمان کے فکر و ذہن کی دنیا ہی یکسر منقلب ہو گئی اور جن تصورات پر اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونا چاہیئے تھا اُن کی بنیاد اب اس درجہ کھوکھلی ہو گئی ہے کہ پوری عمارت کو ہی گھن لگ گیا ہے۔ پھر یہ اثرات اتنے ہمہ گیر اور وسیع ہیں کہ ان سے نہ تعلیم یافتہ طبقہ محفوظ ہے اور نہ وہ لوگ جو تعلیم کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب سے بیس

پچیس برس پہلے کے علماء، سوداگر، پروفیسر، وکیل، رئیس، حکیم اور دوسرے طبقہ کے لوگوں کا آج کے انھیں لوگوں سے مقابلہ کیجئے تو ایک عظیم فرق نظر آئے گا۔ آپ تلاش کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس فساد اور خرابی کا سرچشمہ گھر کے باہر نہیں۔ بلکہ اندر ہے اور وہ بھی اُس گہوارۂ تربیت میں ہے جس میں نئی نسل کے جوان لڑکے اور لڑکیاں پل بڑھ کر عمر شباب کو پہنچے ہیں۔ اس بنا پر سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ ہم اسلامی زندگی سے متعلق اپنے بنیادی عقیدہ کو استوار کریں اور اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اس پر اپنے افکار و اعمال کی عمارت کھڑی کریں۔

(باقی آئندہ)

مولانا آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عنبر بیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانہ میں اپنے علمی محبِ خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے۔ اس مجموعے کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا ابو الکلام جیسے مجمع فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے، اِن خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گردپوش چار روپے۔

مکتبہ برہان دہلی قرولباغ

مصر کا سیاسی پس منظر

جناب مظفر شاہ خاں صاحب ایم۔ اے۔

لڑائی ختم ہوتے ہی دنیا میں جگہ جگہ وہ طاقتیں ایک دم اُبھر آئی ہیں جو حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے دب گئی تھیں۔ خصوصاً مشرق میں چاروں طرف ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر جگہ انقلابی اثرات پوری طرح اپنا کام کر رہے ہیں اور افقِ مشرق پر ایک بڑی تبدیلی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ جن ملکوں میں مغربی قوموں کا انتداب باقی ہے وہاں آزادی اور خود مختاری کی یہ تحریک زیادہ تیز ہے اور قومی زندگی کے مختلف عناصر پوری جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔
مشرق بعید میں انڈونیشیا والوں نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی ہے اور وہ ڈچوں کی فوجی طاقت کے سامنے کسی طرح جھکنے کو تیار نہیں۔ انڈونیشیا کے آس پاس کے ملکوں میں بھی سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے کیونکہ انڈونیشی تحریک نے ان کی بہت کچھ حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہند چینی، سیام اور برما میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی ہے اور وہاں کے لوگ بھی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ غرض مشرقِ بعید کے ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کے باشندے اپنی موجودہ حالت سے بالکل غیر مطمئن ہیں اور اُن کے دلوں میں اپنے آزاد مستقبل کی آرزوئیں بے چین ہو رہی ہیں۔

اِدھر مشرقِ وسطیٰ کی طرف نظر ڈالئے تو وہاں بھی ہر جگہ قومی بیداری کی لہر دوڑتی دکھائی دے گی۔ بعض جگہ تو یہ انقلابی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ عرب ممالک میں اس وقت مصر سب سے آگے ہے وہاں سیاسی بیداری مستقل صورت اختیار کر چکی ہے اور مصریوں کا سیاسی شعور بڑی حد تک پختہ ہو گیا ہے۔

نہر سویز کی وجہ سے بہت پہلے ہی یورپ کی سرمایہ دار طاقتوں سے مصر کا سابقہ ہوا اور اُسے

طرح طرح کی پیچیدگیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات نے مصریوں میں قومی روح کو بیدار کردیا جو آج تک اپنا کام کررہی ہے۔ مصر سالوں کی جدوجہد کے بعد آج جس منزل پر پہنچا ہے اور اب وہاں حالات کا جو رُخ ہے اُسے سمجھنے کے لئے مصریوں کی پچھلی ساری تحریکوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ تاریخی پس منظر کے ساتھ ہی مصر کی موجودہ حیثیت کا پوری طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے دوسرے ۱۹۳۶ء کے برطانوی معاہدہ میں ادل بدل کرنے کے لئے جو بات چیت ہورہی ہے اسے بھی پچھلے سیاسی حالات کی روشنی میں زیادہ اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

مصر مشرق و مغرب کے اہم بحری راستہ پر واقع ہے اور اس لحاظ سے اُسے قدرتی طور پر ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس بحری راستہ کو اپنے اپنے مفاد کی خاطر محفوظ رکھنے کے لئے برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کو مصر میں پنجے جمانے کی ضرورت پڑی۔ یہی مصر کی بدقسمتی تھی۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

جب اس قسم کے بیرونی اثرات زیادہ بڑھے تو اُن کے خلاف مصریوں میں بے چینی پیدا ہونے لگی اور عربی پاشا کی قیادت میں ایک قوم پرست جماعت وجود میں آئی۔ یہ جماعت بہت جلد اتنا زور پکڑ گئی کہ ۱۸۸۱ء میں خدیو مصر کو بنیادی دستور منظور کرنا پڑا۔

دو سال بعد عربی پاشا کی اس تحریک نے انقلابی جدوجہد شروع کردی اور اسکندریہ میں علی الاعلان غیر ملکیوں کی مخالفت شروع ہوگئی اور عام بلوے ہونے لگے۔ اس پر برطانیہ نے اسکندریہ پر بمباری کی اور وہاں اپنی فوجیں اتار دیں۔ عربی پاشا کی فوجیں منتشر ہوگئیں اور عربی پاشا کو گرفتار کرکے جلاوطن کردیا گیا۔ اس طرح قومی تحریک کو وقتی طور پر دباکر برطانیہ نے مصر میں مضبوطی سے اپنے پنجے جمالئے فرانس کو برطانیہ کا یہ اقتدار نہ بھایا اور اس کی نظریں برطانیہ کی طرف کچھ ترچھی ہوگئیں لیکن ۱۹۰۴ء میں ان دونوں کے درمیان مفاہمت ہوگئی اور فرانس نے مصر میں برطانوی قبضہ تسلیم کرلیا۔ اس کے بدلہ میں برطانیہ نے مراکو کے معاملات میں فرانس کو آزاد چھوڑ دیا۔ یہ تھا سرمایہ دار طاقتوں کا آپس کا لین دین۔

مصر میں برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے ساتھ قومیت کا جذبہ بیدار ہونے لگا اور دستوری اصلاح

کا مطالبہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مصر کی اس قومی تحریک میں سید جمال الدین افغانیؒ کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہاں سید صاحب ہی کی دعوت اصلاح وتجدید نے انقلابی فضا پیدا کر دی تھی۔ سید جمال الدینؒ دو دفعہ مصر گئے پہلی مرتبہ ۱۸۶۹ء میں تو وہ زیادہ عرصہ مقیم نہ رہ سکے البتہ دوسری مرتبہ ان کا قیام کافی دنوں رہا۔ اس وقت ان کی انقلاب انگیز تعلیم کا مصر میں بڑا اثر ہوا۔

جس وقت سید صاحبؒ مصر پہنچے، اس وقت وہاں کی فضا بالکل ساکن تھی۔ لوگوں میں کوئی سیاسی شعور نہیں تھا۔ اُدھر مذہبی گروہ بھی انتہائی پستی کی حالت میں تھا صوفیوں نے رہبانیت کی تعلیم دیکر عوام کو میٹھی نیند سلا رکھا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس مردہ ماحول میں بھی دو ایک اللہ کے بندے ایسے تھے جو اپنے دلوں میں بے چینی محسوس کر رہے تھے لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے انھیں بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ اور بچارے خاموش بیٹھے وقت گذار رہے تھے۔ سید صاحبؒ کے مصر پہنچتے ہی اس ساکن فضا میں حرکت پیدا ہوئی، اُن کی آواز گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی اور سارے انقلاب پسند لوگ پروانوں کی طرح اُن کے گرد جمع ہونے لگے۔ صوفیوں اور مصریوں کو بھی انھوں نے جھنجوڑ کر جگایا۔

مصر کی قومی زندگی میں بعد کو جن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا وہ سب سید صاحبؒ کی صحبت کے پروردہ تھے، شیخ محمد عبدہٗ جن کا مصر کی تحریک اصلاح وتجدید میں بڑا حصہ تھا، سید صاحبؒ ہی کی جماعت کے آدمی تھے اُن کی صحبت نے مفتی صاحب پر انقلاب انگیز اثر کیا تھا۔ مصر کے زندہ جاوید لیڈر سعد زغلول پاشا بھی سید صاحبؒ کی علمی اور سیاسی مجلسوں سے فیضیاب تھے۔ سید صاحبؒ کی تعلیم وتربیت نے زغلول پاشا کی عملی زندگی پر جو اثرات ڈالے تھے اُن کا پتہ سعد زغلول کی انقلابی کوششوں سے چلتا ہے۔

مصر میں جب قوم پرستوں کا اثر ورسوخ پھیلا تو خود مختار حکومت کا مطالبہ از سرِ نو پیدا ہو گیا اس وقت برطانوی حکومت صرف اس قدر جھکی کہ ۱۹۱۳ء میں ایک قانون ساز اسمبلی قائم کرنے کی منظوری دیدی لیکن اس اسمبلی کو کسی قسم کا حقیقی اختیار نہیں دیا گیا۔ اسمبلی کا اجلاس صرف ایک ہی دفعہ ہو سکا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ جانے کے بعد یہ نام نہاد اسمبلی بھی ختم کر دی گئی اور مصر پر برطانوی حمایت

(Protectorate) کا باقاعدہ اعلان ہوگیا اس واقعہ کے بعد مصر میں بڑی ناراضی پھیلی تو مصریوں کو یقین دلایا گیا کہ اگر انھوں نے برطانیہ کی جنگی کارروائیوں میں رکاوٹ نہیں ڈالی تو جنگ کے بعد ان کا حق خود مختاری تسلیم کرلیا جائے گا۔ مصریوں نے اس وعدہ پر یقین کرلیا اور جنگ کے خاتمہ کا انتظار کرنے لگے۔

جنگ کے زمانہ میں نازک حالات کو دیکھتے ہوئے امید ہوگئی تھی کہ برطانیہ خود مختار جمہوری حکومت کا وعدہ پورا کرکے مصریوں کا پورا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن جنگ کے بعد ہندوستان کی طرح مصر کو بھی آزادی کی بجائے اُلٹے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے بعد مصر میں سیاسی جدوجہد پھر باقاعدہ شروع ہوئی، مصر میں اب متوسط طبقہ بھی پیدا ہوچکا تھا، ہر جگہ یہی طبقہ ہے جو انقلاب کا حامی اور آزادی کا نام لیوا ہوتا ہے۔ چنانچہ مصر میں اسی طبقہ سے سعد زغلول اٹھے جنھوں نے سارے ملک کی کایا پلٹ دی۔ وہ ساری عمر آزادی کے لئے لڑتے رہے، قوم اُن کے نام پر جان دیتی تھی اور وہ سارے مصر کے مانے ہوئے لیڈر تھے۔ ہر طبقہ کا اُن پر اعتماد تھا، خصوصاً مصری نوجوان تو ان کی شخصیت سے انتہائی طور پر متاثر تھے۔

جب مصر کے وزیر اعظم رشدی پاشا اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور صلح کانفرنس میں مصر کو نمائندگی نہ مل سکی تو زغلول پاشا نے مصریوں کا ایک قومی وفد بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ یہ وفد پیرس پہنچ کر صدر ولسن (WiLSON.) سے بات چیت کرے لیکن برطانوی حکومت نے اس وفد کی سخت مخالفت کی اور یہاں تک جبر کیا کہ وفد کو پاسپورٹ دینے سے انکار کردیا۔ اس فیصلے کے فوراً بعد مارچ ۱۹۱۹ء کی مشہور بغاوت پھوٹ پڑی اور زغلول پاشا اور وفد کے دوسرے ارکان گرفتار کرکے مالٹا بھیجدیئے گئے۔ پھر تو بغاوت نے اور زور پکڑا اور عوام میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ یہ بغاوت ایسی سخت تھی کہ برطانوی حکومت کچھ دنوں بعد زغلول پاشا اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرنے اور انھیں پیرس جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہوگئی۔

قید سے رہا ہوتے ہی زغلول پاشا اور ان کے ساتھی پیرس روانہ ہوگئے لیکن ان لوگوں کے

پہنچنے سے پہلے ہی خفیہ طور پر برطانیہ صدر ولسن (Wilson) سے مصر پر "برطانوی حمایت" کی منظوری لے چکا تھا۔ پھر بھی مصری وفد نے دوڑ دھوپ کی اور مصر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کچھ تجویزیں بھی رکھیں لیکن اتحادی حکومتوں نے اُن کی طرف بالکل توجہ نہیں دی اُن کی خاص تجاویز یہ تھیں۔

(۱) جمعیۃ الاقوام کی حمایت میں مصر کی مکمل آزادی۔ (۲) مصری سوڈان کی واپسی۔ ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم طے شدہ شرائط پر قائم رہ کر غیر ملکیوں کے مفاد کی حفاظت کریں گے اور نہر سویز کے دعویدار نہیں ہوں گے۔

مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ لارڈ ملنر (Milner.) کے ماتحت ایک مشن برطانوی حمایت کے زیر سایہ مصر کا نیا دستور بنانے کے لئے بھیجا جائے گا۔ مصر میں اس اعلان کا بڑا مضحکہ خیز استقبال کیا گیا اور قوم پرستوں نے فوراً ہی مشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا۔

مشن مصر پہنچا لیکن بائیکاٹ ایسا مکمل تھا کہ وہ لوگ کسی سے بھی نہ مل سکے۔ بچے، بوڑھے، عورت، مرد، غرض ساری قوم نے مشن کا پورا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ مشن کی مخالفت میں جگہ جگہ جلوس بھی نکالے گئے اور کونسلوں میں تجویزیں پاس ہوئیں۔ بالآخر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں مشن کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ لندن پہنچ کر لارڈ ملنر اور ان کے ساتھیوں نے زغلول پاشا اور اُن کے وفد سے براہِ راست گفتگو کرنے کی درخواست کی کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ پوری قوم زغلول پاشا اور اُن کی پارٹی کے ساتھ ہے۔ یہ سب کچھ قومی یکجہتی کا نتیجہ تھا کہ مشن یوں جھکنے پر مجبور ہوا۔ اب وہ اسی زغلول سے اپیل کر رہے تھے جسے مصر کے نمایندے کی حیثیت سے برطانوی حکومت نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا تھا اور جسے قید و بند کی مصیبت میں ڈالا تھا۔

زغلولی وفد اس شرط پر گفتگو کرنے کے لئے راضی ہو گیا کہ مصر کی آزادی کا مطالبہ بدستور قائم رہے گا۔ چنانچہ لندن میں دو ماہ کی طویل بحث کے بعد ایک رپورٹ تیار کی گئی۔ اس رپورٹ میں "برطانوی حمایتہ" کی واپسی اور مصر کی آزادی کا اقرار کیا گیا تھا۔ لیکن نہر سویز میں فوجی نقطۂ نظر سے برطانوی مفاد کی حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ مصریوں نے ان پابندیوں پر اول تو بڑی نکتہ چینی

کی۔ لیکن چند ترمیموں کے بعد انھوں نے رپورٹ کو قبول کرلیا۔ مگر دوسری طرف برطانوی حکومت نے اس رپورٹ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اس گفتگوئے مصالحت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

مصر میں آزادی کی تحریک برابر جاری رہی۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں زغلول پاشا کو پھر گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن مصریوں کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آخر کار حکومت کو اپنے رویے میں تبدیلی کرنا پڑی اور سمجھوتہ کی کوشش پھر شروع ہوئی۔ لیکن مکمل آزادی کا مطالبہ ایسا مطالبہ تھا جس کو قبول کرلینا برطانیہ کے اپنے مفاد کے سراسر خلاف تھا اور مصری اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ اس لئے اب بھی سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ برطانیہ نے کسی مفاہمت کے بغیر ہی یک طرفہ اعلان کردیا کہ آئندہ مصر کو ایک آزاد خودمختار ریاست کا درجہ حاصل ہوگا۔ مگر برطانوی سلطنت کے وسائل رسل و رسائل کی حفاظت مصر کے دفاع، غیر ملکی مفاد کی دیکھ بھال اور سوڈان کے مستقبل کے سوال کو پھر طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ مصر میں برطانیہ کے اس اعلان کا کوئی اثر نہیں لیا گیا اور قوم پرستوں کی سیاسی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔

۱۹۲۳ء سے وفد پارٹی کی دستوری سرگرمیوں کا نیا دور شروع ہوا۔ نئی پارلیمنٹ کے پہلے انتخاب میں زغلول پاشا اور ان کے ساتھیوں کو اکثریت کے ساتھ کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے خود لندن پہنچ کر سمجھوتہ کی کوشش کی لیکن پھر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جن مسائل پر اس وقت دونوں میں اختلاف تھا۔ ان میں سوڈان کا مسئلہ زیادہ اہم تھا اور آج بھی یہی صورت باقی ہے۔ دراصل دریائے نیل پر ہی مصر کی کھیتی باڑی کا دارومدار ہے اور نیل کا دہانہ سوڈان میں ہے، اسی وجہ سے اس مسئلہ کی اہمیت بڑھی ہوئی ہے۔ اس وقت بھی مصریوں کا یہی مطالبہ تھا کہ سوڈان کو مصر میں شامل کردیا جائے اور خود سوڈانی بھی اس کے حق میں تھے۔

مصر میں عام طور پر برطانیہ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پھیلے ہی ہوئے تھے کہ کسی منچلے نے مصری فوج کے برطانوی افسر اعلیٰ کو قتل کردیا۔ اس واقعہ نے ایک ہلچل ڈال دی۔ برطانوی ہائی کمشنر لارڈ ایلن بائی نے فوراً سات مطالبات رکھ دیئے۔ ان میں پانچ لاکھ پونڈ جرمانہ کی فوری ادائیگی کا مطالبہ

بھی تھا۔ صلح کے بعد زغلول پاشا نے قریب قریب سارے مطالبات مان لئے لیکن وہ سوڈان کے حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس کے بعد لارڈ ایلن بائی نے زبردستی سوڈان پر قبضہ کر کے اس کو برطانوی نوآبادیات میں شامل کر لیا۔ اس پر زغلول پاشا اوران کی وزارت احتجاجاً مستعفی ہو گئی اسی سال شاہ فواد نے پارلیمنٹ کو بھی معطل کر دیا۔ مصر میں کچھ عرصہ تک غیر آئینی حکومت کا دور دورہ رہا۔ لیکن دو سال بعد پھر مصری پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا، اس میں بھی زغلول پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں پھر برطانیہ سے سمجھوتہ کی کوشش کی گئی، مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا کیونکہ برطانیہ برائے نام آزادی دے کر مصر پر اپنی مستقل حمایت (Proctectorate.) قائم رکھنا چاہتا تھا اور مصری سچی آزادی کے طالب تھے۔

۲۳ اگست ۱۹۲۷ء کو مصر کا جوانمرد قائد سعد زغلول اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اُن کی جگہ نحاس پاشا وفد پارٹی کے لیڈر مقرر ہوئے اور بعد کو وزیرِ اعظم بھی بن گئے۔ نحاس پاشا اندرونی اصلاح اور عوام کے شہری حقوق کے لئے کوشاں ہوئے۔ برطانوی حکومت اور شاہِ فواد کو ان کی یہ کوشش کیسے پسند ہو سکتی تھی۔ وہ نحاس پاشا کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بھی خوفزدہ تھے۔ اس لئے انھیں وزیرِ اعظم کی کرسی سے اتار دیا گیا۔ اس کے بعد ملک میں ایک سال تک عام بے چینی پھیلی رہی ۱۹۲۸ء کے اخیر میں لیبر پارٹی (Labour Party.) کے ہاتھ میں برطانوی حکومت کی باگ ڈور آجانے کی وجہ سے سیاسی حالات میں قدرے تغیر ہوا، اس کا اثر مصر کی فضا پر بھی پڑا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں نئے انتخابات ہوئے جن میں پھر وفد پارٹی غالب آئی۔ برطانیہ کی نئی لیبر حکومت نے دوبارہ مصری معاملات پر بات چیت شروع کی۔ اس سلسلہ میں نحاس پاشا خود لندن گئے۔ اگرچہ اس مرتبہ برطانوی حکومت بہت کچھ جھکی پھر بھی سوڈان کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔

۱۹۳۲ء میں پھر ایک بحرانی دور آیا۔ شاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان کسی بات پر نزاع ہوا، اور نحاس پاشا کو مستعفی ہونا پڑا۔ ساتھ ہی پارلیمنٹ بھی معطل ہو گئی۔ پارلیمنٹ کے ممبران نے الگ اپنا جلسہ کیا اور مصری دستور سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ ملک میں چاروں طرف ان لوگوں کی

حمایت ہوئی۔ اگرچہ مصر کو اصولی طور پر خود مختار ریاست کا درجہ حاصل تھا لیکن درحقیقت اس کی حیثیت ایک برطانوی نوآبادی سے زیادہ نہیں تھی۔ برطانوی فوجیں اسکندریہ اور قاہرہ میں موجود تھیں اور برطانیہ کا اقتدار سوڈان اور نہر سویز پر بدستور قائم تھا۔ کئی سال تک یہی صورت قائم رہی۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں ابی سینیا پر اٹلی کے حملے کے بعد حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ انگلستان اور مصر نے اپنی اپنی ضرورت کے لئے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بات یہ تھی کہ اٹلی سے دونوں کو خطرہ تھا اس وقت وفد پارٹی انتخابات جیت چکی تھی اور نحاس پاشا پھر وزیر اعظم ہو گئے تھے۔ تازہ حالات کے پیش نظر دونوں ملکوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدے کے ذریعے مصر نے اپنے دفاع کی خاطر سوڈان اور نہر سویز پر برطانوی نگرانی کو قبول کر لیا۔ دوسری طرف انگلستان نے اپنی فوجیں قاہرہ اور اسکندریہ سے ہٹالیں اور مصر میں اپنے زائد حقوق سے دست بردار ہونے پر تیار ہو گیا۔

اگرچہ اس معاہدے کے بعد بھی مصر میں برطانوی اثرات قائم رہے پھر بھی مصریوں کو اندرونی اصلاح و ترقی کا کافی موقعہ ملا اور انھوں نے اپنی قومی زندگی کی نئی تشکیل کے لئے بڑا کام کیا۔ لیکن بدقسمتی سے چند سال ہی بعد دوسری جنگ چھڑ گئی۔ اور حالات نے یکسر رُخ بدل دیا سب کی توجہ جنگ کی طرف لگ گئی۔ مصر اگرچہ خود لڑائی کے میدان میں نہیں تھا لیکن اُسے اپنے بچاؤ کا بڑا فکر تھا، کیونکہ اس کے قریب ہی لیبیا میں میدانِ کارزار گرم تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لڑائی مصر کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔

لڑائی ختم ہوئی اور دنیا نے امن کا سانس لیا تو مصر میں بھی قومی امنگوں نے سر ابھارا اور مکمل آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ پھر کیا جانے لگا۔ برطانوی فوجوں کے قیام کے خلاف کئی جگہ مظاہرے ہوئے اور کافی شورش پھیلی۔ آخر برطانیہ ۱۹۳۶ء کے معاہدے میں ردوبدل کرنے پر راضی ہو گیا۔ اور برطانوی اور مصری نمایندوں کے درمیان اسی سلسلہ میں بات چیت شروع ہوئی، لیکن سوڈان کا سوال پھر آڑے آگیا۔ لڑائی کے زمانہ میں مصر کے مشترکہ دفاع اور برطانوی فوجوں کے ہٹانے کے سوال پر بھی کچھ اختلافات تھے مگر بڑا سوال سوڈان ہی کا تھا۔ چنانچہ ان حالات

میں یہ گفتگو ملتوی کردی گئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے دریائے نیل کی وجہ سے سوڈان کا علاقہ مصریوں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ علاقہ مصر کے جنوب میں واقع ہے اس کی لمبائی تیرہ سو ۱۳۰۰ میل ہے اور چوڑائی ایک ہزار میل۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ مصر کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سارا علاقہ پہلے مصر میں ہی شامل تھا بعد کو ۱۸۹۲ء میں بیرونی اثرات کی وجہ سے ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ سوڈان کا گورنر جنرل برطانیہ کے مشورہ سے مقرر کیا جانے لگا، پھر بھی تاجِ مصر کی ماتحتی بدستور قائم رہی البتہ ۱۸۹۹ء میں سارا نقشہ بدل گیا اور برطانوی فوجیں زبردستی سوڈان پر قابض ہوگئیں۔ اس کے بعد سے سوڈان مصر اور برطانیہ کے درمیان اب تک مستقل مسئلہ بن گیا۔ کئی دفعہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ میں بھی سوڈان کے معاملہ کو نہیں چھیڑا گیا اور اُسے آئندہ طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ آج بھی وہی کشمکش جاری ہے۔

اگرچہ مصر کا یہ حق تسلیم کرلیا گیا ہے کہ وہ سوڈان کے مستقبل کے بارے میں اپنا پورا اطمینان کرسکتا ہے کہ آئندہ سوڈان کسی ایسے نظام کے سپرد نہیں کیا جائیگا جس سے مصر کو کسی طرح نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ لیکن برطانیہ اس علاقہ کو مصریوں کی خواہش کے مطابق تاجِ مصر کی سپردگی میں دینے کو تیار نہیں کیونکہ اپنی فوجی اور دیگر خاص ضرورتوں کے لئے وہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنا ایک خاص مستقر رکھنا چاہتا ہے۔ مصر تو اس کے ہاتھوں سے نکل ہی چکا اور وہ مصر سے اپنی ساری فوجیں ہٹا لینے پر تیار ہوگیا ہے، ایسی صورت میں اب اس کی نظریں سوڈان پر ہی ہیں، اور وہ اسی کو اپنا ایک مضبوط فوجی اڈا بنانا چاہتا ہے تاکہ یہ مصر کا بدل ہوسکے۔ چنانچہ شمالی سوڈان میں فوجی آسانیاں بڑھانے اور سوڈان کی بندرگاہ کو فوجی بندرگاہ بنانے کی غیر سرکاری بات چیت بھی شروع ہوگئی ہے۔ مصر کے کچھ لوگ اس بات کو بھی تاڑ گئے ہیں اور اسی لئے وہ مصر اور سوڈان دونوں جگہ سے برطانوی فوجیں ہٹا لینے کا مطالبہ کررہے ہیں۔

سوڈان میں اس وقت دو مختلف الخیال پارٹیاں ہیں ایک کا تو یہ کہنا ہے کہ سوڈان

کو تاجِ مصر کے ماتحت دیدینا چاہیے، یہ لوگ وادیِ نیل کے اتحاد کا نعرہ بلند کررہے ہیں۔ دوسری پارٹی سوڈان کی آزادی اور مختاری کی حامی ہے۔

پچھلے دنوں سوڈانیوں کے ایک مشترکہ وفد نے مصر میں کئی مہینوں کی گفت وشنید کے بعد یہ فارمولا منظور کرلیا تھا کہ مصر اور سوڈان دونوں ایک ہی تاج کے ماتحت رہیں اور دفاع اور غیر ملکی معاملوں میں دونوں کی ایک ہی پالیسی رہے لیکن AL-UMMA پارٹی وفد سے علیحدہ ہوگئی اور اس نے سوڈان کی خود مختاری اور آزادی کا مطالبہ شروع کردیا۔

برطانیہ پہلے ہی سے سوڈان کے سوال کو ختم کرنے کی فکر میں تھا اب اس پارٹی کا سہارا لے کر اُس نے یہ کہنا شروع کردیا کہ سوڈان کے آئندہ انتظام کے بارے میں سب سے پہلے سوڈانیوں سے رائے لینا ضروری ہے، مصر کے وزیر اعظم صدقی پاشا نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب تک سوڈان کچھ عرصہ مصری تاج کے ماتحت رہ کر برطانوی اثرات کو ختم نہ کردے اس وقت سوڈانیوں سے اس بارے میں مشورہ لینا بیکار ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت سوڈان میں برطانیہ کا بڑا اثر ہے اور ایسی صورت میں سوڈانیوں کی سچی رائے معلوم ہونا مشکل ہے۔

عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری اعظم پاشا نے بھی پچھلے دنوں لندن میں یہی تجویز کیا تھا کہ برطانیہ سوڈان پر مصر کا حق تسلیم کرلے اور یہ بات سوڈانیوں پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ آگے چل کر خود فیصلہ کریں کہ انھیں مصری تاج کے ماتحت رہنا چاہیے یا بالکل آزاد۔

سمجھوتہ کی گفتگو اب بھی جاری ہے لیکن مصری اپنے مطالبہ کو چھوڑنے والے نہیں۔ مصر کے وزیر اعظم صدقی پاشا اور برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بیون کی ابھی لندن میں جو گفتگو ہوئی ہے، اگرچہ وہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے لیکن مصر کے سیاسی حلقوں میں اس پر کوئی خاص اطمینان نہیں ظاہر کیا جارہا ہے کیونکہ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی ابھی پارلیمنٹ میں صاف طور پر بتا چکے ہیں کہ سوڈان کے موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

تبصرہ

اسلامی نظمیں صفحات ۲، قیمت ۱۰ر	از جناب شفیع الدین صاحب نیر تقطیع خورد کتابت وطباعت
وطنی نظمیں۔ صفحات ۸۸ قیمت ۱۳ر	عمدہ پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

نیر صاحب بچوں اور بچیوں کے کامیاب شاعر کی حیثیت سے اب اس قدر مشہور ہو گئے ہیں کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے پہلی کتاب مصنف کی ۴۴ نظموں کا مجموعہ ہے جو سب کی سب اسلامی یا اخلاقی عنوانات پر لکھی گئی ہیں اور دوسری کتاب میں بھی ۲۴ نظمیں ہیں "صبح وطن" "دریائے گنگا" "ہمالیہ پہاڑ" "ہماری زبان" ہمارے دیس کی برسات" وغیرہ ایسے وطنی عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ ان سب کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم۔ انداز بیان بچوں کے دل کو موہ لینے والا اور مضامین اخلاق مذہب، حب وطن اور نیکی وشرافت کا سبق دینے والے ہیں امید ہے ارباب مکاتب بچوں کے نصاب میں ان کو شامل کرکے لائق مصنف کی محنت وکاوش اور ان کی اس خداداد لیاقت کی داد دیں گے۔

معذرت

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ بھی ایسا ہی ہوا اور اس مرتبہ پھر مقالات کی وجہ سے صفحات میں گنجائش نہ رہنے کے باعث نہ تو ادبیات درج کی جاسکیں اور نہ تبصروں کے لئے گنجائش پیدا ہو سکی جس کے لئے ہم شعرائے کرام اور کتابوں کے پبلشرز سے شرمسار ہیں اور اس کے لئے معذرت کرتے ہیں تاہم قارئین کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ آئندہ مہینہ سے ادبیات اور تبصرے دونوں باقاعدہ شائع ہوں گے اور ہم تلافی مافات کی بھی کوشش کریں گے۔

منیجر